پردہ

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

پردہ کے مسئلہ پر اب سے چار سال پہلے میں نے ایک سلسلۂ مضامین لکھا تھا، جو ''ترجمان القرآن'' کے کئی نمبروں میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت بحث کے بعض گوشے قصداً نظر انداز کر دیے گئے تھے، اور بعض کو تشنہ چھوڑ دینا پڑا تھا، کیوں کہ کتاب کے بجائے محض ایک مضمون ہی لکھنا مدِ نظر تھا۔ اب ان اجزاء کو یکجا کر کے ضروری اضافوں اور تشریحات کے ساتھ یہ کتاب مرتّب کی گئی ہے۔ اگر چہ یہ دعویٰ اب بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اس موضوع پر آخری چیز ہے، لیکن میں کم سے کم یہ توقع ضرور رکھتا ہوں کہ جو لوگ اس مسئلے کو واقعی سمجھنا چاہتے ہیں وہ اس میں بڑی حد تک اطمینان بخش مواد اور دلائل پائیں گے۔ وباللہ التوفیق و ھو المستعان۔

ابوالاعلیٰ

۲۲ / محرم ۱۳۵۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب ۱:

نوعیتِ مسئلہ

انسانی تمدّن کے سب سے مقدّم اور سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلے دو ہیں، جن کے صحیح اور متوازن حل پر انسان کی فلاح وترقی کا انحصار ہے اور جن کو حل کرنے میں قدیم ترین زمانہ سے لے کر آج تک دنیا کے حکماء وعقلاء پریشان وسرگرداں رہے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں مرد اور عورت کا تعلق کس طرح قائم کیا جائے کیوں کہ یہی تعلق دراصل تمدّن کا سنگِ بنیاد ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ اگر اس میں ذراسی بھی کجی آجائے تو ع

تا ثریّا می رود دیوار کج

اور دوسرا مسئلہ فرد اور جماعت کے تعلّق کا ہے جس کا تناسب قائم کرنے میں اگر ذراسی بے اعتدالی بھی باقی رہ جائے تو صدیوں تک عالمِ انسانی کو اس کے تلخ نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔

ایک طرف ان دونوں مسائل کی اہمیت کا یہ حال ہے، دوسری طرف ان کی پیچیدگی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ جب تک فطرت کے تمام حقائق پر کسی کی نظر پوری طرح حاوی نہ ہو وہ ان کو حل نہیں کرسکتا۔ سچ کہا تھا جس نے کہا تھا کہ انسان عالمِ اصغر ہے۔ اس کے جسم کی ساخت، اس کے نفس کی ترکیب، اس کی قوتیں اور قابلیتیں، اس کی خواہشات اور ضروریات اور جذبات و احساسات، اور اپنے وجود سے باہر کی بے شمار اشیاء کے ساتھ اس کے فعلی وانفعالی تعلّقات، یہ سب چیزیں ایک دنیا کی دنیا اپنے اندر رکھتی ہیں۔ انسان کو پوری طرح نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ اس دنیا کا ایک ایک گوشہ نگاہ کے سامنے روشن نہ ہوجائے اور انسانی زندگی کے بنیادی مسائل حل نہیں کیے جاسکتے جب تک خود انسان کو پوری طرح سمجھ نہ لیا جائے۔

یہی وہ پیچیدگی ہے جو عقل وحکمت کی ساری کاوشوں کا مقابلہ ابتدا سے کر رہی ہے اور آج تک کیے جارہی ہے۔ اوّل تو اس دنیا کے تمام حقائق ابھی تک انسان پر کھلے ہی نہیں۔ انسانی

علوم میں سے کوئی علم بھی ایسا نہیں ہے جو کمال کے آخری مرتبہ پر پہنچ چکا ہو، یعنی جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہو کہ جتنی حقیقتیں اس شعبۂ علم سے تعلق رکھتی ہیں ان سب کا اس نے احاطہ کر لیا ہے مگر جو حقائق روشنی میں آچکے ہیں اُن کی وسعتوں اور باریکیوں کا بھی یہ عالم ہے کہ کسی انسان کی بلکہ انسانوں کے کسی گروہ کی نظر بھی اُن سب پر بیک وقت حاوی نہیں ہوتی۔ایک پہلو سامنے آتا ہے اور دوسرا پہلو نظروں سے اوجھل رہ جاتا ہے۔کہیں نظر کوتاہی کرتی ہے اور کہیں شخصی رجحانات حاجبِ نظر بن جاتے ہیں۔اس دوہری کمزوری کی وجہ سے انسان خود اپنی زندگی کے ان مسائل کو حل کرنے کی جتنی تدبیریں بھی کرتا ہے وہ ناکام ہوتی ہیں اور تجربہ آخر کار اُن کے نقص کو نمایاں کر دیتا ہے۔صحیح حل صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ نقطۂ عدل کو پا لیا جائے اور نقطۂ عدل پایا نہیں جا سکتا جب تک کہ تمام حقائق نہ سہی، کم از کم معلوم حقائق ہی کے سارے پہلو یکساں طور پر نگاہ کے سامنے نہ ہوں۔مگر جہاں منظر کی وسعت بجائے خود اتنی زیادہ ہو کہ بینائی اس پر چھا نہ سکے، اور اس کے ساتھ نفس کی خواہشات اور رغبت و نفرت کے میلانات کا یہ زور ہو کہ جو چیزیں صاف نظر آتی ہوں اُن کی طرف سے بھی خود بخود نگاہ پھر جائے وہاں نقطۂ عدل کس طرح مل سکتا ہے؟ وہاں تو جو حل بھی ہوگا اس میں لامحالہ یا افراط پائی جائے گی یا تفریط۔

اوپر جن دو مسائل کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے صرف پہلا مسئلہ اس وقت ہمارے سامنے زیرِ بحث ہے۔اس باب میں جب ہم تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو افراط اور تفریط کی کھینچ تان کا ایک عجیب سلسلہ نظر آتا ہے۔ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ وہی عورت جو ماں کی حیثیت سے آدمی کو جنم دیتی اور بیوی کی حیثیت سے زندگی کے ہر نشیب و فراز میں مرد کی رفیق رہتی ہے، خادمہ بلکہ لونڈی کے مرتبے میں رکھ دی گئی ہے، اس کو بیچا اور خریدا جاتا ہے، اس کو ملکیت اور وراثت کے تمام حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے، اس کو گناہ اور ذلّت کا مجسّمہ سمجھا جاتا ہے اور اس کی شخصیت کو ابھرنے اور نشو و نما پانے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا۔دوسری طرف ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ وہی عورت اٹھائی اور ابھاری جا رہی ہے مگر اس شان سے کہ اس کے ساتھ بداخلاقی اور بدنظمی کا طوفان بھی اٹھ رہا ہے، وہ حیوانی خواہشات کا کھلونا بنائی جاتی ہے۔اس کو واقعی شیطان کی ایجنٹ بنا کر رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ابھرنے کے ساتھ انسانیت کے گرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ان دونوں انتہاؤں کو ہم محض نظری حیثیت سے افراط و تفریط کے ناموں سے موسوم

نہیں کرتے بلکہ تجربہ جب ان کے بُرے نتائج کا پورا پورا ریکارڈ ہمارے سامنے لاکر رکھ دیتا ہے تب ہم اخلاق کی زبان میں ایک انتہا کو افراط اور دوسری کو تفریط کہتے ہیں۔ تاریخ کا پسِ منظر، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، ہم کو یہ بھی دکھاتا ہے کہ جب ایک قوم وحشت کے دَور سے نکل کر تہذیب و حضارت کی طرف بڑھتی ہے تو اس کی عورتیں، لونڈیوں اور خدمت گاروں کی حیثیت سے اس کے مردوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ابتدا میں بدویانہ طاقتوں کا زور اُسے آگے بڑھائے لیے جاتا ہے۔ مگر تمدّنی ترقی کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اپنے پورے نصف حصّہ کو پستی کی حالت میں رکھ کر وہ آگے نہیں جاسکتی۔ اس کو اپنی ترقی کی رفتار رکتی نظر آتی ہے اور ضرورت کا احساس اسے مجبور کرتا ہے کہ اس نصفِ ثانی کو بھی نصفِ اوّل کے ساتھ چلنے کے قابل بنائے۔ مگر جب وہ اس نقصان کی تلافی شروع کرتی ہے تو صرف تلافی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ آگے بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ عورت کی آزادی سے خاندانی نظام (جو تمدّن کی بنیاد ہے) منہدم ہو جاتا ہے، عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے فواحش کا سیلاب پھوٹ پڑتا ہے، شہوانیت اور عیش پرستی پوری قوم کے اخلاق کو تباہ کرتی ہے، اور اخلاقی تنزّل کے ساتھ ذہنی، جسمانی اور مادّی قوتوں کا تنزّل بھی لازمی طور پر رونما ہوتا ہے جس کا آخری انجام ہلاکت و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

یہاں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ تاریخ سے اس کی مثالیں زیادہ تفصیل کے ساتھ دی جاسکیں مگر توضیحِ مدّعا کے لیے دو چار مثالیں ناگزیر ہیں:

یونان

اقوامِ قدیمہ میں جس قوم کی تہذیب سب سے زیادہ شاندار نظر آتی ہے وہ اہلِ یونان ہیں۔ اس قوم کے ابتدائی دور میں اخلاقی نظریہ، قانونی حقوق اور معاشرتی برتاؤ، ہر اعتبار سے عورت کی حیثیت بہت گری ہوئی تھی۔ یونانی خرافیات (Mythology) میں ایک خیالی عورت پانڈورا (Pandora) کو اسی طرح تمام انسانی مصائب کا موجب قرار دیا گیا تھا جس طرح یہودی خرافیات میں حضرت حوّاؑ کو قرار دیا گیا ہے۔ حضرت حوّاؑ کے متعلق اس غلط افسانے کی شہرت نے عورت کے بارے میں یہودی اور مسیحی اقوام کے رویّے پر جو زبردست اثر ڈالا ہے اور قانون،

معاشرت، اخلاق، ہر چیز کو جس طرح متاثر کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ قریب قریب ایسا ہی اثر پانڈورا کے توہّم کا یونانی ذہن پر بھی ہوا تھا۔ ان کی نگاہ میں عورت ایک ادنیٰ درجہ کی مخلوق تھی۔ معاشرت کے ہر پہلو میں اس کا مرتبہ گرا ہوا رکھا گیا تھا اور عزّت کا مقام مرد کے لیے مخصوص تھا۔

تمدّنی ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں یہ طرزِ عمل تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ برقرار رہا۔ تہذیب اور علم کی روشنی کا صرف اتنا اثر ہوا کہ عورت کا قانونی مرتبہ تو جوں کا توں رہا، البتہ معاشرت میں ان کو نسبتاً ایک بلند تر حیثیت دے دی گئی۔ وہ یونانی گھر کی ملکہ تھی۔ اس کے فرائض کا دائرہ گھر تک محدود تھا اور ان حدود میں وہ پوری طرح با اقتدار تھی۔ اس کی عصمت ایک قیمتی چیز تھی جس کو قدر و عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ شریف یونانیوں کے ہاں پردے کا رواج تھا۔ ان کے گھروں میں زنان خانے، مردان خانوں سے الگ ہوتے تھے۔ ان کی عورتیں مخلوط محفلوں میں شریک نہ ہوتی تھیں، نہ منظرِ عام پر نمایاں کی جاتی تھیں۔ نکاح کے ذریعہ سے کسی ایک مرد کے ساتھ وابستہ ہونا عورت کے لیے شرافت کا مرتبہ تھا اور اسی کی عزت تھی۔ اور بیسوا بن کر رہنا اس کے لیے ذلّت کا موجب سمجھا جاتا تھا۔ یہ اس زمانہ کا حال تھا جب یونانی قوم خوب طاقتور تھی اور پورے زور کے ساتھ عروج و ترقی کی طرف جا رہی تھی۔ اس دور میں اخلاقی خرابیاں ضرور موجود تھیں مگر ایک حد کے اندر تھیں۔ یونانی عورتوں سے اخلاق کی جس پاکیزگی اور طہارت و عصمت کا مطالبہ کیا جاتا تھا اس سے مرد مستثنیٰ تھے۔ اُن سے نہ اس کا مطالبہ تھا اور نہ اخلاقاً کسی مرد سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ پاک زندگی بسر کرے گا۔ بیسوا طبقہ یونانی معاشرت کا ایک غیر منفک جُز تھا، اور اس طبقے سے تعلّق رکھنا مردوں کے لیے کسی طرح معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔

رفتہ رفتہ اہلِ یونان پر نفس پرستی اور شہوانیت کا غلبہ شروع ہوا اور اس دَور میں بیسوا طبقہ کو وہ عروج نصیب ہوا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ رنڈی کا کوٹھا یونانی سوسائٹی کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ طبقوں تک ہر ایک کا مرکز و مرجع بنا ہوا تھا۔ فلاسفہ، شعرا، مؤرخین، اہلِ ادب اور ماہرینِ فنون، غرض تمام سیارے اسی آفتاب کے گرد گھومتے تھے۔ وہ نہ صرف علم و ادب کی محفلوں کی صدر نشین تھی، بلکہ بڑے بڑے سیاسی معاملات بھی اسی کے حضور میں طے ہوتے تھے۔ قوم کی زندگی و موت کا فیصلہ جن مسائل کے ساتھ وابستہ تھا اُن میں اس عورت کی رائے وقیع سمجھی جاتی تھی جس کی دو راتیں بھی کسی ایک شخص کے ساتھ وفاداری میں بسر نہ ہوتی تھیں۔

یونانیوں کے ذوقِ جمال اور حُسن پرستی نے ان کے اندر شہوانیت کی آگ کو اور زیادہ بھڑکایا۔ وہ اپنے اس ذوق کا اظہار جن مجسّموں (یا آرٹ کے عریاں نمونوں) میں کرتے تھے وہی ان کی شہوانیت کو اور زیادہ ہوا دیتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ ان کے ذہن سے یہ تصوّر ہی محو ہو گیا تھا کہ شہوت پرستی بھی کوئی اخلاقی عیب ہے۔ ان کا معیارِ اخلاق اتنا بدل گیا تھا کہ بڑے بڑے فلاسفہ اور معلّمینِ اخلاق بھی زنا اور فحش میں کوئی قباحت اور کوئی چیز قابلِ ملامت نہ پاتے تھے۔ عام طور پر یونانی لوگ نکاح کو ایک غیر ضروری رسم سمجھنے لگے تھے اور نکاح کے بغیر عورت اور مرد کا تعلّق بالکل معقول سمجھا جاتا تھا، جس کو کسی سے چھپانے کی ضرورت نہ تھی۔ آخر کار ان کے مذہب نے بھی ان کی حیوانی خواہشات کے آگے سپر ڈال دی۔ کام دیوی (Aphrodite) کی پرستش تمام یونان میں پھیل گئی، جس کی داستان ان کے خرافیات میں یہ تھی کہ ایک دیوتا کی بیوی ہوتے ہوئے اس نے تین مزید دیوتاؤں سے آشنائی کر رکھی تھی، اور اُن کے ماسوا ایک فانی انسان کو بھی اس کی جناب میں سرفرازی کا فخر حاصل تھا۔ اسی کے بطن سے محبت کا دیوتا کیوپڈ پیدا ہوا جو اُن دیوی صاحبہ اور اُن کے غیر قانونی دوست کی باہمی لگاوٹ کا نتیجہ تھا۔ یہ اس قوم کی معبودہ تھی، اور اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جو قوم ایسے کیریکٹر کو نہ صرف مثال (آئیڈیل) بلکہ معبودیت تک کا درجہ دے دے اس کے معیارِ اخلاق کی پستی کا کیا عالم ہوگا۔ یہ اخلاقی انحطاط کا وہ مرتبہ ہے جس میں گرنے کے بعد کوئی قوم پھر کبھی نہ ابھر سکی۔ ہندستان میں بام مارگ اور ایران میں مزدکیت کا ظہور ایسے ہی انحطاط کے دور میں ہوا۔ بابل میں بھی قحبہ گری کو مذہبی تقدّس کا درجہ ایسے ہی حالات میں حاصل ہوا جس کے بعد پھر دنیا نے کبھی بابل کا نام افسانۂ ماضی کے سوا کسی دوسری حیثیت سے نہ سُنا۔ یونان میں جب کام دیوی کی پرستش شروع ہوئی تو قحبہ خانہ عبادت گاہ میں تبدیل ہو گیا، فاحشہ عورتیں دیوداسیاں بن گئیں اور زنا ترقی کر کے ایک مقدّس مذہبی فعل کے مرتبے تک پہنچ گئی۔

اسی شہوت پرستی کا ایک دوسرا مظہر یہ تھا کہ یونانی قوم میں عملِ قومِ لوط ایک وبا کی طرح پھیلا اور مذہب و اخلاق نے اس کا بھی خیر مقدم کیا۔ ہومر اور ہسیوڈ کے عہد میں اس فعل کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ مگر تمدّن کی ترقی نے جب آرٹ اور ذوقِ جمال (Asthetics) کے مہذّب ناموں سے عریانی اور لذّاتِ نفس کی بندگی کو سراہنا شروع کیا تو شہوانی جذبات کا اشتعال بڑھتے

بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا کہ فطرت کے راستے سے تجاوز کر کے یونانیوں کو خلافِ وضعِ فطرت طریقہ میں تسکین کی جستجو کرنی پڑی۔ آرٹ کے ماہروں نے اس جذبہ کو مجسّموں میں نمایاں کیا۔ معلّمینِ اخلاق نے اس کو دو شخصوں کے درمیان ''دوستی کا مضبوط رشتہ'' قرار دیا۔ سب سے پہلے دو یونانی انسان جو اس قدر کے مستحق سمجھے گئے کہ ان کے اہلِ وطن ان کے مجسّمے بنا کر ان کی یاد تازہ رکھیں وہ ہرمُوڈِیس اور آرِسٹوگیٹن تھے۔ جن کے درمیان غیر فطری محبت کا تعلّق تھا۔

تاریخ کی شہادت تو یہی ہے کہ اس دور کے بعد یونانی قوم کو زندگی کا کوئی دوسرا دور پھر نصیب نہیں ہوا۔

روم

یونانیوں کے بعد جس قوم کو دنیا میں عروج نصیب ہوا، وہ اہلِ روم تھے۔ یہاں پھر وہی اتار چڑھاؤ کا مرقع ہمارے سامنے آتا ہے جو اوپر آپ دیکھ چکے ہیں۔ رومی لوگ وحشت کی تاریکی سے نکل کر جب تاریخ کے روشن منظر پر نمودار ہوتے ہیں تو ان کے نظامِ معاشرت کا نقشہ یہ ہوتا ہے کہ مرد اپنے خاندان کا سردار ہے۔ اس کو اپنی بیوی بچّوں پر پورے حقوقِ مالکانہ حاصل ہیں بلکہ بعض حالات میں وہ بیوی کو قتل کر دینے کا بھی مجاز ہے۔

جب وحشت کم ہوئی اور تمدّن و تہذیب میں رومیوں کا قدم آگے بڑھا تو اگرچہ قدیم خاندانی نظام بدستور قائم رہا مگر عملاً اس کی سختیوں میں کچھ کمی واقع ہوئی اور ایک حد تک اعتدالی حالت پیدا ہوتی گئی۔ رومی جمہوریت کے زمانۂ عروج میں یونان کی طرح پردے کا رواج تو نہ تھا۔ مگر عورت اور جوان نسل کو خاندانی نظام میں کس کر رکھا گیا تھا۔ عصمت و عفت، خصوصاً عورت کے معاملے میں ایک قیمتی چیز تھی اور اس کو معیارِ شرافت سمجھا جاتا تھا۔ اخلاق کا معیار کافی بلند تھا۔ ایک مرتبہ رومی سینٹ کے ایک ممبر نے اپنی بیٹی کے سامنے اپنی بیوی کا بوسہ لیا تو اس کو قومی اخلاق کی سخت توہین سمجھا گیا اور سینٹ میں اس پر ملامت کا ووٹ پاس کیا گیا۔ عورت اور مرد کے تعلّق کی جائز اور شریفانہ صورت نکاح کے سوا کوئی دوسری نہ تھی۔ ایک عورت اسی وقت عزّت کی مستحق ہوسکتی تھی جب کہ وہ ایک خاندان کی ماں (Matron) ہو۔ بیسوا طبقہ اگرچہ موجود تھا اور مردوں کو ایک حد تک اس طبقہ سے ربط رکھنے کی آزادی بھی تھی، مگر عام رومیوں کی نگاہ میں

اس کی حیثیت نہایت ذلیل تھی اور اس سے تعلق رکھنے والے مردوں کو بھی اچھی نظر سے نہ دیکھا جاتا تھا۔

تہذیب وتمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اہلِ روم کا نظریہ عورت کے بارے میں بدلتا چلا گیا اور رفتہ رفتہ نکاح وطلاق کے قوانین اور خاندانی نظام کی ترکیب میں اتنا تغیر رونما ہوا کہ صورتِ حال سابق حالات کے بالکل برعکس ہوگئی۔ نکاح محض ایک قانونی معاہدہ (Civil Contract) بن کر رہ گیا۔ جس کا قیام و بقا فریقین کی رضامندی پر منحصر تھا۔ ازدواجی تعلق کی ذمہ داریوں کو بہت ہلکا سمجھا جانے لگا۔ عورت کو وراثت اور ملکیتِ مال کے پورے حقوق دے دیے گئے اور قانون نے اس کو باپ اور شوہر کے اقتدار سے بالکل آزاد کردیا۔ رومی عورتیں معاشی حیثیت سے نہ صرف خودمختار ہوگئیں بلکہ قومی دولت کا ایک بڑا حصّہ بتدریج ان کے حیطۂ اختیار میں چلا گیا۔ وہ اپنے شوہروں کو بھاری شرحِ سود پر قرض دیتی تھیں، اور مالدار عورتوں کے شوہر عملاً ان کے غلام بن کر رہ جاتے تھے۔ طلاق کی آسانیاں اس قدر بڑھیں کہ بات بات پر ازدواج کا رشتہ توڑا جانے لگا۔ مشہور رومی فلسفی و مدبّر سنیکا (۴ ق۔م تا ۶۵ م) سختی کے ساتھ رومیوں کی کثرتِ طلاق پر ماتم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اب روم میں طلاق کوئی بڑی شرم کے قابل چیز نہیں رہی۔ عورتیں اپنی عمر کا حساب شوہروں کی تعداد سے لگاتی ہیں۔ اس دور میں ایک عورت یکے بعد دیگرے کئی کئی شادیاں کرتی چلی جاتی تھی۔ مارشل (۴۳ م تا ۱۰۴ م) ایک عورت کا ذکر کرتا ہے جو دس خاوند کر چکی تھی۔ جووینل (۶۰ م تا ۱۴۰ م) ایک عورت کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے پانچ سال میں آٹھ شوہر بدلے۔ سینٹ جروم (۳۴۰ م تا ۴۲۰ م) ان سب سے زیادہ ایک باکمال عورت کا حال لکھتا ہے جس نے آخری بار تیئیسواں شوہر کیا تھا اور اپنے شوہر کی بھی وہ اکیسویں بیوی تھی۔

اس دور میں عورت اور مرد کے غیر نکاحی تعلق کو معیوب سمجھنے کا خیال بھی دلوں سے نکلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے معلّمینِ اخلاق بھی زنا کو ایک معمولی چیز سمجھنے لگے۔ کاٹو (Cato) ''جس کو ۱۸۴ ق۔م میں روم کا محتسب اخلاق مقرر کیا گیا تھا'' صحیح طور پر جوانی کی آوارگی کو حق بجانب ٹھیراتا ہے۔ سسرو جیسا شخص نوجوانوں کے لیے اخلاق کے بند ڈھیلے کرنے کی سفارش کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اپکٹیٹس (Epictetus) جو فلاسفۂ رواقیین (Stoics) میں بہت ہی سخت اخلاقی اصول رکھنے والا سمجھا جاتا تھا، اپنے شاگردوں کو ہدایت کرتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے شادی سے پہلے

عورت کی صحبت سے اجتناب کرو، مگر جو اس معاملہ میں ضبط نہ رکھ سکیں انہیں ملامت بھی نہ کرو۔

اخلاق اور معاشرت کے بند جب اتنے ڈھیلے ہو گئے تو روم میں شہوانیت، عریانی اور فواحش کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ تھیٹروں میں بے حیائی و عریانی کے مظاہرے ہونے لگے۔ ننگی اور نہایت فحش تصویریں ہر گھر کی زینت کے لیے ضروری ہو گئیں۔ قحبہ گری کے کاروبار کو وہ فروغ نصیب ہوا کہ قیصر ٹائبریس (١٤م تا ٣٧م) کے عہد میں معزز خاندان کی عورتوں کو پیشہ ور طوائف بننے سے روکنے کے لیے ایک قانون نافذ کرنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ فلورا (Flora) نامی ایک کھیل رومیوں میں نہایت مقبول ہوا، کیوں کہ اس میں برہنہ عورتوں کی دوڑ ہوا کرتی تھی۔ عورتوں اور مردوں کے برسرِ عام یکجا غسل کرنے کا رواج بھی اس دور میں عام تھا۔ رومی لٹریچر میں فحش اور عریاں مضامین بے تکلف بیان کیے جاتے تھے اور عوام و خواص میں وہی ادب مقبول ہوتا تھا جس میں استعارہ و کنایہ تک کا پردہ نہ رکھا گیا ہو۔

بہیمی خواہشات سے اس قدر مغلوب ہو جانے کے بعد روم کا قصرِ عظمت ایسا پیوندِ خاک ہوا کہ پھر اس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ قائم نہ رہی۔

مسیحی یورپ

مغربی دنیا کے اس اخلاقی انحطاط کا علاج کرنے کے لیے مسیحیت پہنچی اور اوّل اوّل اس نے بڑی اچھی خدمات انجام دیں۔ فواحش کا انسداد کیا۔ عریانی کو زندگی کے ہر شعبے سے نکالا۔ قحبہ گری کو بند کرنے کی تدبیریں کیں۔ طوائف اور مغنیّہ اور رقّاصہ عورتوں کو ان کے پیشہ سے توبہ کرائی، اور پاکیزہ اخلاقی تصوّرات لوگوں میں پیدا کیے۔ مگر عورت اور صنفی تعلقات کے بارے میں آبائے مسیحیین جو نظریات رکھتے تھے وہ انتہا پسندی کی بھی انتہا تھے، اور ساتھ ہی فطرتِ انسانی کے خلاف اعلانِ جنگ بھی۔

اُن کا ابتدائی اور بنیادی نظریہ یہ تھا کہ عورت گناہ کی ماں اور بدی کی جڑ ہے۔ معصیت کی تحریک کا سرچشمہ اور جہنم کا دروازہ ہے۔ تمام انسانی مصائب کا آغاز اسی سے ہوا ہے۔ اس کا عورت ہونا ہی اس کے شرمناک ہونے کے لیے کافی ہے۔ اس کو اپنے حسن و جمال پر شرمانا چاہیے کیوں کہ وہ شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس کو دائماً کفارہ ادا کرتے رہنا چاہیے کیوں کہ

وہ دنیا اور دنیا والوں پر لعنت اور مصیبت لائی ہے۔ ترتولیان (Tertullian) جو ابتدائی دور کے ائمہ مسیحیت میں سے تھا، عورت کے متعلق مسیحی تصوّر کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے:

''وہ شیطان کے آنے کا دروازہ ہے۔ وہ شجرِ ممنوع کی طرف لے جانے والی، خدا کے قانون کو توڑنے والی، خدا کی تصویر ـــــ مرد کو غارت کرنے والی ہے۔''

کرائی سوسٹم (Chrysostum) جو مسیحیت کے اولیاء کبار میں شمار کیا جاتا ہے۔ عورت کے حق میں کہتا ہے:

''ایک ناگزیر برائی، ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطرہ، ایک غارت گر دلربائی، ایک آراستہ مصیبت۔''

ان کا دوسرا نظریہ یہ تھا کہ عورت اور مرد کا صنفی تعلق بجائے خود ایک نجاست اور قابلِ احتراز چیز ہے، خواہ وہ نکاح کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ اخلاق کا یہ راہبانہ تصوّر پہلے سے اِشراقی فلسفہ (Neo-Platonism) کے زیر اثر مغرب میں جڑ پکڑ رہا تھا مسیحیت نے آکر اسے حد کو پہنچا دیا۔ اب تجرّد اور دوشیزگی معیارِ اخلاق قرار پائی اور تاہّل کی زندگی اخلاقی اعتبار سے پست اور ذلیل سمجھی جانے لگی۔ لوگ ازدواج سے پرہیز کرنے کو تقویٰ اور تقدّس اور بلندیِ اخلاق کی علامت سمجھنے لگے۔ پاک مذہبی زندگی بسر کرنے کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ یا تو آدمی نکاح ہی نہ کرے، یا اگر نکاح کر لیا ہو تو میاں اور بیوی ایک دوسرے سے زن و شوہر کا تعلق نہ رکھیں۔ متعدد مذہبی مجلسوں میں یہ قوانین مقرر کیے گئے کہ چرچ کے عہدہ دار تخلیہ میں اپنی بیویوں سے نہ ملیں، میاں اور بیوی کی ملاقات ہمیشہ کھلی جگہ میں ہو اور کم از کم دو غیر آدمی وہاں موجود ہوں ازدواجی تعلق کے نجس ہونے کا تخیّل طرح طرح سے مسیحیوں کے دل میں بٹھایا جاتا تھا۔ مثلاً ایک قاعدہ یہ تھا کہ جس روز چرچ کا کوئی تہوار ہو اس سے پہلے کی رات جن میاں بیوی نے یکجا گزاری ہو وہ تہوار میں شریک نہیں ہو سکتے۔ گویا انہوں نے کسی گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ جس سے آلودہ ہونے کے بعد وہ کسی مقدّس مذہبی کام میں حصّہ لینے کے قابل نہیں رہے! اس راہبانہ تصوّر نے تمام خاندانی علائق، حتّٰی کہ ماں اور بیٹے تک کے تعلق میں تلخی پیدا کر دی، اور ہر وہ رشتہ گندگی اور گناہ بن کر رہ گیا جو نکاح کا نتیجہ ہو۔

ان دونوں نظریات نے نہ صرف اخلاق اور معاشرت میں عورت کی حیثیت حد سے

زیادہ گرادی بلکہ تمدنی قوانین کو بھی اس درجہ متاثر کیا کہ ایک طرف ازدواجی زندگی مردوں اور عورتوں کے لیے مصیبت بن کر رہ گئی اور دوسری طرف سوسائٹی میں عورت کا مرتبہ ہر حیثیت سے پست ہو گیا۔ مسیحی شریعت کے زیر اثر جتنے قوانین مغربی دنیا میں جاری ہوئے ان سب کی خصوصیات یہ تھیں:

۱- معاشی حیثیت سے عورت کو بالکل بے بس کر کے مرد کے قابو میں دے دیا گیا۔ وراثت میں اس کے حقوق نہایت محدود تھے اور ملکیت میں اس سے بھی زیادہ محدود۔ وہ خود اپنی محنت کی کمائی پر بھی اختیار نہ رکھتی تھی بلکہ اس کی ہر چیز کا مالک اس کا شوہر تھا۔

۲- طلاق اور خلع کی سرے سے اجازت ہی نہ تھی۔ زوجین میں خواہ کتنی ہی ناموافقت ہو۔ باہمی تعلقات کی خرابی سے خواہ گھر نمونۂ جہنم ہی بن گیا ہو، مذہب اور قانون دونوں ان کو زبردستی ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہنے پر مجبور کرتے تھے۔ بعض انتہائی شدید حالات میں زیادہ سے زیادہ جو تدارک ممکن تھا وہ صرف یہ تھا کہ زوجین میں تفریق (Separation) کرادی جائے۔ یعنی وہ ایک دوسرے سے بس الگ کر دیے جائیں۔ الگ ہو کر نکاحِ ثانی کرنے کا حق نہ عورت کو تھا نہ مرد کو۔ درحقیقت یہ تدارک پہلی صورت سے بھی بدتر تھا کیوں کہ اس کے بعد ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ یا تو وہ دونوں راہب اور راہبہ بن جائیں، یا پھر تمام عمر بدکاری کرتے رہیں۔

۳- شوہر کے مرنے کی صورت میں بیوی کے لیے اور بیوی کے مرنے کی صورت میں شوہر کے لیے نکاحِ ثانی کرنا سخت معیوب بلکہ گناہ قرار دیا گیا تھا۔ مسیحی علماء کہتے تھے کہ یہ محض حیوانی خواہشات کی بندگی اور ہوس رانی ہے۔ ان کی زبان میں اس فعل کا نام "مہذّب زناکاری" تھا۔ چرچ کے قانون میں مذہبی عہدیداروں کے لیے نکاحِ ثانی کرنا جرم تھا۔ عام ملکی قوانین میں بعض جگہ اس کی سرے سے اجازت ہی نہ تھی اور جہاں قانون اجازت دیتا تھا وہاں بھی رائے عامہ جو مذہبی تصوّرات کے زیر اثر تھی اس کو جائز نہ رکھتی تھی۔

جدید یورپ

اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ کے فلاسفہ اور اہلِ قلم نے جب سوسائٹی کے خلاف

فرد کے حقوق کی حمایت میں آواز اٹھائی اور شخصی آزادی کا صور پھونکا تو ان کے سامنے وہی غلط نظامِ تمدّن تھا جو مسیحی نظامِ اخلاق وفلسفۂ زندگی اور نظامِ جاگیرداری (Feudal System) کے منحوس اتحاد سے پیدا ہوا تھا اور جس نے انسانی روح کو غیر فطری زنجیروں میں جکڑ کر ترقی کے سارے دروازے بند کر رکھے تھے۔ اس نظام کو توڑ کر ایک نیا نظام بنانے کے لیے جو نظریات جدید یورپ کے معماروں نے پیش کیے ان کے نتیجہ میں انقلاب فرانس رونما ہوا اور اس کے بعد مغربی تہذیب وتمدّن کی رفتارِ ترقی ان راستوں پر لگ گئی جن پر بڑھتے بڑھتے وہ آج کی منزل پر پہنچی ہے۔

اس دور جدید کے آغاز میں صنفِ اناث کو پستی سے اٹھانے کے لیے جو کچھ کیا گیا اجتماعی زندگی پر اس کے خوشگوار نتائج مترتب ہوئے۔ نکاح وطلاق کے پچھلے قوانین کی سختی کم کی گئی۔ عورتوں کے معاشی حقوق، جو بالکل سلب کر لیے گئے تھے، بڑی حد تک انہیں واپس دیے گئے۔ ان اخلاقی نظریات کی اصلاح کی گئی، جن کی بنا پر عورت کو ذلیل وحقیر سمجھا جاتا تھا۔ معاشرت کے ان اصولوں میں ترمیم کر دی گئی جن کی وجہ سے عورت فی الواقع لونڈی بن کر رہ گئی تھی۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم وتربیت کے دروازے مردوں کی طرح عورتوں کے لیے بھی کھولے گئے۔ ان مختلف تدابیر سے رفتہ رفتہ عورتوں کی قابلیتیں جو غلط قوانینِ معاشرت اور جاہلانہ اخلاقی تصورات کے بھاری بوجھوں تلے دبی ہوئی تھیں، اُبھر آئیں۔ انہوں نے گھروں کو سنوارا۔ معاشرت میں نفاست پیدا کی رفاہِ عام کے بہت سے مفید کام کیے۔ صحتِ عامہ کی ترقی، نئی نسلوں کی عمدہ تربیت بیماروں کی خدمت اور فنونِ خانہ داری کا نشوونما، یہ سب کچھ اُس بیداری کے ابتدائی پھل تھے جو تہذیبِ نو کی بدولت عورتوں میں رونما ہوئی۔ لیکن جن نظریات کے بطن سے یہ نئی تحریک اٹھی تھی ان میں ابتدا ہی سے افراط کا میلان موجود تھا۔ انیسویں صدی میں اس میلان نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی اور بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے مغربی معاشرت بے اعتدالی کی دوسری انتہا پر پہنچ گئی۔

یہ نظریات جن پر نئی مغربی معاشرت کی بنا رکھی گئی ہے، تین عنوان کے تحت آتے ہیں:

(۱) عورتوں اور مردوں کی مساوات۔

(۲) عورتوں کا معاشی استقلال (Economic Independence)۔

(۳) دونوں صنفوں کا آزادانہ اختلاط۔

ان تین بنیادوں پر معاشرت کی تعمیر کرنے کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا بالآخر ـــ وہی ظاہر ہوا۔

۱۔مساوات کے معنی یہ سمجھ لیے گے کہ عورت اور مرد نہ صرف اخلاقی مرتبہ اور انسانی حقوق میں مساوی ہوں، بلکہ تمدّنی زندگی میں عورت بھی وہی کام کرے جو مرد کرتے ہیں۔ اور اخلاقی بندشیں عورت کے لیے بھی اسی طرح ڈھیلی کر دی جائیں جس طرح مرد کے لیے پہلے سے ڈھیلی ہیں۔ مساوات کے اس غلط تخیُّل نے عورت کو اُس کے اُن فطری وظائف سے غافل اور منحرف کر دیا جن کی بجا آوری پر تمدّن کے بقاء بلکہ نوعِ انسانی کے بقاء کا انحصار ہے۔ معاشی، سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں نے اس کی شخصیت کو پوری طرح اپنے اندر جذب کر لیا۔ انتخابات کی جدوجہد، دفتروں اور کارخانوں کی ملازمت، آزاد تجارتی و صنعتی پیشوں میں مردوں کے ساتھ مقابلہ، کھیلوں اور ورزشوں کی دوڑ دھوپ، سوسائٹی کے تفریحی مشاغل میں شرکت، کلب اور اسٹیج اور رقص و سرود کی مصروفیتیں، یہ اور ان کے سوا اور بہت سی ناکردنی و ناگفتنی چیزیں اس پر کچھ اس طرح چھا گئیں کہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں، بچّوں کی تربیت، خاندان کی خدمت، گھر کی تنظیم، ساری چیزیں اس کے لائحۂ عمل سے خارج ہو کر رہ گئیں، بلکہ ذہنی طور پر وہ ان مشاغل ـــ اپنے اصلی فطری مشاغل ـــ سے متنفّر ہو گئی۔ اب مغرب میں خاندان کا نظام، جو تمدّن کا سنگِ بنیاد ہے، بری طرح منتشر ہو رہا ہے۔ گھر کی زندگی، جس کے سکون پر انسان کی قوتِ کارکردگی کے نشوونما کا انحصار ہے، عملاً ختم ہو رہی ہے۔ نکاح کا رشتہ، جو تمدّن کی خدمت میں عورت اور مرد کے تعاون کی صحیح صورت ہے، تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہو گیا ہے، نسلوں کی افزائش کو برتھ کنٹرول اور اسقاطِ حمل اور قتلِ اولاد کے ذریعہ سے روکا جا رہا ہے۔ اخلاقی مساوات کے غلط تخیّل نے عورتوں اور مردوں کے درمیان بداخلاقی میں مساوات قائم کر دی ہے۔ وہ بے حیائیاں جو کبھی مردوں کے لیے بھی شرمناک تھیں، اب وہ عورتوں تک کے لیے شرمناک نہیں رہیں۔

۲۔عورت کے معاشی استقلال نے اس کو مرد سے بے نیاز کر دیا ہے۔ وہ قدیم اصول کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے، اب اس نئے قاعدہ سے بدل گیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کمائیں اور گھر کا انتظام بازار کے سپرد کر دیا جائے۔ اس انقلاب کے بعد دونوں کی زندگی

میں بجز ایک شہوانی تعلق کے اور کوئی ربط ایسا باقی نہیں رہا جوان کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہونے پر مجبور کرتا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ محض شہوانی خواہشات کو پورا کرنا کوئی ایسا کام نہیں ہے جس کی خاطر مرد اور عورت لامحالہ اپنے آپ کو ایک دائمی تعلّق ہی کی گرہ میں باندھنے اور ایک گھر بنا کر مشترک زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ جو عورت اپنی روٹی آپ کماتی ہے، اپنی تمام ضروریات کی خود کفیل ہے، اپنی زندگی میں دوسرے کی حفاظت اور اعانت کی محتاج نہیں ہے، وہ آخر محض اپنی شہوانی خواہش کی تسکین کے لیے کیوں ایک مرد کی پابند ہو؟ کیوں اپنے اوپر بہت سی اخلاقی اور قانونی بندشیں عائد کرے؟ کیوں ایک خاندان کی ذمہ داریوں کا بار اٹھائے؟ خصوصاً جب کہ اخلاقی مساوات کے تخیل نے اس کی راہ سے وہ تمام رکاوٹیں بھی دور کر دی ہوں جو اسے آزاد شہوت رانی کا طریقہ اختیار کرنے میں پیش آ سکتی تھیں۔ تو وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے آسان اور پُر لطف اور خوشنما راستہ چھوڑ کر قربانیوں اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے لدا ہوا پُرانا دقیانوسی (Old Fashioned) راستہ کیوں اختیار کرے؟ گناہ کا خیال مذہب کے ساتھ رخصت ہوا۔ سوسائٹی کا خوف یوں دور ہو گیا کہ سوسائٹی اب اسے فاحشہ ہونے پر ملامت نہیں کرتی بلکہ ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے۔ آخری خطرہ حرامی بچّے کی پیدائش کا تھا، سو اس سے بچنے کے لیے منعِ حمل کے ذرائع موجود ہیں۔ ان ذرائع کے باوجود حمل قرار پا جائے تو اسقاط میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس میں بھی کامیابی نہ ہو تو بچّے کو خاموشی کے ساتھ قتل کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر کمبخت جذبۂ مادری نے (جو بدقسمتی سے ابھی بالکل فنا نہیں ہو سکا ہے) بچّے کو ہلاک کرنے سے روک بھی دیا تو حرامی بچّے کی ماں بن جانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ اب ”کنواری ماں“ اور ”ناجائز مولود“ کے حق میں اتنا پروپگنڈہ ہو چکا ہے کہ جو سوسائٹی ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کی جرأت کرے گی اسے خود تاریک خیالی کا اُلٹا الزام اپنے سر لینا پڑے گا۔

یہ وہ چیز ہے جس نے مغربی معاشرت کی جڑیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ آج ہر ملک میں لاکھوں جوان عورتیں تجرّد پسند ہیں جن کی زندگیاں آزاد شہوت رانی میں بسر ہو رہی ہیں۔ اُن میں سے بہت زیادہ وہ عورتیں ہیں جو عارضی جذباتِ محبت کے زور سے شادیاں کر لیتی ہیں، مگر چوں کہ اب شہوانی تعلق کے سوا مرد اور عورت کے درمیان کوئی ایسا احتیاجی ربط باقی نہیں رہا ہے جو انہیں مستقل وابستگی پر مجبور کرتا ہو۔ اس لیے مناکحت کے رشتہ میں اب کوئی پائیداری نہیں رہی۔

میاں اور بیوی جو ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہو چکے ہیں، آپس کے تعلقات میں کسی مراعاتِ باہمی اور کسی مدارات (Compromise) کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ نری شہوانی محبت کے جذبات بہت جلدی ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک ادنیٰ وجہِ اختلاف بلکہ بسا اوقات صرف سرد مہری ہی انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر نکاحوں کا انجام طلاق یا تفریق پر ہوتا ہے۔ منعِ حمل، اسقاط، قتلِ اولاد، شرح پیدائش کی کمی اور ناجائز ولادتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد بڑی حد تک اسی سبب کی رہینِ منّت ہے۔ بدکاری، بے حیائی اور امراضِ خبیثہ کی ترقی میں بھی اس کیفیت کا بڑا دخل ہے۔

۳- مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط نے عورتوں میں حسن کی نمائش، عریانی اور فواحش کو غیر معمولی ترقی دے دی ہے۔ صنفی میلان (Sexual Attraction) جو پہلے ہی فطری طور پر مرد اور عورت کے درمیان موجود ہے اور کافی طاقتور ہے، دونوں صنفوں کے آزادانہ میل جول کی صورت میں بہت آسانی کے ساتھ غیر معمولی حد تک ترقی کرتا جاتا ہے، پھر اس قسم کی مخلوط سوسائٹی میں قدرتی طور پر دونوں صنفوں کے اندر یہ جذبہ ابھر آتا ہے کہ صنفِ مقابل کے لیے زیادہ سے زیادہ جاذبِ نظر (Attractive) بنیں اور جب کہ اخلاقی نظریات کے بدل جانے کی وجہ سے ایسا کرنا معیوب بھی نہ رہا ہو، بلکہ علانیہ شانِ دلربائی پیدا کرنے کو مستحسن سمجھا جانے لگا ہو، تو حسن و جمال کی نمائش رفتہ رفتہ تمام حدود کو توڑتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ برہنگی کی آخری حد کو پہنچ کر ہی دم لیتی ہے۔ یہی کیفیت اس وقت مغربی تہذیب میں پیدا ہوگئی ہے۔ صنفِ مقابل کے لیے مقناطیس بننے کی خواہش عورت میں اتنی بڑھ گئی ہے اور اتنی بڑھتی چلی جارہی ہے کہ شوخ و شنگ لباسوں، غازوں اور سرخیوں اور بناؤ سنگھار کے نت نئے سامانوں سے اس کی تسکین نہیں ہوتی۔ بیچاری تنگ آکر اپنے کپڑوں سے باہر نکلی پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات تار تک لگا نہیں رہنے دیتی۔ ادھر مردوں کی طرف سے ہر وقت "ھل من مزید" کا تقاضا ہے، کیوں کہ جذبات میں جو آگ لگی ہوئی ہے وہ حسن کی ہر بے حجابی پر بجھتی نہیں بلکہ اور زیادہ بھڑکتی ہے، اور مزید بے حجابی کا مطالبہ کرتی ہے۔ ان غریبوں کی پیاس بھی بڑھتے بڑھتے تونس بن گئی ہے۔ جیسے کسی کو لُو لگ گئی ہو اور پانی کا ہر گھونٹ پیاس کو بجھانے کے بجائے اور بھڑکا دیتا ہو۔ حد سے بڑھی ہوئی شہوانی پیاس سے بیتاب ہو کر بیچارے ہر وقت ہر ممکن طریقے سے اس کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے رہتے

ہیں۔ یہ ننگی تصویریں، یہ صنفی لٹریچر، یہ عشق ومحبت کے افسانے، یہ عریاں اور جوڑواں ناچ، یہ جذباتِ شہوانی سے بھرے ہوئے فلم، آخر کیا ہیں؟ سب اسی آگ کو بجھانے ـــ مگر دراصل بھڑکانے ـــ کے سامان ہیں۔ جو اس غلط معاشرت نے ہر سینے میں لگا رکھی ہے اور اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے اس کا نام انہوں نے رکھا ہے ''آرٹ''۔

یہ گھُن بڑی تیزی کے ساتھ مغربی قوموں کی قوتِ حیات کو کھا رہا ہے۔ یہ گھُن لگنے کے بعد آج تک کوئی قوم نہیں بچی۔ یہ اُن تمام ذہنی اور جسمانی قوتوں کو کھا جاتا ہے، جو قدرت نے انسان کو زندگی اور ترقی کے لیے عطا کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ہر طرف سے شہوانی محرکات میں گھرے ہوں، جن کے جذبات کو ہر آن ایک نئی تحریک اور ایک نئے اشتعال سے سابقہ پڑے جن پر ایک سخت ہیجان انگیز ماحول پوری طرح چھا گیا ہو، جن کے خون کو عریاں تصویریں، فحش لٹریچر، ولولہ انگیز گانے، برانگیختہ کرنے والے ناچ، عشق ومحبت کے فلم، دل چھیننے والے زندہ مناظر اور صنفِ مقابل سے ہر وقت کی مڈبھیڑ کے مواقع پیہم ایک جوش کی حالت میں رکھتے ہوں، وہ کہاں سے وہ امن، وہ سکون اور وہ اطمینان لا سکتے ہیں، جو تعمیری اور تخلیقی کاموں کے لیے ضروری ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایسے ہیجانات کے درمیان اُن کو، اور خصوصاً اُن کی جوان نسلوں کو وہ ٹھنڈی اور پرسکون فضا میسّر ہی کہاں آ سکتی ہے جو ان کی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کے نشوونما کے لیے ناگزیر ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی تو بہیمی خواہشات کا دیو اُن کو دبوچ لیتا ہے، اس کے چنگل میں پھنس کر وہ پنپ کیسے سکتے ہیں؟

فکرِ انسانی کی المناک نارسائی

تین ہزار سال کے تاریخی نشیب وفراز کی یہ مسلسل داستان ایک بڑے خطۂ زمین سے تعلق رکھتی ہے جو پہلے بھی دو عظیم الشان تہذیبوں کا گہوارہ رہ چکا ہے، اور اب پھر جس کی تہذیب کا ڈنکا دنیا میں بج رہا ہے۔ ایسی ہی داستان مصر، بابل، ایران اور دوسرے ممالک کی بھی ہے اور خود ہمارا ملک ہندستان بھی صدیوں سے افراط وتفریط میں گرفتار ہے۔ ایک طرف عورت داسی بنائی جاتی ہے۔ مرد اس کا سوامی اور پتی دیو، یعنی مالک اور معبود بنتا ہے۔ اس کو بچپن میں باپ کی، جوانی میں شوہر کی، اور بیوگی میں اولاد کی مملوکہ بن کر رہنا پڑتا ہے۔ اسے شوہر کی چتا پر بھینٹ

چڑھایا جاتا ہے۔ اس کو ملکیت اور وراثت کے حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اس پر نکاح کے انتہائی سخت قوانین مسلط کیے جاتے ہیں، جن کے مطابق وہ اپنی رضا اور پسند کے بغیر ایک مرد کے حوالہ کی جاتی ہے اور پھر زندگی کے آخری سانس تک اس کی ملکیت سے کسی حال میں نہیں نکل سکتی۔ اس کو یہودیوں اور یونانیوں کی طرح گناہ اور اخلاقی و روحانی پستی کا مجسمہ سمجھا جاتا ہے، اور اس کی مستقل شخصیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف جب اُس پر مہر کی نگاہ ہوتی ہے تو اسے بہیمی خواہشات کا کھلونا بنالیا جاتا ہے۔ وہ مرد کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے اور ایسی سوار ہوتی ہے کہ خود بھی ڈوبتی ہے اور اپنے ساتھ ساری قوم کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ یہ لنگ اور یونی کی پوجا، یہ عبادت گاہوں میں برہنہ اور جوڑواں مجسّمے، یہ دیوداسیاں (Religious Prostitutes) یہ ہولی کے کھیل، یہ دریاؤں کے نیم عریاں اشنان آخر کس چیز کی یادگاریں ہیں؟ اس بام مارگی تحریک کے باقیات غیر صالحات ہی تو ہیں جو ایران، بابل، یونان اور روم کی طرح ہندستان میں بھی تہذیب وتمدّن کی انتہائی ترقی کے بعد وبا کی طرح پھیلی اور ہندو قوم کو صدیوں کے لیے تنزّل وانحطاط کے گڑھے میں پھینک گئی۔

اس داستان کو غائر نگاہ سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ عورت کے معاملہ میں نقطۂ عدل کو پانا، اور اسے سمجھنا، اور اس پر قائم ہونا انسان کے لیے کس قدر دشوار ثابت ہوا ہے۔ نقطۂ عدل یہی ہوسکتا ہے کہ ایک طرف عورت کو اپنی شخصیت اور اپنی قابلیتوں کے نشو ونما کا پورا موقع ملے، اور اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ صلاحیتوں کے ساتھ انسانی تہذیب و تمدّن کے ارتقا میں اپنا حصّہ ادا کر سکے۔ مگر دوسری طرف اس کو اخلاقی تنزّل وانحطاط کا ذریعہ اور انسانی تباہی کا آلہ نہ بننے دیا جائے۔ بلکہ مرد کے ساتھ اس کے تعاون کی ایسی سبیل مقرر کر دی جائے کہ دونوں کا اشتراکِ عمل ہر حیثیت سے تمدّن کے لیے صحت بخش ہو۔ اس نقطۂ عدل کو دنیا صدہا برس سے تلاش کرتی رہی ہے مگر آج تک نہیں پاسکی۔ کبھی ایک انتہا کی طرف جاتی ہے اور انسانیت کے پورے نصف حصہ کو بے کار بنا کے رکھ دیتی ہے۔ کبھی دوسری انتہا کی طرف جاتی ہے اور انسانیت کے دونوں حصوں کو ملا کر غرقِ مئے ناب کر دیتی ہے۔

نطقۂ عدل ناپید نہیں، موجود ہے۔ مگر ہزاروں سال افراط وتفریط کے درمیان گردش کرتے رہنے کی وجہ سے لوگوں کا سر کچھ اتنا چکرا گیا ہے کہ وہ سامنے آتا ہے اور یہ پہچان نہیں

سکتے کہ یہی تو وہ مطلوب ہے جسے ہماری فطرت ڈھونڈ رہی تھی۔ اس مطلوبِ حقیقی کو دیکھ کر وہ ناک بھَوں چڑھاتے ہیں، اس پر آوازے کستے ہیں اور جس کے پاس وہ نظر آتا ہے الٹا اسی کو شرمندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کی مثال اس بچّے کی سی ہے، جو ایک کوئلے کی کان میں پیدا ہوا ہوا اور وہیں جوانی کی عمر تک پہنچے۔ ظاہر ہے کہ اس کو وہی کوئلے کی ماری ہوئی آب وہوا اور وہی کالی کالی فضا ہی عین فطری چیز معلوم ہوگی۔ اور جب وہ اس کان سے نکال کر باہر لایا جائے گا تو عالمِ فطرت کے پاکیزہ فضا میں ہر شے کو دیکھ کر اوّل اوّل وہ ضرور اوپرا ئیگا مگر انسان آخر انسان ہے اس کی آنکھیں کوئلے کی چھت اور تاروں بھرے آسمان کا فرق محسوس کرنے سے کب تک انکار کر سکتی ہیں؟ اس کے پھیپھڑے گندی ہوا اور صاف ہوا میں آخر کب تک تمیز نہ کریں گے؟

باب۲:

دورِ جدید کا مسلمان

افراط وتفریط کی بھول بھلیاں میں بھٹکنے والی دنیا کو اگر عدل کا راستہ دکھانے والا کوئی ہوسکتا تھا تو وہ صرف مسلمان تھا، جس کے پاس اجتماعی زندگی کی ساری گتھیوں کے صحیح حل موجود ہیں۔ مگر دنیا کی بدنصیبی کا یہ بھی ایک عجیب دردناک پہلو ہے کہ اس اندھیرے میں جس کے پاس چراغ تھا وہی کمبخت رتوند کے مرض میں مبتلا ہوگیا اور دوسروں کو راستہ دکھانا تو درکنار خود اندھوں کی طرح بھٹک رہا ہے اور ایک ایک بھٹکنے والے کے پیچھے دوڑتا پھرتا ہے۔

''پردے'' کا لفظ جن احکام کے مجموعہ پر بہ طور عنوان استعمال کیا جاتا ہے وہ دراصل اسلامی ضابطۂ معاشرت کے نہایت اہم اجزا پر مشتمل ہیں۔ اس پورے ضابطے کے سانچے میں ان احکام کو ان کے صحیح مقام پر رکھ کر دیکھا جائے تو کوئی ایسا شخص جس میں بقدرِ رمق بھی فطری بصیرت باقی ہو، یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہے گا کہ معاشرت میں اس کے سوا اعتدال وتوسط کی کوئی دوسری صورت نہیں ہوسکتی، اور اگر اس ضابطے کو اس کی اصلی روح کے ساتھ عملی زندگی میں برت کر دکھا دیا جائے تو اس پر اعتراض کرنا تو درکنار، مصائب کی ماری ہوئی دنیا سلامتی کے اس سرچشمہ کی طرف خود دوڑتی چلی آئے گی اور اس سے اپنے امراضِ معاشرت کی دوا حاصل کرے گی۔ مگر یہ کام کون کرے؟ جو اسے کرسکتا تھا وہ خود ایک مدت سے بیمار پڑا ہے، آیئے، آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ایک نظر اس کے مرض کا بھی جائزہ لے لیں۔

تاریخی پس منظر

اٹھارویں صدی کا آخری اور انیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا جب مغربی قوموں کی ملک گیری کا سیلاب ایک طوفان کی طرح اسلامی ممالک پر امنڈ آیا اور مسلمان ابھی نیم خفتہ اور

نیم بیدار ہی تھے کہ دیکھتے دیکھتے یہ طوفان مشرق سے لے کر مغرب تک تمام دنیائے اسلام پر چھا گیا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر تک پہنچتے پہنچتے بیشتر مسلمان قومیں یورپ کی غلام ہو چکی تھیں، اور جو غلام نہ ہوئی تھیں وہ بھی مغلوب و مرعوب ضرور ہو گئی تھیں۔ جب اس انقلاب کی تکمیل ہو چکی تو مسلمانوں کی آنکھیں کھلنی شروع ہوئیں۔ وہ قومی غرور جو صدہا برس تک جہانبانی و کشور کشائی کے میدان میں سر بلند رہنے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا، دفعتاً خاک میں مل گیا، اور اس شرابی کی طرح جس کا نشہ کسی طاقتور دشمن کی پیہم ضربات نے اتار دیا ہو انہوں نے اپنی شکست اور فرنگیوں کی فتح کے اسباب پر غور کرنا شروع کیا۔ لیکن ابھی دماغ درست نہیں ہوا تھا، گو نشہ اتر گیا تھا، مگر توازن ابھی تک بگڑا ہوا تھا۔ ایک طرف ذلّت کا شدید احساس تھا جو اس حالت کو بدل دینے پر اصرار کر رہا تھا۔ دوسری طرف صدیوں کی آرام طلبی اور سہولت پسندی تھی جو تبدیلِ حالت کا سب سے آسان اور سب سے زیادہ قریب کا راستہ ڈھونڈھنا چاہتی تھی، تیسری طرف سمجھ بوجھ اور غور و فکر کی زنگ خوردہ قوتیں تھیں جن سے کام لینے کی عادت سالہا سال سے چھوٹی ہوئی تھی۔ ان سب پر مزید وہ مرعوبیت اور دہشت زدگی تھی جو ہر شکست خوردہ غلام قوم میں فطرتاً پیدا ہو جاتی ہے۔ ان مختلف اسباب نے مل جل کر اصلاح پسند مسلمانوں کو بہت سی عقلی اور عملی گمراہیوں میں مبتلا کر دیا۔ ان میں سے اکثر تو اپنی پستی اور یورپ کی ترقی کے حقیقی اسباب سمجھ ہی نہ سکے۔ اور جنہوں نے ان کو سمجھا، ان میں بھی اتنی ہمت، جفاکشی، اور مجاہدانہ اسپرٹ نہ تھی کہ ترقی کے دشوار گزار راستوں کو اختیار کرتے، مرعوبیت اس پر مستزاد تھی۔ جس میں دونوں گروہ برابر کے شریک تھے۔ اس بگڑی ہوئی ذہنیت کے ساتھ ترقی کا سہل ترین راستہ جو ان کو نظر آیا وہ یہ تھا کہ مغربی تہذیب و تمدّن کے مظاہر کا عکس اپنی زندگی میں اتار لیں اور اس آئینہ کی طرح بن جائیں جس کے اندر باغ و بہار کے مناظر تو سب کے سب موجود ہوں مگر درحقیقت نہ باغ ہو، نہ بہار۔

ذہنی غلامی

یہی بحرانی کیفیت کا زمانہ تھا جس میں مغربی لباس، مغربی معاشرت، مغربی آداب و اطوار حتّٰی کہ چال ڈھال اور بول چال تک میں مغربی طریقوں کی نقل اتاری گئی۔ مسلم سوسائٹی کو مغربی سانچوں میں ڈھالنے کی کوششیں کی گئیں۔ الحاد، دہریت اور مادہ پرستی کو فیشن کے طور پر بغیر

سمجھے بوجھے قبول کیا گیا۔ ہر وہ پختہ یا خام تخیّل جو مغرب سے آیا، اس پر ایمان بالغیب لانا اور اپنی مجلسوں میں اس کو معرضِ بحث بنانا روشن خیالی کا لازمہ سمجھا گیا۔ شراب، جوا، لاٹری، ریس، تھیٹر، رقص و سرود اور مغربی تہذیب کے دوسرے ثمرات کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ شائستگی، اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون، حتیٰ کہ مذہبی عقائد اور عبادات کے متعلق بھی جتنے مغربی نظریات یا عملیات تھے ان کو کسی تنقید اور کسی فہم و تدبّر کے بغیر اس طرح تسلیم کر لیا گیا کہ گویا وہ آسمان سے اتری ہوئی وحی ہیں جس پر سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کہنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔

اسلامی تاریخ کے واقعات، اسلامی شریعت کے احکام، اور قرآن و حدیث کے بیانات میں سے جس جس چیز کو اسلام کے پرانے دشمنوں نے نفرت یا اعتراض کی نگاہ سے دیکھا اُس پر مسلمانوں کو بھی شرم آنے لگی اور انہوں نے کوشش کی کہ اس داغ کو کسی طرح دھو ڈالیں۔ انہوں نے جہاد پر اعتراض کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضور بھلا ہم کہاں اور جہاد کہاں؟ انہوں نے غلامی پر اعتراض کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ غلامی تو ہمارے ہاں بالکل ہی ناجائز ہے۔ انہوں نے تعدّدِ ازدواج پر اعتراض کیا۔ انہوں نے فوراً قرآن کی ایک آیت پر خطِ نسخ پھیر ڈالا۔ انہوں نے کہا کہ عورت اور مرد میں کامل مساوات ہونی چاہیے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یہی ہمارا مذہب بھی ہے۔ انہوں نے قوانینِ نکاح و طلاق پر اعتراضات کیے۔ یہ اُن سب میں ترمیم کرنے پر تل گئے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام آرٹ کا دشمن ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام تو ہمیشہ سے ناچ گانے اور مصوّری و بت تراشی کی سرپرستی کرتا رہا ہے۔

مسئلۂ حجاب کی ابتدا

مسلمانوں کی تاریخ کا یہ دور سب سے زیادہ شرمناک ہے۔ یہی دور ہے جس میں پردے کے سوال پر بحث چھڑی۔ اگر سوال محض اس قدر ہوتا کہ اسلام میں عورت کے لیے آزادی کی کیا حد مقرر کی گئی ہے تو جواب کچھ بھی مشکل نہ ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ جو اختلاف اس باب میں پایا جاتا ہے وہ محض اس حد تک ہے کہ چہرہ اور ہاتھ کو کھولنا جائز ہے یا نہیں۔ اور یہ کوئی اہم اختلاف نہیں ہے۔ لیکن دراصل یہاں یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ مسلمانوں میں یہ مسئلہ اس لیے پیدا ہوا کہ یورپ نے ''حرم'' اور پردہ و نقاب کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا، اپنے لٹریچر میں اس کی نہایت گھناؤنی

اور مضحکہ انگیز تصویریں کھینچیں، اسلام کے عیوب کی فہرست میں عورتوں کی ''قید'' کو نمایاں جگہ دی۔ اب کیوں کر ممکن تھا کہ مسلمانوں کو حسب دستور اس چیز پر بھی شرم نہ آنے لگتی۔ انہوں نے جو کچھ جہاد اور غلامی اور تعدّدِ ازدواج اور ایسے ہی دوسرے مسائل میں کیا تھا وہی اس مسئلہ میں بھی کیا۔ قرآن وحدیث اور اجتہاداتِ ائمہ کی ورق گردانی محض اس غرض سے کی گئی کہ وہاں اس بدنما داغ کو دھونے کے لیے کچھ سامان ملتا ہے یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ بعض ائمّہ نے ہاتھ اور مُنہ کھولنے کی اجازت دی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت اپنی ضروریات کے لیے گھر سے باہر بھی نکل سکتی ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ عورت میدانِ جنگ میں سپاہیوں کو پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے لیے بھی جاسکتی ہے۔ مسجدوں میں نماز کے لیے جانے اور علم سیکھنے اور درس دینے کی بھی گنجائش پائی گئی۔ بس اتنا مواد کافی تھا۔ دعویٰ کر دیا گیا کہ اسلام نے عورت کو پوری آزادی عطا کی ہے۔ پردہ محض ایک جاہلانہ رسم ہے جس کو تنگ نظر اور تاریک خیال مسلمانوں نے قرونِ اولیٰ کے بہت بعد اختیار کیا ہے۔ قرآن اور حدیث پردہ کے احکام سے خالی ہیں۔ ان میں تو صرف شرم وحیا کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے، کوئی ایسا ضابطہ نہیں بنایا گیا جو عورت کی نقل وحرکت پر کوئی قید عائد کرتا ہو۔

اصلی محرّکات

انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ اپنی زندگی کے معاملات میں جب وہ کوئی مسلک اختیار کرتا ہے تو عموماً اس کے انتخاب کی ابتدا ایک جذباتی، غیر عقلی رجحان سے ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ اپنے اس رجحان کو معقول ثابت کرنے کے لیے عقل واستدلال سے مدد لیتا ہے۔ پردے کی بحث میں بھی ایسی صورت پیش آئی۔ اس کی ابتدا کسی عقلی یا شرعی ضرورت کے احساس سے نہیں ہوئی، بلکہ دراصل اس رجحان سے ہوئی جو ایک غالب قوم کے خوشنما تمدّن سے متاثر ہونے اور اسلامی تمدن کے خلاف اس قوم کے پروپیگنڈے سے مرعوب ہوجانے کا نتیجہ تھا۔

ہمارے اصلاح طلب حضرات نے جب دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھوں کے ساتھ فرنگی عورتوں کی زینت وآرائش اور ان کی آزادانہ نقل وحرکت، اور فرنگی معاشرت میں اُن کی سرگرمیوں کو دیکھا تو اضطراری طور پر ان کے دلوں میں یہ تمنّا پیدا ہوئی کہ کاش! ہماری عورتیں بھی

اسی روش پر چلیں تا کہ ہمارا تمدّن بھی فرنگی تمدّن کا ہمسر ہو جائے۔ پھر وہ آزادیِ نسواں، اور تعلیمِ اناث، اور مساواتِ مرد و زن کے ان جدید نظریات سے بھی متاثر ہوئے جو طاقتور استدلالی زبان اور شاندار طباعت کے ساتھ بارش کی طرح مسلسل اُن پر برس رہے تھے۔ اس لٹریچر کی زبردست طاقت نے ان کی قوت تنقید کو ماؤف کر دیا اور ان کے وجدان میں یہ بات اتر گئی کہ ان نظریات پر ایمان بالغیب لانا اور تحریر و تقریر میں ان کی وکالت کرنا اور (بقیدِ جرأت و ہمت) عملی زندگی میں بھی ان کو رائج کر دینا ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو ''روشن خیال'' کہلانا پسند کرتا ہو اور ''دقیانوسیت'' کے بدترین الزام سے بچنا چاہتا ہو۔ نقاب کے ساتھ سادہ لباس میں چھپی ہوئی عورتوں پر جب متحرک خیمے اور کفن پوش جنازہ کی پھبتیاں کسی جاتی تھیں تو یہ بیچارے شرم کے مارے زمین میں گڑ گڑ جاتے تھے۔ آخر کہاں تک ضبط کرتے؟ مجبور ہو کر یا مسحور ہو کر، بہر حال اس شرم کے دھبّے کو دھونے پر آمادہ ہو ہی گئے۔

انیسویں صدی کے آخری زمانے میں آزادیِ نسواں کی جو تحریک مسلمانوں میں پیدا ہوئی اس کے اصلی محرک یہی جذبات و رجحانات تھے۔ بعض لوگوں کے شعورِ خفی میں یہ جذبات چھپے ہوئے تھے اور ان کو خود بھی معلوم نہ تھا کہ دراصل کیا چیز انہیں اس تحریک کی طرف لے جا رہی ہے۔ یہ لوگ خود اپنے نفس کے دھوکہ میں مبتلا تھے۔ اور بعض کو خود اپنے ان جذبات کا بخوبی احساس تھا، مگر انہیں اپنے اصلی جذبات کو ظاہر کرتے شرم آتی تھی۔ یہ خود تو دھوکے میں نہ تھے، لیکن انہوں نے دنیا کو دھوکے میں ڈالنے کی کوشش کی۔ بہر حال دونوں گروہوں نے کام ایک ہی کیا اور وہ یہ تھا کہ اپنی تحریک کے اصل محرکات کو چھپا کر اس کو ایک جذباتی تحریک کے بجائے ایک عقلی تحریک بنانے کی کوشش کی۔ عورتوں کی صحت، ان کے عقلی و عملی ارتقا، ان کے فطری اور پیدائشی حقوق، ان کے معاشی استقلال، مردوں کے ظلم و استبداد سے اُن کی رہائی، اور قوم کا نصف حصّہ ہونے کی حیثیت سے ان کی ترقی پر پورے تمدّن کی ترقی کا انحصار، اور ایسے ہی دوسرے حیلے جو براہِ راست یورپ سے درآمد ہوئے تھے، اس تحریک کی تائید میں پیش کیے گئے، تا کہ عام مسلمان دھوکے میں مبتلا ہو جائیں۔ اور ان پر یہ حقیقت نہ کھل سکے کہ اس تحریک کا اصل مقصد مسلمان عورت کو اس روش پر چلانا ہے جس پر یورپ کی عورت چل رہی ہے اور نظامِ معاشرت میں ان طریقوں کی پیروی کرنا ہے جو اس وقت فرنگی قوموں میں رائج ہیں۔

سب سے بڑا فریب

لیکن سب سے زیادہ شدید اور قبیح فریب جو اس سلسلہ میں دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن اور حدیث سے استدلال کر کے اس تحریک کو اسلام کے موافق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، حالاں کہ اسلام اور مغربی تہذیب کے مقاصد اور تنظیمِ معاشرت کے اصولوں میں زمین و آسمان کا بُعد ہے۔ اسلام کا مقصد جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے، انسان کی شہوانی قوت (Sex Energy) کو اخلاقی ڈسپلن میں لا کر اس طرح منضبط کرنا ہے کہ وہ آوارگیِ عمل اور ہیجانِ جذبات میں ضائع ہونے کے بجائے ایک پاکیزہ اور صالح تمدّن کی تعمیر میں صرف ہو۔ برعکس اس کے مغربی تمدّن کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے معاملات اور ذمہ داریوں میں عورت اور مرد کو یکساں شریک کر کے مادّی ترقی کی رفتار تیز کر دی جائے۔ اور اس کے ساتھ شہوانی جذبات کو ایسے فنون اور مشاغل میں استعمال کیا جائے جو کشمکشِ حیات کی تلخیوں کو لطف اور لذّت میں تبدیل کر دیں۔ مقاصد کے اس اختلاف کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تنظیمِ معاشرت کے طریقوں میں بھی اسلام اور مغربی تمدّن کے درمیان اصولی اختلاف ہے۔ اسلام اپنے مقصد کے لحاظ سے معاشرت کا ایسا نظام وضع کرتا ہے جس میں عورت اور مرد کے دوائرِ عمل بڑی حد تک الگ کر دیے گئے ہیں، دونوں صنفوں کے آزادانہ اختلاط کو روکا گیا ہے اور ان تمام اسباب کا قلع قمع کیا گیا ہے جو اس نظم وضبط میں برہمی پیدا کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مغربی تمدّن کے پیشِ نظر جو مقصد ہے اس کا طبعی اقتضا یہ ہے کہ دونوں صنفوں کو زندگی کے ایک ہی میدان میں کھینچ لایا جائے، اور ان کے درمیان سے وہ تمام حجابات اٹھا دیے جائیں جو ان کے آزادانہ اختلاط اور معاملت میں مانع ہوں، اور ان کو ایک دوسرے کے حُسن اور صنفی کمالات سے لطف اندوز ہونے کے غیر محدود مواقع بہم پہنچائے جائیں۔

اب ہر صاحب عقل انسان یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ جو لوگ ایک طرف مغربی تمدّن کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی نظمِ معاشرت کے قوانین کو اپنے لیے حجّت بناتے ہیں وہ کس قدر سخت فریب میں خود مبتلا ہیں یا دوسروں کو مبتلا کر رہے ہیں۔ اسلامی نظمِ معاشرت میں تو عورتوں کے لیے آزادی کی آخری حد یہ ہے کہ حسب ضرورت ہاتھ اور منہ کھول سکے۔ اور

اپنی حاجات کے لیے گھر سے نکل سکے۔ مگر یہ لوگ آخری حد کو اپنے سفر کا نقطۂ آغاز بناتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر اسلام رک جاتا ہے وہاں سے یہ چلنا شروع کرتے ہیں اور یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ حیا اور شرم بالائے طاق رکھ دی جاتی ہے۔ ہاتھ اور مُنہ ہی نہیں بلکہ خوبصورت مانگ نکلے ہوئے سر، اور شانوں تک کھلی ہوئی باہیں اور نیم عریاں سینے بھی نگاہوں کے سامنے پیش کر دیے جاتے ہیں۔ اور جسم کے باقی ماندہ محاسن کو بھی ایسے باریک کپڑوں میں ملفوف کیا جاتا ہے کہ وہ ہر چیز ان میں سے نظر آ سکے جو مردوں کی شہوانی پیاس کو تسکین دے سکتی ہو۔ پھر ان لباسوں اور آرائشوں کے ساتھ محرموں کے سامنے نہیں بلکہ دوستوں کی محفلوں میں بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں کو لایا جاتا ہے اور ان کو غیروں کے ساتھ ہنسنے، بولنے اور کھیلنے میں وہ آزادی بخشی جاتی ہے جو مسلمان عورت اپنے سگے بھائی کے ساتھ بھی نہیں برت سکتی۔ گھر سے نکلنے کی جو اجازت محض ضرورت کی قید اور کامل ستر پوشی و حیاداری کی شرط کے ساتھ دی گئی تھی۔ اس کو جاذبِ نظر ساڑیوں اور نیم عریاں بلاؤزوں اور بے باک نگاہوں کے ساتھ سڑکوں پر پھرنے، پارکوں میں ٹہلنے، ہوٹلوں کے چکّر لگانے اور سینماؤں کی سیر کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے، عورتوں کو خانہ داری کے ماسوا دوسرے امور میں حصّہ لینے کی جو مقیّد اور مشروط آزادی اسلام میں دی گئی تھی اس کو حجت بنایا جاتا ہے۔ اس غرض کے لیے مسلمان عورتیں بھی فرنگی عورتوں کی طرح گھر کی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کو طلاق دے کر سیاسی و معاشی اور عمرانی سرگرمیوں میں ماری ماری پھریں اور عمل کے ہر میدان میں مردوں کے ساتھ دوڑ دھوپ کریں۔

ہندستان میں تو معاملہ یہیں تک ہے۔ مصر، ٹرکی اور ایران میں سیاسی آزادی رکھنے والے ذہنی غلام اس سے بھی دس قدم آگے نکل گئے ہیں۔ وہاں ''مسلمان'' عورتیں ٹھیک وہی لباس پہننے لگی ہیں جو یورپین عورت پہنتی ہے تاکہ اصل اور نقل میں کوئی فرق ہی نہ رہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر کمال یہ ہے کہ ترکی خواتین کے فوٹو بارہا اس ہیئت میں دیکھے گئے ہیں کہ غسل کا لباس پہنے ساحلِ سمندر پر نہا رہی ہیں ـــــ وہی لباس جس میں تین چوتھائی جسم برہنہ رہتا ہے اور ایک چوتھائی حصّہ اس طرح پوشیدہ ہوتا ہے کہ جسم کے سارے نشیب و فراز سطحِ لباس پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔

کیا کسی قرآن اور کسی حدیث سے اس شرمناک طرزِ زندگی کے لیے بھی کوئی جواز کا

پہلو نکالا جاسکتا ہے۔ جب تم کو اس راہ پر جانا ہے تو صاف اعلان کر کے جاؤ کہ ہم اسلام سے اور اس کے قانون سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کیسی ذلیل منافقت اور بد دیانتی ہے کہ جس نظامِ معاشرت اور طرزِ زندگی کے اصول، مقاصد اور عملی اجزاء میں سے ایک ایک چیز کو قرآن حرام کہتا ہے اسے علی الاعلان اختیار کرتے ہو، مگر اس راستہ پر پہلا قدم قرآن ہی کا نام لے کر رکھتے ہو تا کہ دنیا اس فریب میں مبتلا رہے کہ باقی قدم بھی قرآن ہی کے مطابق ہوں گے۔

ہمارا پیشِ نظر کام

یہ دورِ جدید کے ''مسلمان'' کا حال ہے۔ اب ہمارے سامنے بحث کے دو پہلو ہیں اور اس کتاب میں انہی دونوں پہلوؤں کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے گا۔

اولاً ہم کو تمام انسانوں کے سامنے، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ اسلام کے نظامِ معاشرت کی تشریح کرنی ہے اور یہ بتانا ہے کہ اس نظام میں پردے کے احکام کس لیے دیے گئے ہیں۔

ثانیاً ہمیں ان دورِ جدید کے ''مسلمانوں'' کے سامنے قرآن وحدیث کے احکام اور مغربی تمدّن و معاشرت کے نظریات و نتائج دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل رکھ دینے ہیں تا کہ یہ منافقانہ روش، جو انہوں نے اختیار کر رکھی ہے ختم ہو، اور یہ شریف انسانوں کی طرح دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرلیں۔ یا تو اسلامی احکام کی پیروی کریں اگر مسلمان رہنا چاہتے ہیں۔ یا اسلام سے قطع تعلق کریں اگر اُن شرمناک نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، جن کی طرف مغربی نظامِ معاشرت لامحالہ ان کو لے جانے والا ہے۔

باب۳:

نظریات

پردے کی مخالفت جن وجوہ سے کی جاتی ہے وہ محض سلبی نوعیت ہی کے نہیں ہیں بلکہ دراصل ایک ثبوتی و ایجابی بنیاد پر قائم ہیں۔ ان کی بنا صرف یہی نہیں ہے کہ لوگ عورتوں کے گھر میں رہنے اور نقاب کے ساتھ باہر نکلنے کو ناروا قید سمجھتے ہیں اور بس اسے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ ان کے پیشِ نظر عورت کے لیے زندگی کا ایک دوسرا نقشہ ہے۔ تعلقاتِ مرد و زن کے بارے میں وہ اپنا ایک مستقل نظریہ رکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ عورتیں یہ نہ کریں، بلکہ کچھ اور کریں۔ اور پردے پر ان کا اعتراض اس وجہ سے ہے کہ عورت اپنی اس خانہ نشینی اور روپوشی کے ساتھ نہ تو زندگی کا وہ نقشہ جما سکتی ہے نہ وہ ''کچھ اور'' کر سکتی ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ ''کچھ اور'' کیا ہے، اس کی تہ میں کون سے نظریات اور کون سے اصول ہیں۔ وہ بجائے خود کہاں تک درست اور معقول ہے اور عملاً اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر ان کے نظریات اور اصول کو جوں کا توں تسلیم کر لیا جائے تب تو پردہ، اور وہ نظامِ معاشرت جس کا جزو یہ پردہ ہے واقعی سراسر غلط قرار پائے گا۔ مگر ہم بغیر کسی تنقید اور بغیر کسی عقلی اور تجربی امتحان کے آخر کیوں ان کے نظریات تسلیم کر لیں؟ کیا محض جدید ہونا، یا محض یہ واقعہ کہ ایک چیز دنیا میں زور و شور سے چل رہی ہے۔ اس بات کے لیے بالکل کافی ہے کہ آدمی کسی جانچ پڑتال کے بغیر اس کے آگے سپر ڈال ہی دے؟

اٹھارہویں صدی کا تصوّرِ آزادی

جیسا کہ میں اس سے پہلے اشارہ کر چکا ہوں، اٹھارہویں صدی میں جن فلاسفہ اور

علمائے طبیعین اور اہلِ ادب نے اصلاح کی آواز بلند کی تھی ان کو دراصل ایک ایسے نظامِ تمدّن سے سابقہ درپیش تھا، جس میں طرح طرح کی جکڑ بندیاں تھیں، جو کسی پہلو سے لوچ اور لچک نام کو نہ رکھتا تھا۔ جو غیر معقول رواجوں، جامد قاعدوں اور عقل و فطرت کے خلاف صریح تناقضات سے لبریز تھا۔ ایک طرف نئی عقلی و عملی بیداری طبقۂ متوسط (بورژوا طبقے) میں ابھرنے اور ذاتی جدوجہد سے آگے بڑھنے کا پرجوش جذبہ پیدا کر رہی تھی، اور دوسری طرف امراء او پیشوایانِ مذہب کا طبقہ ان کے اوپر بیٹھا ہوا روایاتی قیود کی گرہیں مضبوط کرنے میں لگا ہوا تھا۔ چرچ سے لے کر فوج اور عدالت کے محکموں تک، شاہی محلوں سے لے کر کھیتوں اور مالی لین دین کی کوٹھیوں تک، زندگی کا ہر شعبہ اور اجتماعی تنظیمات کا ہر ادارہ اس طرح کام کر رہا تھا کہ محض پہلے سے قائم شدہ حقوق کے زور پر چند مخصوص طبقے اُن نئے ابھرنے والے لوگوں کی محنتوں اور قابلیتوں کے ثمرات چھین لے جاتے تھے، جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ہر وہ کوشش جو اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے کی جاتی تھی، برسرِ اقتدار طبقوں کی خود غرضی و جہالت کے مقابلہ میں ناکام ہو جاتی تھی۔ ان وجوہ سے اصلاح و تغیر کا مطالبہ کرنے والوں میں روز بروز اندھا انقلابی جوش پیدا ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ بالآخر اس پورے اجتماعی نظام اور اس کے ہر شعبے اور ہر جز کے خلاف بغاوت کا جذبہ پھیل گیا اور شخصی آزادی کا ایک ایسا انتہا پسندانہ نظریہ مقبولِ عام ہوا جس کا مقصد سوسائٹی کے مقابلہ میں فرد کو حریّتِ تامّہ اور اباحتِ مطلقہ عطا کر دینا تھا۔ کہا جانے لگا کہ فرد کو پوری خود مختاری کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق ہر وہ کام کرنے کا حق ہونا چاہیے جو اسے پسند آئے اور ہر اس کام سے باز رہنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے جو اسے پسند نہ آئے۔ سوسائٹی کو اس کی انفرادی آزادی چھین لینے کا کوئی حق نہیں۔ حکومت کا فرض صرف یہ ہے کہ افراد کی اس آزادیِ عمل کو محفوظ رکھے، اور اجتماعی ادارات صرف اس لیے ہونے چاہئیں کہ فرد کو اس کے مقاصد حاصل کرنے میں مدد دیں۔

آزادی کا یہ مبالغہ آمیز تصوّر، جو دراصل ایک ظالمانہ اجتماعی نظام کے خلاف غصّے کا نتیجہ تھا، اپنے اندر ایک بڑے اور عظیم تر فساد کے جراثیم رکھتا تھا۔ جن لوگوں نے اس کو ابتداءً پیش کیا وہ خود بھی پوری طرح اس کے منطقی نتائج سے آگاہ نہ تھے، شاید ان کی روح کانپ اٹھتی اگر ان کے سامنے وہ نتائج متمثل ہو کر آ جاتے جن پر ایسی بے قید اباحت اور ایسی خود سرانہ انفرادیت لازماً

منتہی ہونے والی تھی۔ اُنہوں نے زیادہ تر ان ناروا سختیوں اور غیر معقول بندشوں کو توڑنے کے لیے اسے بطور ایک آلہ کے استعمال کرنا چاہا تھا جو ان کے زمانہ کی سوسائٹی میں پائی جاتی تھیں، لیکن بالآخر اس تصوّر نے مغربی ذہن میں جڑ پکڑ لی اور نشوونما پانا شروع کر دیا۔

انیسویں صدی کے تغیّرات

فرانس کا انقلاب اسی تصوّرِ آزادی کے زیر اثر رونما[1] ہوا۔ اس انقلاب میں بہت سے پرانے اخلاقی نظریات اور تمدّنی و مذہبی ضابطوں کی دھجیاں اڑا دی گئیں اور جب ان کا اڑنا ترقی کا ذریعہ ثابت ہوا تو انقلاب پسند دماغوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہر وہ نظریہ اور ہر وہ ضابطۂ عمل جو پہلے سے چلا آ رہا ہے، ترقی کی راہ کا روڑا ہے، اسے ہٹائے بغیر قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ چناں چہ مسیحی اخلاقیات کے غلط اصولوں کو توڑنے کے بعد بہت جلدی ان کی مقراضِ تنقید انسانی اخلاقیات کے اساسی تصوّرات کی طرف متوجہ ہوگئی۔ یہ عصمت کیا بلا ہے؟ یہ جوانی پر تقویٰ کی مصیبت آخر کیوں ڈالی گئی ہے؟ نکاح کے بغیر اگر کوئی کسی سے محبت کرے تو کیا بگڑ جاتا ہے؟ اور نکاح کے بعد کیا دل آدمی کے سینے سے نکل جاتا ہے کہ اس سے محبت کرنے کا حق چھین لیا جائے؟ اس قسم کے سوالات نئی انقلابی سوسائٹی میں ہر طرف سے اٹھنے لگے اور خصوصیت کے ساتھ افسانوی گروہ (Romantic School) نے ان کو سب سے زیادہ زور کے ساتھ اٹھایا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ژورژ ساں (George Sand) اس گروہ کی لیڈر تھی۔ اس عورت نے خود ان تمام اخلاقی اصولوں کو توڑا جن پر ہمیشہ سے انسانی شرافت اور خصوصاً عورت کی عزت کا مدار رہا ہے۔ اس نے ایک شوہر کی بیوی ہوتے ہوئے حصنِ نکاح سے باہر آزادانہ تعلقات قائم

(۱) انفرادی آزادی کے اس تخیل سے موجودہ نظام سرمایہ داری، جمہوری نظامِ تمدّن اور اخلاقی آوارگی (Licentiousness) کی تخلیق ہوئی اور تقریباً ڈیڑھ صدی کے اندر اس نے یورپ اور امریکہ میں اتنے ظلم ڈھائے کہ انسانیت اس کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہوگئی، کیوں کہ اس نظام نے فرد کو جماعتی مفاد کے خلاف خود غرضانہ عمل کرنے کا لائسنس دے کر اجتماعی فلاح و بہبود کو ذبح کر ڈالا اور اجتماعی زندگی کو پارہ پارہ کر دیا۔ سوشلزم اور فاشزم دونوں اسی بغاوت کے مظاہر ہیں لیکن اس نئی تعمیر میں ابتدا ہی سے ایک خرابی کی صورت مضمر ہے۔ یہ دراصل ایک انتہا کا علاج دوسری انتہا سے ہے۔ اٹھارہویں صدی کے تصوّرِ حریتِ شخصی کا قصور یہ تھا کہ وہ جماعت کو فرد پر قربان کرتا تھا اور اس بیسویں صدی کے تصوّرِ اجتماع کا قصور یہ ہے کہ یہ فرد کو جماعت پر قربان کرنا چاہتا ہے۔ فلاحِ انسانیت کے لیے ایک متوازن نظریہ آج بھی ویسا ہی ناپید ہے جیسا کہ اٹھارہویں صدی میں تھا۔

کیے۔ آخرکار شوہر سے مفارقت ہوئی، اس کے بعد یہ دوست پر دوست بدلتی چلی گئی اور کسی کے ساتھ برس دو برس سے زیادہ نباہ نہ کیا۔ اس کی سوانح حیات میں کم از کم چھ ایسے آدمیوں کے نام ملتے ہیں جن کے ساتھ اس کی علانیہ اور باقاعدہ آشنائی رہی ہے۔ اس کے ان ہی دوستوں میں سے ایک اس کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔ ''ژورژ ساں پہلے[1] ایک پروانے کو پکڑتی ہے اور اسے پھولوں کے پنجرے میں قید کرتی ہے — یہ اس کی محبت کا دور ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنے پن سے اس کو چبھونا شروع کرتی ہے اور اس کے پھڑ پھڑانے سے لطف اٹھاتی ہے — یہ اس کی سرد مہری کا دور ہوتا ہے اور دیر یا سویر یہ دور بھی ضرور آتا ہے۔ پھر وہ اس کے پَر نوچ کر اور اس کا تجزیہ کر کے اسے اُن پَروانوں کے ذخیرے میں شامل کر لیتی ہے جن سے وہ اپنے ناولوں کے لیے ہیرو کا کام لیا کرتی ہے۔''

فرانسیسی شاعر الفرے مُسے (Alfred Mosse) بھی اُس کے عشاق میں سے تھا۔ اور آخرکار وہ اس کی بے وفائیوں سے اس قدر دل شکستہ ہوا کہ مرتے وقت اس نے وصیت کی کہ ژورژ ساں اس کے جنازے پر نہ آنے پائے۔ یہ تھا اس عورت کا ذاتی کیرکٹر جو کم وبیش تیس سال تک اپنی شاداب تحریروں سے فرانس کی نوخیز نسلوں پر گہرا اثر ڈالتی رہی۔ اپنے ناول لیلیا (Lelia) میں وہ لیلیا کی طرف سے استینو کو لکھتی ہے:

> ''جس قدر زیادہ مجھے دنیا دیکھنے کا موقع ملتا ہے میں محسوس کرتی جاتی ہوں کہ محبت کے متعلق ہمارے نوجوانوں کے خیالات کتنے غلط ہیں۔ یہ خیال غلط ہے کہ محبت ایک ہی سے ہونی چاہیے اور اس کا دل پر پورا قبضہ ہونا چاہیے اور وہ ہمیشہ کے لیے ہونی چاہیے۔ بلاشبہ تمام مختلف خیالات کو گوارا کرنا چاہیے۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ بعض خاص روحوں کو ازدواجی زندگی میں وفادار رہنے کا حق ہے مگر اکثر کچھ دوسری ضروریات اور کچھ دوسری قابلیتیں رکھتی ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ طرفین ایک دوسرے کو آزادی دیں، باہمی رواداری سے کام لیں، اور اُس خود غرضی کو دل سے نکال دیں جس کی وجہ سے رشک ورقابت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ تمام محبتیں صحیح ہیں خواہ تیز وتند ہوں یا پرسکون، شہوانی ہوں یا روحانی، پائدار ہوں یا تغیّر پذیر، لوگوں کو خودکشی کی طرف لے جائیں یا لطف ومسرّت کی طرف۔''

اپنے ایک دوسرے ناول ژاک (Joacues) میں وہ اس شوہر کا کیرکٹر پیش کرتی ہے جو

اس کے نزدیک شوہریت کا بہترین نمونہ ہوسکتا تھا۔ اس کے ہیروژاک کی بیوی اپنے آپ کو ایک غیر مرد کی آغوش میں ڈال دیتی ہے مگر فراخ دل شوہر اس سے نفرت نہیں کرتا اور نفرت نہ کرنے کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ جو پھول میرے بجائے کسی اور کو خوشبو دینا چاہتا ہے مجھے کیا حق ہے کہ اسے پاؤں تلے روند ڈالوں۔ آگے چل کر اسی ناول میں وہ ژاک کی زبان سے یہ خیالات ظاہر کراتی ہے:

''میں نے اپنی رائے نہیں بدلی، میں نے سوسائٹی سے صلح نہیں کی۔ میری رائے میں نکاح تمام اجتماعی طریقوں میں وہ انتہائی وحشیانہ طریقہ ہے جس کا تصوّر کیا جاسکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آخرکار یہ طریقہ موقوف ہوجائے گا۔ اگر انسانی نسل نے انصاف اور عقل کی طرف کوئی واقعی ترقی کی۔ پھر اس کی جگہ ایک دوسرا طبقہ لے گا جو نکاح سے کم مقدس نہ ہوگا، مگر اس سے زیادہ انسانی طریقہ ہوگا۔ اس وقت انسانی نسل ایسے مردوں اور عورتوں سے آگے چلے گی جو کبھی ایک دوسرے کی آزادی پر کوئی پابندی عائد نہ کریں گے۔ فی الحال تو مرد اتنے خودغرض اور عورتیں اتنی بزدل ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی موجودہ قانون سے زیادہ شریفانہ قانون کا مطالبہ نہیں کرتا۔ ہاں! جن میں ضمیر اور نیکی کا فقدان ہے ان کو تو بھاری زنجیروں میں جکڑا ہی جانا چاہیے۔''

یہ وہ خیالات ہیں جو ۱۸۳۳ء اور اس کے لگ بھگ زمانہ میں ظاہر کیے گئے تھے۔ ژورژ ساں صرف اسی حد تک جاسکی۔ اس تخیّل کو آخری منطقی نتائج تک پہنچانے کی اسے بھی ہمت نہ ہوئی۔ بااین ہمہ آزاد خیالی اور روشن دماغی، پرانے روایتی اخلاق کی تاریکی پھر بھی کچھ نہ کچھ اس کے دماغ میں موجود تھی۔ اس کے تیس پینتیس سال بعد فرانس میں ڈرامہ نویسوں، ادیبوں اور اخلاقی فلسفیوں کا ایک دوسرا لشکر نمودار ہوا۔ جس کے سرخیل الکساندرے دوما (Alexander Dumos) اور الفرے ناکے (Alfred Naquet) تھے۔ ان لوگوں نے سارا زور اس خیال کی اشاعت پر صرف کیا کہ آزادی اور لطفِ زندگی بجائے خود انسان کا پیدائشی حق ہے اور اس حق پر ضوابطِ اخلاق وتمدّن کی جکڑ بندیاں لگانا فرد پر سوسائٹی کا ظلم ہے۔ اس سے پہلے فرد کے لیے آزادیِ عمل کا مطالبہ محض محبت کے نام پر کیا جاتا تھا۔ بعد والوں کو یہ نری جذباتی بنیاد کمزور محسوس ہوئی۔ لہٰذا انہوں نے انفرادی خودسری، آوارگی اور بےقید آزادی کو عقل، فلسفہ اور حکمت

کی مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی، تا کہ نوجوان مرد اور عورتیں جو کچھ بھی کریں قلب وضمیر کے کامل اطمینان کے ساتھ کریں، اور سوسائٹی صرف یہی نہیں کہ ان کی شورشِ شباب کو دیکھ کر دم نہ مار سکے۔ بلکہ اخلاقاً جائز و مستحسن سمجھے۔

انیسویں صدی کے آخری دور میں پول اداں (Paul Adam) ہنری بتالی (Henry Bataille) پیرلوئی (Pierre Louis) اور بہت سے دوسرے ادیبوں نے اپنا تمام زور نوجوانوں میں جرأتِ رندانہ پیدا کرانے پر صرف کیا تا کہ قدیم اخلاقی تصوّرات کے بچے کھچے اثرات سے جو جھجک اور رکاوٹ طبیعتوں میں باقی ہے وہ نکل جائے۔ چناں چہ پول اَدان اپنی کتاب La Morale De L'Mour میں نوجوانوں کو ان کی اس جہالت وحماقت پر دل کھول کر ملامت کرتا ہے کہ وہ جس لڑکی یا لڑکے سے محبت کے تعلقات قائم کرتے ہیں اس کو جھوٹ موٹ یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس پر مرمٹے ہیں اور اس سے حقیقی عشق رکھتے ہیں اور ہمیشہ اسی کے ہوکر رہیں گے۔ پھر کہتا ہے:

''یہ سب باتیں اس لیئے کی جاتی ہیں کہ جسمانی لذّت کی اس صحیح خواہش کو، جو فطری طور پر ہر آدمی میں ہوتی ہے، اور جس میں کوئی بات فی الواقع گناہ یا برائی کی نہیں ہے۔ پرانے خیالات کی بنا پر معیوب سمجھا جاتا ہے، اور اس لیے آدمی خواہ مخواہ جھوٹے الفاظ کے پردے میں اس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ لاطینی قوموں کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ ان میں محبت کرنے والے جوڑے ایک دوسرے پر اس بات کا صاف اظہار کرتے ہوئے جھجکتے ہیں کہ ملاقات سے ان کا مقصد محض ایک جسمانی خواہش کو پورا کرنا اور لطف اٹھانا ہے۔''

اور اس کے بعد نوجوانوں کو مشورہ دیتا ہے:

''شائستہ اور معقول انسان بنو۔ اپنی خواہشات اور لذّات کے خادموں[1] کو اپنا معبود نہ بنالو۔ نادان ہے وہ جو محبت کا مندر تعمیر کر کے اس میں ایک ہی بت کا پجاری بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ لطف کی ہر گھڑی میں ایک نئے مہمان کا انتخاب کرنا چاہیے۔''

(۱) اس کا مطلب سمجھنے میں غلطی نہ کیجیے۔ ان سے مراد وہ عورتیں یا مرد ہیں جن کو ایک مرد یا عورت اپنی خواہشات نفسانی کی تسلّی کے لیے استعمال کرے۔

پیرلوئی نے ان سب سے چار قدم آگے بڑھ کر پورے زور کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا کہ اخلاق کی بندشیں دراصل انسانی ذہن اور دماغی قوتوں کے نشوونما میں حائل ہوتی ہیں، جب تک ان کو بالکل توڑ نہ دیا جائے۔ اور انسان پوری آزادی کے ساتھ جسمانی لذّات سے متمتع نہ ہو۔ کوئی عقلی و علمی اور مادی وروحانی ارتقاء ممکن نہیں ہے۔ اپنی کتاب افرودیت (Aphrodite) میں وہ نہایت شدّ ومد کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ بابل، اسکندریہ، ایتھنز، روم، وینس اور تمدّن وتہذیب کے تمام دوسرے مرکزوں کی بہار اور عروج وشباب کا زمانہ وہ تھا جب وہاں رندی، آوارگی اور نفس پرستی (Licentiousness) پورے زور پر تھی، مگر جب وہاں اخلاقی اور قانونی بندشیں انسانی خواہشات پر عائد ہوئیں تو خواہشات کے ساتھ ساتھ آدمی کی روح بھی انھی بندشوں میں جکڑ گئی۔

یہ پیرلوئی وہ شخص ہے جو اپنے عہد میں فرانس کا نامور ادیب، صاحبِ طرز انشاپرداز، اور ادب کے ایک مستقل اسکول کا رہنما تھا۔ اس کے جلو میں افسانہ نگاروں، ڈرامانویسوں اور اخلاقی مسائل پر لکھنے والوں کا ایک لشکر تھا جو اس کے خیالات کو پھیلانے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنے قلم کی پوری طاقت عریانی اور مردوزن کی بے قیدی کو سراہنے میں صرف کردی۔ اپنی اس کتاب ''افرودیت'' میں وہ یونان کے اس دور کی حمد وثنا کرتا ہے۔

> ''جب کہ برہنہ انسانیت ـــــ مکمل ترین صورت جس کا ہم تصور کرسکتے ہیں اور جس کے متعلق اہلِ مذہب نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ خدا نے اسے خود اپنی صورت پر پیدا کیا ہے ـــــ ایک مقدس بیسوا کی شکل میں با ہزاراں ناز وادا اپنے آپ کو ۲۰ ہزار زائرین کے سامنے پیش کرسکتی تھی۔ جب کہ کمال درجہ کی شہوانی محبت ـــــ وہی متبرک آسمانی محبت جس سے ہم سب پیدا ہوئے ہیں ـــــ نہ گناہ تھی، نہ شرم کی چیز تھی، نہ گندی اور نجس تھی۔''

حد یہ ہے کہ تمام شاعرانہ پردوں کو ہٹا کر اس نے صاف الفاظ میں یہاں تک کہہ دیا کہ ہم کو:

> ''نہایت پرزور اخلاقی تعلیم کے ذریعے سے اس مکروہ خیال کا استیصال کردینا چاہیے کہ عورت کا ماں ہونا کسی حال میں شرمناک، ناجائز، ذلیل اور پایۂ شرف وعزت سے گرا ہوا بھی ہوتا ہے۔''

بیسویں صدی کی ترقّیات

انیسویں صدی میں خیالات کی ترقی یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں نئے شاہباز فضا میں نمودار ہوتے ہیں۔ جو اپنے پیشرووں سے بھی اونچے اڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں پیرو ولف (Pierre Wolf) اور گیستاں لیرو (Gaston Leroux) کا ایک ڈراما Lalys نکلا۔ جس میں دو لڑکیاں اپنے جوان بھائی کے سامنے اپنے باپ سے اس مسئلے پر بحث کرتی نظر آتی ہیں کہ انہیں آزادانہ محبت کرنے کا حق ہے اور یہ کہ ''دل لگی'' کے بغیر زندگی گزارنا ایک جوان لڑکی کے لیے کس قدر المناک ہوتا ہے۔ ایک صاحبزادی کو بوڑھا باپ اس بات پر ملامت کرتا ہے کہ وہ ایک نوجوان سے ناجائز تعلّقات رکھتی ہے۔ اس کے جواب میں صاحبزادی فرماتی ہیں:

> ''میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، تم نے کبھی یہ سمجھا ہی نہیں کہ کسی شخص کو کسی لڑکی سے، خواہ وہ اس کی بہن یا بیٹی ہی کیوں نہ ہو، یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ محبت کیے بغیر بوڑھی ہو جائے۔''

جنگ عظیم نے اس آزادی کی تحریک کو اور زیادہ بڑھایا۔ بلکہ انتہائی مراتب تک پہنچا دیا منعِ حمل کی تحریک کا اثر سب سے زیادہ فرانس پر ہوا تھا۔ مسلسل چالیس سال سے فرانس کی شرح پیدائش گر رہی ہے۔ فرانس کے ستاسی اضلاع میں سے صرف بیس اضلاع ایسے تھے جن میں شرح پیدائش شرح اموات سے زیادہ تھی۔ باقی ۶۷، اضلاع میں اموات کی شرح، پیدائش کی شرح سے بڑھی ہوئی تھی۔ بعض اقطاعِ ملک کا تو یہ حال تھا کہ وہاں ہر سو بچوں کی پیدائش کے مقابلے میں ۱۳۰، ۱۴۰ اور ۱۶۰ تک اموات کی تعداد کا اوسط تھا۔ جنگ چھڑی تو عین اس وقت جب کہ فرانسیسی قوم کی موت اور زندگی کا فیصلہ درپیش تھا۔ فرانس کے مدبّروں کو معلوم ہوا کہ قوم کی گود میں لڑنے کے قابل نوجوان بہت ہی کم ہیں۔ اگر اس وقت ان قلیل التعداد جوانوں کو بھینٹ چڑھا کر قومی زندگی کو محفوظ بھی کر لیا گیا تو دشمن کے دوسرے حملہ میں بچ جانا محال ہوگا۔ اس احساس نے یکایک تمام فرانس میں شرحِ پیدائش بڑھانے کا جنون پیدا کر دیا۔ اور ہر طرف سے مصنّفوں نے، اخبار نویسوں نے، خطیبوں نے، اور حد یہ ہے کہ سنجیدہ علماء اور اہلِ سیاست تک نے

ہم زبان ہوکر پکارنا شروع کیا کہ بچے جنو اور جنواؤ۔ نکاح کے رسمی قیود کی کچھ پرواہ نہ کرو۔ ہر وہ کنواری لڑکی اور بیوہ جو وطن کے لیے اپنے رحم کو رضا کارانہ پیش کرتی ہے، ملامت کی نہیں عزّت کی مستحق ہے۔ اس زمانہ میں آزادی پسند حضرات کو قدرتی شہہ مل گئی اس لیے انہوں نے وقت کو سازگار دیکھ کر وہ سارے نظریات پھیلا دیے جو شیطان کی زنبیل میں بچے کھچے رہ گے تھے۔

اس زمانہ کا ایک ممتاز جریدہ نگار جو لالیوں ری پبلیکن (Lalyon Republican) کا ایڈیٹر تھا، اس سوال پر بحث کرتے ہوئے کہ ''زنا بالجبر'' آخر کیوں جرم ہے؟ یوں اظہار خیال کرتا ہے:

''غریب لوگ جب بھوک سے مجبور ہوکر چوری اور لوٹ مار کرنے پر اتر آتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ان کو روٹی مہیا کرو، لوٹ مار آپ سے آپ بند ہو جائے گی، مگر عجیب بات ہے کہ ہمدردی اور مواسات کا جو جذبہ جسم کی ایک طبعی ضرورت کے مقابلہ میں ابھر آتا ہے وہ دوسری ویسی ہی طبعی اور اتنی ہی اہم ضرورت، یعنی محبت کے لیے کیوں وسیع نہیں ہوتا۔ جس طرح چوری عموماً بھوک کی شدّت کا نتیجہ ہوتی ہے، اسی طرح وہ چیز جس کا نتیجہ زنا بالجبر، اور بسا اوقات قتل ہے، اس ضرورت کے شدید تقاضے سے واقع ہوتی ہے جو بھوک اور پیاس سے کچھ کم طبیعی نہیں ہے۔ ایک تندرست آدمی، جو توانا اور جوان ہو، اپنی شہوت کو نہیں روک سکتا۔ جس طرح وہ اپنی بھوک کو اس وعدے پر ملتوی نہیں کرسکتا کہ آئندہ ہفتہ روٹی مل جائے گی۔ ہمارے شہروں میں جہاں سب کچھ بہ افراط موجود ہے ایک جوان آدمی کی شہوانی فاقہ کشی بھی اتنی ہی افسوسناک ہے جتنی کہ مفلس آدمی کی شکمی فاقہ کشی۔ جس طرح بھوکوں کو روٹی مفت تقسیم کی جاتی ہے اسی طرح دوسری قسم کی بھوک سے جو لوگ مر رہے ہیں ان کے لیے بھی ہمیں کوئی انتظام کرنا چاہیے۔''

بس اتنا اور سمجھ لیجیے کہ یہ کوئی مزاحیہ مضمون نہ تھا۔ پوری سنجیدگی کے ساتھ لکھا گیا اور سنجیدگی ہی کے ساتھ فرانس میں پڑھا بھی گیا۔

اسی دور میں پیرس کی فیکلٹی آف میڈیسن نے ایک فاضل ڈاکٹر کا مقالہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کرنے کے لیے پسند کیا اور اپنے سرکاری جریدہ میں اسے شائع کیا، جس میں ذیل کے چند فقرے بھی پائے جاتے ہیں:

''ہمیں توقع ہے کہ کبھی وہ دن بھی آئے گا جب ہم بغیر جھوٹی تعلّی اور بغیر کسی شرم وحیا

کے یہ کہہ دیا کریں گے کہ مجھے بیس سال کی عمر میں آتشک ہوئی تھی۔ جس طرح اب بے تکلف کہہ دیتے ہیں کہ مجھے خون تھوکنے کی وجہ سے پہاڑ پر بھیج دیا گیا تھا...... یہ امراض تو لطفِ زندگی کی قیمت ہیں۔ جس نے اپنی جوانی...... اس طرح بسر کی کہ ان میں سے کوئی مرض لگنے کی بھی نوبت نہ آئی وہ ایک غیر مکمل وجود ہے۔ اس نے بزدلی، یا سرد مزاجی یا مذہبی غلط فہمی کی بنا پر اس طبعی وظیفہ کی انجام دہی سے غفلت برتی جو اس کے فطری وظائف میں شاید سب سے ادنیٰ وظیفہ تھا۔"

نو مالتھوسی تحریک کا لٹریچر

آگے بڑھنے سے پہلے ایک نظر ان خیالات پر بھی ڈال لیجیے جو منعِ حمل کی تحریک کے سلسلے میں پیش کیے گئے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب انگریز ماہرِ معاشیات مالتھس (Malthus) نے آبادی کی روز افزوں ترقی کو روکنے کے لیے ضبطِ ولادت کی تجویز پیش کی تھی اس وقت اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ اس کی یہی تجویز ایک صدی بعد زنا اور فواحش کی اشاعت میں سب سے بڑھ کر مددگار ثابت ہوگی۔ اس نے نو آبادی کی افزائش کو روکنے کے لیے ضبطِ نفس اور بڑی عمر میں نکاح کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ مگر انیسویں صدی کے آخر میں جب نو مالتھوسی تحریک (Neo-Malthusian Movement) اٹھی تو اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ نفس کی خواہش کو آزادی کے ساتھ پورا کیا جائے اور اس کے فطری نتیجہ، یعنی اولاد کی پیدائش کو سائنٹیفک ذرائع سے روک دیا جائے۔ اس چیز نے بدکاری کے راستہ سے وہ آخری رکاوٹ بھی دور کردی جو آزاد صنفی تعلقات رکھنے میں مانع ہوسکتی تھی۔ کیوں کہ اب ایک عورت بلا اس خوف کے اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالے کرسکتی ہے کہ اس سے اولاد ہوگی اور اس پر ذمے داریوں کا بوجھ آن پڑے گا۔ اس کے نتائج بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ یہاں ہم اُن خیالات کے چند نمونے پیش کرنا چاہتے ہیں جو برتھ کنٹرول کے لٹریچر میں کثرت سے پھیلائے گئے ہیں۔

اس لٹریچر میں نو مالتھوسی مقدمہ عموماً جس طرز استدلال کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"ہر انسان کو فطری طور پر تین سب سے زیادہ قاہر اور پرزور حاجتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایک غذا کی حاجت، دوسرے آرام کی حاجت، اور تیسری شہوت، فطرت نے ان تینوں کو

پوری قوت کے ساتھ انسان میں ودیعت کردیا ہے۔ اور ان کی تسکین میں خاص لذّت رکھی ہے تا کہ انسان ان کی تسکین کا خواہش مند ہو۔ عقل اور منطق کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی انہیں پورا کرنے کی طرف لپکے۔ اور پہلی دو چیزوں کے معاملے میں اس کا طرزِ عمل ہے بھی یہی۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ تیسری چیز کے معاملے میں اس کا طرزِ عمل مختلف ہے، اجتماعی اخلاق نے اس پر پابندی لگادی ہے کہ صنفی خواہش کو حدودِ نکاح سے باہر پورا نہ کیا جائے اور حدودِ نکاح زن وشو کے لیے وفاداری اور عصمت مآبی فرض کردی گئی ہے اور اس پر مزید یہ شرط بھی لگادی ہے کہ اولاد کی پیدائش کو روکا نہ جائے۔ یہ سب باتیں سراسر لغو ہیں عقل اور فطرت کے خلاف ہیں۔ عین اپنے اصول میں غلط ہیں، اور انسانیت کے لیے بدترین نتائج پیدا کرنے والی ہیں۔

ان مقدمات پر جن خیالات کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اب ذرا وہ بھی ملاحظہ ہوں۔

جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا لیڈر ببیل (Babeel) نہایت بے تکلفانہ انداز میں لکھتا ہے:

''عورت اور مرد آخر حیوان ہی تو ہیں۔ کیا حیوانات کے جوڑوں میں نکاح اور وہ بھی دائمی نکاح کا کوئی سوال پیدا ہوسکتا ہے۔''

ڈاکٹر ڈریسڈیل (Drysdale) لکھتا ہے:

''ہماری تمام خواہشات کی طرح محبت بھی ایک تغیر پذیر چیز ہے۔ اس کو ایک طریقے کے ساتھ مخصوص کردینا قوانینِ فطرت میں ترمیم کرنا ہے۔ نوجوان خصوصیت کے ساتھ اس تغیر کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔ اور ان کی یہ رغبت فطرت کے اس عظیم الشان منطقی نظام کے مطابق ہے، جس کا تقاضا یہی ہے کہ ہماری تجربات متنوع ہوں...... آزاد تعلق ایک برتر اخلاق کا مظہر ہے اس لیے کہ وہ قوانینِ فطرت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ وہ براہ راست جذبات، احساس اور بے غرض محبت سے ظہور میں آتا ہے۔ جس میلان و رغبت سے یہ تعلق واقع ہوتا ہے وہ بڑی اخلاقی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ یہ بات بھلا اس تجارتی کاروبار کو کہاں نصیب ہوسکتی ہے، جو نکاح کو درحقیقت پیشہ (Prostitution) بنادیتا ہے۔''

دیکھیے اب نظریہ بدل رہا ہے، بلکہ الٹ رہا ہے، پہلے تو یہ کوشش تھی کہ ''زنا'' کو اخلاقاً

معیوب سمجھنے کا خیال دلوں سے نکل جائے، اور نکاح وسفاح دونوں مساوی الدرجہ ہو جائیں۔ اب آگے قدم بڑھا کر نکاح کو معیوب اور سفاح کو اخلاقی برتری کا مرتبہ دلوایا جا رہا ہے۔

ایک اور موقع پر یہی ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''ایسی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے کہ شادی کے بغیر بھی محبت کو ایک معزز چیز بنا دیا جائے...... یہ خوشی کی بات ہے کہ طلاق کی آسانی اس نکاح کے طریقہ کو آہستہ آہستہ ختم کر رہی ہے؛ کیوں کہ اب نکاح بس دو اشخاص کے درمیان مل کر زندگی بسر کرنے کا ایسا معاہدہ ہے جس کو فریقین جب چاہیں ختم کر سکتے ہیں۔ یہ صنفی ارتباط کا ایک ہی صحیح طریقہ ہے۔''

فرانس کا مشہور نو مالتھوسی لیڈر پول روبین (Paul Robin) لکھتا ہے:

''پچھلے ۲۵ سال میں ہم کو اتنی کامیابی تو ہو چکی ہے کہ حرامی بچّہ کو قریب قریب حلالی بچّہ کا ہم مرتبہ کر دیا گیا ہے۔ اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ صرف پہلی ہی قسم کے بچے پیدا ہوا کریں، تا کہ تقابل کا سوال ہی باقی نہ رہے۔''

انگلستان کا مشہور فلسفی مِل اپنی کتاب ''آزادی'' (On Liberty) میں اس بات پر بڑا زور دیتا ہے کہ ایسے لوگوں کو شادی کرنے سے قانوناً روک دیا جائے جو اس بات کا ثبوت نہ دے سکیں کہ وہ زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ذرائع رکھتے ہیں۔ لیکن جس وقت انگلستان میں قحبہ گری (Prostitution) کی روک تھام کا سوال اٹھا تو اسی فاضل فلسفی نے بڑی سختی سے اس کی مخالفت کی، دلیل یہ تھی کہ یہ شخصی آزادی پر حملہ ہے اور ورکرز کی توہین ہے۔ کیوں کہ یہ تو ان کے ساتھ بچّوں کا سا سلوک کرنا ہوا۔

غور کیجیے، شخصی آزادی کا احترام اس لیے ہے کہ اس سے فائدہ اٹھا کر زنا کی جائے۔ لیکن اگر کوئی احمق اسی شخصی آزادی سے فائدہ اٹھا کر نکاح کرنا چاہے تو وہ ہرگز اس کا مستحق نہیں ہے کہ اس کی آزادی کا تحفظ کیا جائے۔ اس کی آزادی میں قانون کی مداخلت نہ صرف گوارا کی جائے گی بلکہ آزادی پسند فلسفی کا ضمیر اس کو عین مطلوب قرار دیگا! یہاں اخلاقی نظریہ کا انقلاب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ جو عیب تھا وہ صواب ہو گیا، جو صواب تھا وہ عیب ہو گیا۔

باب ۴:

نتائج

لٹریچر پیش قدمی کرتا ہے۔ رائے عامّہ اس کے پیچھے آتی ہے۔ آخر میں اجتماعی اخلاق، سوسائٹی کے ضوابط اور حکومت کے قوانین سب سپر ڈالتے جاتے ہیں۔ جہاں پیہم ڈیڑھ سو سال تک فلسفہ، تاریخ، اخلاقیات، فنونِ حکمت، ناول، ڈراما، تھیٹر، آرٹ، غرض دماغوں کو تیار کرنے والے اور ذہنوں کو ڈھالنے والے تمام آلات اپنی متحدہ طاقت کے ساتھ ایک ہی طرزِ خیال کو انسانی ذہن کے ریشہ ریشہ میں پیوست کرتے رہیں، وہاں اس طرزِ خیال سے سوسائٹی کا متاثر نہ ہونا غیر ممکن ہے۔ پھر جس جگہ حکومت اور ساری اجتماعی تنظیمات کی بنیاد جمہوری اصولوں پر ہو، وہاں یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ رائے عام کی تبدیلی کے ساتھ قوانین میں تغیّر نہ ہو۔

صنعتی انقلاب اور اس کے اثرات

اتفاق یہ کہ عین وقت پر دوسرے تمدّنی اسباب بھی سازگار ہو گئے۔ اسی زمانے میں صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) رونما ہوا۔ اس سے معاشی زندگی میں جو تغیّرات واقع ہوئے اور تمدّنی زندگی پر ان کے جو اثرات مترتب ہوئے وہ سب کے سب حالات کا رخ اسی سمت میں پھیر دینے کے لیے تیار تھے جدھر یہ انقلابی لٹریچر انہیں پھیرنا چاہتا تھا۔ شخصی آزادی کے جس تصوّر پر نظامِ سرمایہ داری کی تعمیر ہوئی تھی۔ اس کو مشین کی ایجادات اور کثیر پیداواری (Mass Production) کے امکانات نے غیر معمولی قوت بہم پہنچادی۔ سرمایہ دار طبقوں نے بڑے بڑے صنعتی اور تجارتی ادارے قائم کیے۔ صنعت و تجارت کے نئے مرکز رفتہ رفتہ عظیم الشان شہر بن گئے۔ دیہات و مفصلات سے لاکھوں کروڑوں انسان کھنچ کھنچ کر ان شہروں میں جمع ہوتے

چلے گئے۔ زندگی حد سے زیادہ گراں ہوگئی۔ مکان، لباس، غذا اور تمام ضروریاتِ زندگی پر آگ برسنے لگی۔ کچھ ترقیِ تمدّن کے سبب سے اور کچھ سرمایہ داروں کی کوششوں سے بے شمار نئے اسبابِ عیش بھی زندگی کی ضروریات میں داخل ہوگئے۔

مگر سرمایہ دارانہ نظام نے دولت کی تقسیم اس طرز پر نہیں کی کہ جن آسائشوں اور لذّتوں اور آرائشوں کو اس نے زندگی کی ضروریات میں داخل کیا تھا انہیں حاصل کرنے کے وسائل بھی اسی پیمانہ پر سب لوگوں کو بہم پہنچاتا۔ اس نے تو عوام کو اتنے وسائلِ معیشت بھی بہم نہ پہنچائے کہ جن بڑے بڑے شہروں میں وہ ان کو گھسیٹ لایا تھا وہاں کم از کم زندگی کی حقیقی ضروریات ـــــ مکان، غذا اور لباس وغیرہ ـــــ بھی ان کو بآسانی حاصل ہوسکتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شوہر پر بیوی، اور باپ پر اولاد تک بارِ گراں بن گئی۔ ہر شخص کے لیے خود اپنے آپ ہی کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ کجا کہ وہ دوسرے متعلقین کا بوجھ اٹھائے۔ معاشی حالات نے مجبور کردیا کہ ہر فرد کمانے والا فرد بن جائے۔ کنواری اور شادی شدہ اور بیوہ سب ہی قسم کی عورتوں کو رفتہ رفتہ کسبِ رزق کے لیے نکل آنا پڑا۔ پھر جب دونوں صنفوں میں ربط و اختلاط کے مواقع زیادہ بڑھے اور اس کے فطری نتائج ظاہر ہونے لگے تو اسی شخصی آزادی کے تصور اور اسی نئے فلسفۂ اخلاق نے آگے بڑھ کر باپوں اور بیٹیوں، بہنوں اور بھائیوں، شوہروں اور بیویوں، سب کو اطمینان دلایا کہ کچھ گھبرانے کی بات نہیں، جو کچھ ہورہا ہے، خوب ہورہا ہے، یہ گراوٹ نہیں، اٹھان (Emancipation) ہے، یہ بداخلاقی نہیں، عین لطفِ زندگی ہے۔ یہ گڑھا جس میں سرمایہ دار تمہیں پھینک رہا ہے دوزخ نہیں، جنت ہے جنت!

سرمایہ دارانہ خودغرضی

اور معاملہ یہیں تک نہیں رہا۔ حریتِ شخصی کے اس تصوّر پر جس نظام سرمایہ داری کی بنا اٹھائی گئی تھی اس نے فرد کو ہر ممکن طریقہ سے دولت کمانے کا غیر مشروط اور غیر محدود اجازت نامہ دے دیا، اور نئے فلسفۂ اخلاق نے ہر اس طریقہ کو حلال وطیّب ٹھیرایا جس سے دولت کمائی جاسکتی ہو، خواہ ایک شخص کی دولت مندی کتنے ہی اشخاص کی تباہی کا نتیجہ ہو۔ اس طرح تمدّن کا سارا نظام

ایسے طریقہ پر بنا کہ جماعت کے مقابلے میں ہر پہلو سے فرد کی حمایت تھی اور فرد کی خود غرضیوں کے مقابلے میں جماعت کے لیے تحفّظ کی کوئی صورت نہ تھی۔ خود غرض افراد کے لیے سوسائٹی پر تاخت کرنے کے سارے راستے کھل گئے۔ انہوں نے تمام انسانی کمزوریوں کو چُن چُن کر تاکا اور انہیں اپنی اغراض کے لیے استعمال (Exploit) کرنے کے نت نئے طریقے اختیار کرنے شروع کیے۔ ایک شخص اٹھتا ہے اور وہ اپنی جیب بھرنے کے لیے لوگوں کو شراب نوشی کی لعنت میں مبتلا کرتا چلا جاتا ہے، کوئی نہیں جو سوسائٹی کو اس طاعون کے چوہے سے بچائے۔ دوسرا اٹھتا ہے اور وہ سود خواری کا جال دنیا میں پھیلا دیتا ہے۔ کوئی نہیں جو اس جونک سے لوگوں کے خون حیات کی حفاظت کرے۔ بلکہ سارے قوانین اسی جونک کے مفاد کی حفاظت کر رہے ہیں تاکہ کوئی اس سے ایک قطرۂ خون بھی نہ بچا سکے ـــــ تیسرا اٹھتا ہے اور وہ قمار بازی کے عجیب طریقے رائج کرتا ہے، حتّٰی کہ تجارت کے بھی کسی شعبہ کو قمار بازی کے عنصر سے خالی نہیں چھوڑتا۔ کوئی نہیں جو اس تپِ محرقہ سے انسان کی حیاتِ معاشی کا تحفّظ کرے۔ انفرادی خودسری اور بغی وعُدوان کے اس ناپاک دَور میں غیر ممکن تھا کہ خود غرض افراد کی نظر انسان کی اس بڑی اور شدید ترین کمزوری ـــــ شہوانیت ـــــ پر نہ پڑتی جس کو بھڑکا کر بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ چناں چہ اس سے بھی کام لیا گیا اور اتنا کام لیا گیا، جتنا لینا ممکن تھا۔ تھیٹروں میں، رقص گاہوں میں، اور فلم سازی کے مرکزوں میں سارے کاروبار کا مدار ہی اس پر قرار پایا کہ خوبصورت عورتوں کی خدمات حاصل کی جائیں، اُن کو زیادہ سے زیادہ برہنہ اور زیادہ سے زیادہ ہیجان انگیز صورت میں منظرِ عام پر پیش کیا جائے، اور اس طرح لوگوں کی شہوانی پیاس کو زیادہ سے زیادہ بھڑکا کر ان کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالا جائے۔ کچھ دوسرے لوگوں نے عورتوں کو کرایہ پر چلانے کا انتظام کیا اور قحبہ گری کے پیشہ کو ترقی دے کر ایک نہایت منظّم بین الاقوامی تجارت کی حد تک پہنچا دیا۔ کچھ اور لوگوں نے زینت اور آرائش کے عجیب عجیب سامان نکالے اور ان کو خوب پھیلایا تاکہ عورتوں کے پیدائشی جذبۂ حسن آرائی کو بڑھا کر دیوانگی تک پہنچا دیں اور اس طرح دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹیں۔ کچھ اور لوگوں نے لباس کے نئے شہوت انگیز اور عریاں فیشن نکالے، اور خوبصورت عورتوں کو اس لیے مقرر کیا کہ وہ انہیں پہن کر سوسائٹی میں پھریں تاکہ نوجوان مرد کثرت سے ان کی طرف

راغب ہوں، اور نوجوان لڑکیوں میں ان لباسوں کے پہننے کا شوق پیدا ہو، اور اس طرح موجدِ لباس کی تجارت فروغ پائے۔ کچھ اور لوگوں نے برہنہ تصویروں اور فحش مضامین کی اشاعت کو روپیہ کھینچنے کا ذریعہ بنایا اور اس طرح عوام کو اخلاقی جذام میں مبتلا کر کے خود اپنی جیبیں بھرنی شروع کر دیں۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مشکل ہی سے تجارت کا کوئی شعبہ ایسا باقی رہ گیا جس میں شہوانیت کا عنصر شامل نہ ہو۔ کسی تجارتی کاروبار کے اشتہار کو دیکھ لیجیے۔ عورت کی برہنہ یا نیم برہنہ تصویر اس کی جزوِ لاینفک ہوگی۔ گویا عورت کے بغیر کوئی اشتہار، اشتہار ہی نہیں ہو سکتا۔

ہوٹل، ریسٹوران، شوروم، کوئی جگہ آپ کو ایسی نہ ملے گی، جہاں عورت اس غرض سے نہ رکھی گئی ہو کہ مرد اس کی طرف کھنچ کر آئیں۔ غریب سوسائٹی جس کا کوئی محافظ نہیں صرف ایک ہی ذریعہ سے اپنے مفاد کی حفاظت کر سکتی تھی کہ خود اپنے اخلاقی تصورات سے ان حملوں کی مدافعت کرتی اور اس شہوانیت کو اپنے اوپر سوار نہ ہونے دیتی۔ مگر نظامِ سرمایہ داری ایسی کچی بنیادوں پر نہیں اٹھا تھا کہ یوں اس کے حملے کو روکا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ایک مکمل فلسفہ اور ایک زبردست شیطانی لشکر ـــــ لٹریچر بھی تو تھا جو ساتھ ساتھ اخلاقی نظریات کی شکست وریخت بھی کرتا جا رہا تھا۔ قاتل کا کمال یہی ہے کہ جسے قتل کرنے جائے اسے بطوع ورغبت قتل ہونے کے لیے تیار کر دے۔

جمہوری نظامِ سیاست

مصیبت اتنے پر بھی ختم نہ ہوئی۔ مزید برآں اسی تصوّرِ آزادی نے مغرب میں جمہوری نظامِ حکمرانی کو جنم دیا جو اس اخلاقی انقلاب کی تکمیل کا ایک طاقتور ذریعہ بن گیا۔

جمہوریتِ جدیدہ کا اصل الاصول یہ ہے کہ لوگ خود اپنے حاکم اور خود اپنے قانون ساز ہیں، جیسے قوانین چاہیں اپنے لیے بنائیں اور جن قوانین کو پسند نہ کریں ان میں جیسی چاہیں ترمیم و تنسیخ کر دیں۔ ان کے اوپر کوئی ایسا بالاتر اقتدار نہیں جو انسانی کمزوریوں سے پاک ہو اور جس کی ہدایت و رہنمائی کے آگے سر جھکا کر انسان بے راہ روی سے بچ سکتا ہو۔ ان کے پاس کوئی ایسا اساسی قانون نہیں، جو اٹل ہو اور انسان کی دسترس سے باہر ہو اور جس کے اصولوں کو نا قابلِ ترمیم و تنسیخ مانا جائے۔ ان کے لیے کوئی ایسا معیار نہیں ہے جو صحیح اور غلط کی تمیز کے لیے کسوٹی ہو اور انسانی

اَھوَاء اور خواہشات کے ساتھ بدلنے والا نہ ہو، بلکہ مستقل اور ثابت ہو۔ اس طرح جمہوریت کے جدید نظریہ نے انسان کو بالکل خودمختار اور غیر ذمے دار فرض کر کے آپ ہی اپنا شارع بنا دیا اور ہر قسم کی قانون سازی کا مدار صرف رائے عام پر رکھا۔

اب یہ ظاہر ہے کہ جہاں اجتماعی زندگی کے سارے قوانین رائے عام کے تابع ہوں، اور جہاں حکومت اسی جمہوریتِ جدیدہ کے الٰہ کی عبد ہو، وہاں قانون اور سیاست کی طاقتیں کسی طرح سوسائٹی کو اخلاقی فساد سے نہیں بچا سکتیں۔ بلکہ بچانا کیا معنی، آخر کار وہ خود اس کو تباہ کرنے میں معین و مددگار بن کر رہیں گی۔ رائے عام کے ہر تغیرّ کے ساتھ قانون بھی بدلتا چلا جائے گا۔ جوں جوں عام لوگوں کے نظریات بدلیں گے، قانون کے اصول وضوابط بھی ان کے مطابق ڈھلتے جائیں گے۔ حق اور خیر اور صلاح کا کوئی معیار اس کے سوا نہ ہوگا کہ ووٹ کس طرف زیادہ ہیں۔ ایک تجویز وہ بجائے خود کتنی ناپاک کیوں نہ ہو، اگر عوام میں اتنی مقبولیت حاصل کر چکی ہے کہ وہ ۱۰۰ میں سے ۵۱ ووٹ حاصل کر سکتی ہے تو اس کو تجویز کے مرتبے سے ترقی کر کے شریعت بن جانے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اس کی بدترین عبرت انگیز مثال وہ ہے جو نازی دور سے پہلے جرمنی میں ظاہر ہوئی۔ جرمنی میں ایک صاحب ڈاکٹر ماگنوس ہرشفیلڈ (Magnus Hirschfield) ہیں جو دنیا کی مجلسِ اصلاحِ صنفی (World League of Sexual Reform) کے صدر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے عملِ قومِ لوط کے حق میں چھ سال تک پروپیگنڈا کیا۔ آخر کار جمہوریت کا الٰہ اس حرام کو حلال کر دینے پر راضی ہو گیا۔ اور جرمن پارلیمنٹ نے کثرت رائے سے طے کر دیا کہ اب یہ فعل جرم نہیں ہے۔ بشرطیکہ طرفین کی رضامندی سے اس کا ارتکاب کیا جائے اور معمول کے نابالغ ہونے کی صورت میں اس کا ولی ایجاب وقبول کی رسم ادا کرے۔

قانون اس جمہوری الٰہ کی عبادت میں نسبتاً ذرا سُست کار واقع ہوا ہے۔ اس کے اوامر کا اتباع کرتا تو ہے مگر کسل اور کاہلی کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ نقص جو عبودیت کی تکمیل میں باقی رہ گیا ہے، اس کی کسر حکومت کے انتظامی کل پرزے پوری کر دیتے ہیں۔ جو لوگ ان جمہوری حکومتوں کے کاروبار چلاتے ہیں، وہ قانون سے پہلے اس لٹریچر اور ان اخلاقی فلسفوں کا اور ان عام رجحانات کا اثر قبول کر لیتے ہیں جو ان کے گردوپیش پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی عنایت سے ہر وہ بداخلاقی سرکاری طور پر تسلیم کر لی جاتی ہے جس کا رواج عام ہو گیا ہو۔ جو چیزیں قانوناً

ابھی تک ممنوع ہیں ان کے معاملے میں عملاً پولس اور عدالتیں قانون کے نفاذ سے احتراز کرتی ہیں اور اس طرح وہ گویا حلال کے درجے میں ہوجاتی ہیں۔

مثال کے طور پر اسقاط ہی کو لے لیجیے جو مغربی قوانین میں اب بھی حرام ہے۔ مگر کوئی ملک ایسا نہیں جہاں علی الاعلان اور بکثرت اس کا ارتکاب نہ ہو رہا ہو۔ انگلستان میں کم سے کم اندازہ کے مطابق ہر سال ۹۰ ہزار حمل اسقاط کیے جاتے ہیں۔ شادی شدہ عورتوں میں سے کم از کم ۲۵ فیصدی ایسی ہیں جو یا تو خود اسقاط کر لیتی ہیں یا کسی ماہرِ فن کی مدد حاصل کرتی ہیں۔ غیر شادی شدہ عورتوں میں اس کا تناسب اس سے بھی زیادہ ہے۔ بعض مقامات پر عملاً باقاعدہ اسقاط کلب قائم ہیں، جن کو خواتینِ کرام ہفتہ وار فیس ادا کرتی ہیں تاکہ موقع پیش آنے پر ایک ماہرِ اسقاط کی خدمات آسانی سے حاصل ہو جائیں۔ لندن میں ایسے بہت سے نرسنگ ہوم ہیں جہاں زیادہ تر مریضات وہ ہوتی ہیں جنہوں نے اسقاط کرایا ہوتا ہے۔[1] اس کے باوجود انگلستان کی کتابِ آئین میں اسقاط ابھی تک جرم ہے۔

حقائق و شواہد

اب میں ذرا تفصیل سے بتانا چاہتا ہوں کہ یہ تینوں عناصر، یعنی جدید اخلاقی نظریات، سرمایہ دارانہ نظامِ تمدّن، اور جمہوری نظامِ سیاسی مِل جُل کر اجتماعی اخلاق اور مرد و عورت کے صنفی تعلّق کو کس طرح متأثر کر رہے ہیں اور ان سے فی الواقع کس قسم کے نتائج رونما ہوئے ہیں۔ چونکہ اس وقت تک میں نے زیادہ تر سرزمینِ فرانس کا ذکر کیا ہے جہاں سے اس تحریک کا آغاز ہوا تھا، لہٰذا میں سب سے پہلے فرانس ہی کو شہادت میں پیش کروں گا۔[2]

اخلاقی حِس کا تعطّل

پچھلے باب میں جن نظریات کا ذکر کیا جا چکا ہے ان کی اشاعت کا اولین اثر یہ ہوا کہ

---

(۱) یہ تفصیلات پروفیسر جوڈ نے اپنی کتاب "Guide to Modern Wickedness" میں بیان کی ہیں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

(۲) میں نے زیادہ تر ان معلومات کا استفادہ ایک ممتاز فرانسیسی عالمِ عمرانیات پول بیورو (Paul Bureau) کی کتاب "Towards Moral Bankruptcy" سے کیا ہے، ۱۹۲۵ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے۔

صنفی معاملات میں لوگوں کی اخلاقی حِس مفلوج ہونے لگی۔ شرم وحیا اور غیرت وحمیت روز بروز مفقود ہوتی چلی گئی۔ نکاح وسفاح کی تمیز دلوں سے نکل گئی، اور زنا ایک ایسی معصوم چیز بن گئی جسے اب کوئی عیب یا قباحت کی بات سمجھا ہی نہیں جاتا کہ اس کو چھپانے کا اہتمام کیا جائے۔

انیسویں صدی کے وسط بلکہ اخیر تک عام فرانسیسیوں کے اخلاقی نظریہ میں صرف اتنا تغیر ہوا تھا کہ مردوں کے لیے زنا کو بالکل ایک معمولی، فطری چیز سمجھا جاتا تھا۔ والدین اپنے نوجوان لڑکوں کی آوارگی کو (بشرطیکہ وہ امراضِ خبیثہ یا کسی عدالتی کارروائی کا موجب نہ بن جائے) بخوشی گوارا کرتے تھے۔ بلکہ اگر وہ مادّی حیثیت سے مفید ہو، تو اس پر خوش بھی ہوتے تھے۔ ان کے خیال میں کسی مرد کا کسی عورت سے نکاح کے بغیر تعلّق رکھنا کوئی معیوب فعل نہ تھا۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ والدین نے اپنے نوجوان لڑکوں پر خود زور دیا ہے کہ کسی بااثر یا مالدار عورت سے تعلّقات قائم کر کے اپنا مستقبل درخشاں بنائیں۔ لیکن اس وقت تک عورت کے معاملہ میں نظریہ اس سے بہت مختلف تھا۔ عورت کی عصمت بہر حال ایک قیمتی چیز سمجھی جاتی تھی۔ وہی والدین جو اپنے لڑکے کی آوارگی کو جوانی کی ترنگ سمجھ کر گوارا کر لیتے تھے۔ اپنی لڑکی کے دامن پر کوئی داغ دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ بدکار مرد جس طرح بے عیب سمجھا جاتا تھا، بدکار عورت اس طرح بے عیب نہ سمجھی جاتی تھی۔ پیشہ ور فاحشہ کا ذکر جس ذلّت کے ساتھ کیا جاتا تھا اس کے پاس جانے والے مرد کے حصّے میں وہ ذلّت نہ آتی تھی۔ اسی طرح ازدواجی رشتے میں بھی عورت اور مرد کی اخلاقی ذمے داری مساوی نہ تھی۔ شوہر کی بدکاری گوارا کر لی جاتی تھی مگر بیوی کی بدکاری ایک سخت ترین معیوب چیز تھی۔

بیسویں صدی کے آغاز تک پہنچتے پہنچتے یہ صورت حال بدل گئی۔ تحریکِ آزادیِ نسواں نے عورت اور مرد کی اخلاقی مساوات کا جو صور پھونکا تھا اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگ عام طور پر عورت کی بدکاری کو بھی اسی طرح غیر معیوب سمجھنے لگے جس طرح مرد کی بدکاری کو سمجھتے تھے اور نکاح کے بغیر کسی مرد سے تعلق رکھنا عورت کے لیے کوئی ایسا فعل نہ رہا جس سے اس کی شرافت وعزّت پر بٹہ لگتا ہو۔ پول بیورو لکھتا ہے:

”نہ صرف بڑے شہروں میں بلکہ فرانس کے قصبات ودیہات تک میں اب نوجوان مرد

اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ جب ہم عفیف نہیں ہیں تو ہمیں اپنی منگیتر سے بھی عفت کا مطالبہ کرنے کا، اور یہ چاہنے کا کہ وہ ہمیں کنواری ملے، کوئی حق نہیں ہے۔ برگنڈی، بون اور دوسرے علاقوں میں اب یہ عام بات ہے کہ ایک لڑکی شادی سے پہلے بہت سی ''دوستیاں'' کرچکتی ہے اور شادی کے وقت اسے اپنی منگیتر سے اپنی گزشتہ زندگی کے حالات چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ لڑکی کے قریب ترین رشتہ داروں میں بھی اس کی بدچلنی پر کسی قسم کی ناپسندیدگی نہیں پائی جاتی۔ وہ اس کی ''دوستیوں'' کا ذکر آپس میں اس طرح بے تکلف کرتے ہیں گویا کسی کھیل یا روزگار کا ذکر ہے۔ اور نکاح کے موقع پر دولہا صاحب جو اپنی دلہن کی سابق زندگی ہی سے نہیں بلکہ اس کے ان ''دوستوں'' تک سے واقف ہوتے ہیں جو اب تک اس کے جسم سے لطف اٹھاتے رہے ہیں، اس امر کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ کسی کو اس بات کا شبہ تک نہ ہونے پائے کہ انہیں اپنی دلہن کے ان مشاغل پر کسی درجہ میں بھی کوئی اعتراض ہے۔'' (ص:۹۴)

آگے چل کر لکھتا ہے:

''فرانس میں متوسط درجے کے تعلیم یافتہ طبقوں میں یہ صورتِ حال بکثرت دیکھی جاتی ہے، اور اب اس میں قطعاً کوئی غیر معمولی پن نہیں رہا ہے کہ ایک اچھے خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی، جو کسی دفتر یا تجارتی فرم میں ایک اچھی جگہ پر کام کرتی ہے اور شائستہ سوسائٹی میں اٹھتی بیٹھتی ہے، کسی نوجوان سے مانوس ہوگئی اور اس کے ساتھ رہنے لگی۔ اب یہ بالکل ضروری نہیں کہ وہ آپس میں شادی کرلیں۔ دونوں شادی کے بغیر ہی ایک ساتھ رہنا مرجح سمجھتے ہیں۔ محض اس لیے کہ دونوں کے دل بھر جانے کے بعد الگ ہوجانے اور کہیں اور دل لگانے کی آزادی حاصل رہے۔ سوسائٹی میں ان کے تعلق کی یہ نوعیت سب کو معلوم ہوتی ہے۔ شائستہ طبقوں میں دونوں مل کر جاتے آتے ہیں۔ نہ وہ خود اپنے تعلّق کو چھپاتے ہیں، نہ کوئی دوسرا ان کی ایسی زندگی میں کسی قسم کی بُرائی محسوس کرتا ہے۔ ابتدا میں یہ طرزِ عمل کارخانوں میں کام کرنے والے لوگوں نے شروع کیا تھا۔ اوّل اوّل اس کو سخت معیوب سمجھا گیا مگر اب یہ اونچے طبقوں میں عام ہوگیا ہے، اور اجتماعی زندگی میں اس نے وہی جگہ حاصل کرلی ہے جو کبھی نکاح کی تھی۔'' (ص:۹۴-۹۶)

اس نوعیت کی داشتہ کو اب باقاعدہ تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ موسیو برتلیمی (M.Berthelemy) پیرس یونیورسٹی کا معلّمِ قانون لکھتا ہے کہ رفتہ رفتہ ''داشتہ'' کو وہی قانونی حیثیت حاصل ہوتی جارہی ہے جو پہلے ''بیوی'' کی تھی۔ پارلیمنٹ میں اس کا تذکرہ آنے لگا ہے۔ حکومت اس کے مفاد کی حفاظت کرنے لگی ہے۔ ایک سپاہی کی داشتہ کو وہی نفقہ دیا جاتا ہے جو اس کی بیوی کے لیے مقرر ہے۔ سپاہی اگر مر جائے تو اس کی داشتہ کو وہی پنشن ملتی ہے جو منکوحہ بیوی کو ملتی ہے۔

فرانسیسی اخلاقیات میں زنا کے غیر معیوب ہونے کی کیفیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ۱۹۱۸ میں ایک مدرسہ کی معلّمہ مس ہونے کے باوجود حاملہ پائی گئی۔ محکمۂ تعلیم میں کچھ پرانے خیال کے لوگ بھی موجود تھے۔ انہوں نے ذرا شور مچایا۔ اس پر معززین کا ایک وفد وزارتِ تعلیم میں حاضر ہوا اور اس کے حسب ذیل دلائل اتنے وزنی پائے گئے کہ معلّمہ کا معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔

۱۔ کسی کی پرائیوٹ زندگی سے لوگوں کو کیا مطلب؟

۲۔ اور پھر اس نے آخر کس جرم کا ارتکاب کیا ہے؟

۳۔ اور کیا نکاح کے بغیر ماں بننا زیادہ جمہوری طریقہ نہیں ہے؟

فرانسیسی فوج میں سپاہیوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے اس میں منجملہ دوسرے ضروری مسائل کے یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ امراضِ خبیثہ سے محفوظ رہنے اور حمل روکنے کی کیا تدابیر ہیں۔ گویا یہ بات تو مسلّم ہی ہے کہ ہر سپاہی زنا ضرور کرے گا۔ ۳ رمئی ۱۹۱۹ کو فرانس کی ۱۲۷ویں ڈویژن کے کمانڈر نے سپاہیوں کے نام ایک اعلان شائع کیا تھا، جس کے الفاظ یہ ہیں:

''معلوم ہوا ہے کہ فوجی قحبہ خانوں پر بندوقچیوں کے ہجوم کی وجہ سے عام سوار اور پیادہ فوج کے سپاہیوں کو شکایت ہے۔ وہ گلہ کرتے ہیں کہ بندوقچیوں نے ان جگہوں پر اپنا اجارہ قائم کر لیا ہے اور دوسروں کو موقع ہی نہیں دیتے۔ ہائی کمانڈ کوشش کر رہا ہے کہ عورتوں کی تعداد میں کافی اضافہ کیا جائے۔ مگر جب تک یہ انتظام نہیں ہوتا، بندوقچیوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ زیادہ دیر تک اندر نہ رہا کریں اور اپنی خواہشات کی تسکین میں ذرا عجلت سے کام لیا کریں۔''

غور تو کیجیے، یہ اعلان دنیا کی ایک مہذب ترین حکومت کے فوجی محکمہ کی طرف سے باضابطہ سرکاری طور پر شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زنا کے اخلاقاً معیوب ہونے کا وہم تک ان لوگوں کے دل و دماغ میں باقی نہیں رہا ہے۔ سوسائٹی، قانون، حکومت سب کے سب اس تصور سے خالی ہو چکے ہیں۔(۱)

جنگِ عظیم سے کچھ مدّت پہلے فرانس میں ایک ایجنسی اس اصول پر قائم کی گئی کہ ہر عورت خواہ وہ اپنے حالات، ماحول، مالی کیفیت اور عادی اخلاقی چال چلن کے اعتبار سے کیسی ہی ہو، بہرحال ''ایک نئے تجربے'' کے لیے آمادہ کی جاسکتی ہے۔ جو صاحب کسی خاتون سے تعلّق پیدا کرنا چاہتے ہوں وہ بس اتنی زحمت اٹھائیں کہ ان لیڈی صاحبہ کا اَتا پتا بتادیں اور ۲۵ فرانک ابتدائی فیس کے طور پر داخل کردیں۔ اس کے بعد صاحبہ موصوفہ کو معاملہ پر راضی کرلینا ایجنسی کا کام ہے۔ اس ایجنسی کے رجسٹر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ فرنچ سوسائٹی کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس کے کثیر التعداد لوگوں نے اس سے ''بزی نس'' نہ کیا ہو، اور یہ کاروبار حکومت سے بھی مخفی نہ تھا۔ (پول بیورو، ص:۱۶)

اس اخلاقی زوال کی انتہا یہ ہے کہ:

> ''فرانس کے بعض اضلاع میں اور بڑے شہروں میں گھنی آبادی رکھنے والے حصّوں میں قریب ترین نسبی رشتہ داروں کے درمیان حتّٰی کہ باپ اور بیٹی اور بھائی اور بہن کے درمیان صنفی تعلقات کا پایا جانا بھی اب کوئی شاذ و نادر واقعہ نہیں رہا ہے۔''

فواحش کی کثرت

جنگِ عظیم سے پہلے موسیو بیولو (M. Bulot) فرانس کے اٹارنی جنرل نے اپنی رپورٹ میں ان عورتوں کی تعداد ۵ لاکھ بتائی تھی جو اپنے جسم کو کرایہ پر چلاتی ہیں۔ مگر وہاں کی زنا بازاری کو

---

(۱) جس فوج کی یہ اخلاقی حالت ہو، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب وہ کسی دوسرے ملک میں فاتحانہ داخل ہوتی ہوگی تو اس کے ہاتھوں مغلوب قوم کی عزّت و آبرو پر کیا کچھ نہ گزر جاتی ہوگی۔ سپاہیانہ اخلاق کا ایک معیار یہ ہے، اور دوسرا معیار جو قرآن پیش کرتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط ایک وہ سپاہی ہے جو زمین میں سانڈ بنا پھرتا ہے اور ایک وہ سپاہی ہے جو اس لیے ہتھیلی پر سر لے کر نکلتا ہے کہ انسانی اخلاق کی حفاظت کرے اور دنیا کو پاکیزگی کا سبق سکھائے۔ کیا انسان اتنا اندھا ہوگیا ہے کہ دونوں کا فرق نہیں دیکھ سکتا؟

ہندستان کی پیشہ ور فاحشات پر قیاس نہ کر لیجیے۔ شائستہ اور متمدّن ملک ہے، اس کے سب کام شائستگی، تنظیم اور فی الجملہ بلند پیمانے پر ہوتے ہیں۔ وہاں اس پیشہ میں فنِ اشتہارات سے پورا کام لیا جاتا ہے۔ اخبار، مصوّر، پوسٹ کارڈ، ٹیلیفون اور شخصی دعوت نامے، غرض تمام مہذب طریقے گاہکوں کی توجہ منعطف کرانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، اور پبلک کا ضمیر اس پر کوئی ملامت نہیں کرتا۔ بلکہ اس تجارت میں جن عورتوں کو زیادہ کامیابی نصیب ہوجاتی ہے وہ بسا اوقات ملکی سیاست اور مالیات اور اعیان و امراء کے طبقوں میں کافی بااقتدار ہوجاتی ہیں، وہی ترقی جو کبھی یونانی تمدّن میں اس طبقہ کی عورتوں کو نصیب ہوئی تھی۔

فرنچ سینٹ کے ایک رکن موسیو فردنان دریفو (M. Ferdinand Dreyfus) نے اب سے چند سال پہلے بیان کیا تھا کہ قحبہ گری کا پیشہ اب محض ایک انفرادی کام نہیں رہا ہے بلکہ اس کی ایجنسی سے جو عظیم مالی فوائد حاصل ہوتے ہیں، ان کی وجہ سے اب یہ ایک تجارت (Business) اور ایک منظّم حرفہ (Organised Industry) بن گیا ہے۔ اس کے ''خام پیداوار'' مہیّا کرنے والے ایجنٹ الگ ہیں۔ اس کی باقاعدہ منڈیاں موجود ہیں۔ جوان لڑکیاں اور کم سن بچّیاں وہ تجارتی مال ہیں جس کی درآمد و برآمد ہوتی ہے اور دس سال سے کم عمر کی لڑکیوں کی مانگ زیادہ ہے۔

پول بیورو لکھتا ہے:

> ''یہ ایک زبردست نظام ہے جو پورے منظّم طریقے سے تنخواہ یاب عہدہ داروں اور کارکنوں کے ساتھ چل رہا ہے۔ ناشرین اور اہلِ قلم (Publicist) خطباء و مقررین، طلباء اور قابلات (Midwive) اور تجارتی سیاح اس میں باقاعدہ ملازم ہیں اور اشتہار اور مظاہرہ کے جدید طریقے اس کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔''

فحش کاری کے ان اڈّوں کے ماسوا ہوٹلوں اور چائے خانوں اور رقص خانوں میں علی الاعلان قحبہ گری کا کاروبار ہو رہا ہے، اور بعض اوقات بہیمیت انتہائی ظلم اور قساوت کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ ۱۹۱۲ء میں ایک مرتبہ مشرقی فرانس کے ایک میر بلدیہ (Mayor) کو مداخلت کر کے ایک ایسی لڑکی کی جان بخشی کرانی پڑی جن کو دن بھر میں ۴۷ گاہکوں سے پالا پڑ چکا تھا اور ابھی مزید گاہک تیار کھڑے تھے۔

تجارتی قحبہ خانوں کے علاوہ خیراتی ''قحبہ خانوں'' کی ایک نئی قسم پیدا کرنے کا شرف جنگِ عظیم کو حاصل ہوا۔ جنگ کے زمانہ میں جن محبِّ وطن خواتین نے سرزمینِ فرانس کی حفاظت کرنے والے بہادروں کی ''خدمت'' فرمائی تھی اور جن کو اس خدمت کے صلے میں بے باپ کے بچّے مل گئے تھے انہیں "War-God-Mothers" کا معزّز لقب عطا ہوا ــــ یہ ایسا اچھوتا تخیّل ہے کہ اردو زبان اس کا ترجمہ کرنے سے عاجز ہے ــــ یہ خواتین منظّم صورت میں قحبہ گری کرنے لگیں اور ان کی ''امداد'' کرنا سیاہ کاروں کے لیے ایک اخلاقی کام بن گیا۔ بڑے بڑے روزانہ اخباروں اور خصوصاً فرانس کے دو مشہور مصوّر جریدوں فنتاسیو (Fantasio) اور لاوی پاریزیاں (Lavie Parisienne) نے ان کی طرف ''مردانِ کار'' کی توجہ منعطف کرانے کی خدمت سب سے بڑھ کر انجام دی۔ ۱۹۱۷ کے آغاز میں مؤخرالذکر اخبار کا صرف ایک نمبر ان عورتوں کے ۱۹۹ اشتہارات پر مشتمل تھا۔

شہوانیت اور بے حیائی کی وبا

فواحش کی یہ کثرت اور مقبولیت شہوانی جذبات کے جس اشتعال کا نتیجہ ہے وہ لٹریچر، تصاویر، سینما، تھیٹر، رقص، اور برہنگی اور بے حیائی کے عام مناظروں سے رونما ہوتا ہے۔

خود غرض سرمایہ داروں کا ایک پورا لشکر ہے جو ہر ممکن تدبیر سے عوام کی شہوانی پیاس کو بھڑکانے میں لگا ہوا ہے اور اس ذریعے سے اپنے کاروبار کو فروغ دے رہا ہے۔ روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات، مصوّر جرائد اور نصف ماہی اور ماہوار رسالے انتہا درجے کے فحش مضامین اور شرمناک تصویریں شائع کرتے ہیں۔ کیوں کہ اشاعت بڑھانے کا یہ سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ ہے۔ اس کام میں اعلیٰ درجہ کی ذہانت، فن کاری اور نفسیات کی مہارت صرف کی جاتی ہے تا کہ شکار کسی طرف سے بچ کر نہ جا سکے۔ ان کے علاوہ صنفی مسائل پر حد درجہ ناپاک لٹریچر پمفلٹوں اور کتابوں کی شکل میں نکلتا رہتا ہے، جن کی کثرتِ اشاعت کا یہ حال ہے کہ ایک ایڈیشن پچاس پچاس ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے اور بسا اوقات ساٹھ ساٹھ ایڈیشنوں تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

بعض اشاعت خانے تو صرف اسی لٹریچر کی اشاعت کے لیے مخصوص ہیں۔ بہت سے اہلِ قلم ایسے ہیں جو اسی ذریعے سے شہرت کے مرتبے پر پہنچتے ہیں۔ اب کسی فحش کتاب کا لکھنا

کسی کے لیے بے عزّتی نہیں ہے بلکہ اگر کتاب مقبول ہو جائے تو ایسے مصنّفین فرنچ اکیڈمی کے ممبر یا کم از کم ''کروے دانیور'' (Croix Dhonneur) کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

حکومت ان تمام بے شرمیوں اور ہیجان انگیزیوں کو ٹھنڈے دل سے دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی کوئی بہت ہی زیادہ شرمناک چیز شائع ہوگئی تو پولس نے بادلِ ناخواستہ چالان کر دیا۔ مگر اوپر فراخ دل عدالتیں بیٹھی ہیں جن کی بارگاہِ عدل سے اس قسم کے مجرموں کو صرف تنبیہہ کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ جو لوگ عدالت کی کرسیوں پر جلوہ فرما ہوتے ہیں ان میں سے اکثر اس لٹریچر سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں اور بعض حکامِ عدالت کا اپنا قلم فحش صنفی لٹریچر کی تصنیف سے آلودہ ہوتا ہے۔ اتفاقاً اگر کوئی مجسٹریٹ دقیانوسی خیال کا نکل آیا اور اس سے ''بے انصافی'' کا اندیشہ ہوا تو بڑے بڑے ادیب اور نامور اہلِ قلم بالاتفاق اس معالہ میں مداخلت کرتے ہیں اور زور و شور سے اخبارات میں لکھا جاتا ہے کہ آرٹ اور لٹریچر کی ترقی کے لیے آزاد فضا درکار ہے۔ قرونِ مظلمہ کی سی ذہنیت کے ساتھ اخلاقی بندشیں لگانے کے معنی تو یہ ہیں کہ فنونِ لطیفہ کا گلا گھونٹ دیا جائے۔

اور یہ فنونِ لطیفہ کی ترقی ہوتی کس کس طرح ہے؟ اس میں ایک بڑا حصہ اُن ننگی تصویروں اور عملی تصویروں کا ہے جن کے البم لاکھوں کی تعداد میں تیار کیے جاتے ہیں، اور نہ صرف بازاروں، ہوٹلوں اور چائے خانوں میں بلکہ مدرسوں اور کالجوں تک میں پھیلائے جاتے ہیں۔ امیل پورسی (Emile Pourcisy) نے جمعیتِ انسدادِ فواحش کے دوسرے اجلاسِ عام میں جو رپورٹ پیش کی اس میں وہ لکھتا ہے:

> ''یہ گندے فوٹوگراف لوگوں کے حواس میں شدید ہیجان و اختلال برپا کرتے ہیں اور اپنے بدقسمت خریداروں کو ایسے ایسے جرائم پر اکساتے ہیں جن کے تصوّر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں پر ان کا تباہ کن اثر حدِ بیان سے زیادہ ہے۔ بہت سے مدرسے اور کالج انہی کی بدولت اخلاقی اور جسمانی حیثیت سے برباد ہو چکے ہیں۔ خصوصاً لڑکیوں کے لیے تو کوئی چیز اس سے زیادہ غارت گر نہیں ہو سکتی۔''

اور انہی فنونِ لطیفہ کی خدمت تھیٹر، سینما، میوزک ہال اور قہوہ خانوں کی تفریحات کے ذریعے سے ہو رہی ہے، ڈرامے، جن کی تمثیل کو فرنچ سوسائٹی کے اونچے سے اونچے طبقے دلچسپی

کے ساتھ دیکھتے ہیں اور جن کے مصنفین اور کامیاب نقالوں پر تحسین وآفرین کے پھول نچھاور کیے جاتے ہیں۔ بلا استثناء سب کے سب شہوانیت سے لبریز ہیں، اور ان کی نمایاں خصوصیت بس یہ ہے کہ اخلاقی حیثیت سے جو کیرکٹر بدترین ہوسکتا ہے اس کو ان میں مَثَلِ اعلیٰ اور اسوۂ حسنہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ پول بیورو کے بقول ''تیس چالیس سال سے ہمارے ڈرامہ نگار زندگی کے جو نقشے پیش کر رہے ہیں ان کو دیکھ کر اگر کوئی شخص ہماری تمدّنی زندگی کا اندازہ لگانا چاہے تو وہ بس یہ سمجھے گا کہ ہماری سوسائٹی میں جتنے شادی شدہ جوڑے ہیں سب خائن اور ازدواجی وفاداری سے عاری ہیں۔ شوہر یا بے وقوف ہوتا ہے یا بیوی کے لیے بلائے جان، اور بیوی کی بہترین صفت اگر کوئی ہے تو وہ یہ ہے کہ ہر وقت شوہر سے دل برداشتہ ہونے اور اِدھر اُدھر دل لگانے کے لیے تیار رہے۔''

اونچی سوسائٹی کے تھیٹروں کا جب یہ حال ہے تو عوام کے تھیٹروں اور تفریح گاہوں کا جو کچھ رنگ ہوگا اُس کا اندازہ بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ بدترین آوارہ منش لوگ جس زبان، جن اداؤں اور جن عریانیوں سے مطمئن ہوسکتے ہیں وہ بغیر کسی شرم وحیا اور لاگ لپیٹ کے وہاں پیش کردی جاتی ہیں۔ اور عوام کو اشتہارات کے ذریعے سے یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ تمھاری شہوانی پیاس جو جو کچھ مانگتی ہے۔ وہ سب یہاں حاضر ہے۔ ''ہمارا اسٹیج تکلّف سے خالی اور حقیقت پر مبنی (Realistic) ہے۔''

امیل پوریسی نے اپنی رپورٹ میں متعدد مثالیں پیش کی ہیں جو مختلف تفریح گاہوں میں گشت لگا کر جمع کی گئی تھیں۔ ناموں کو اس نے حروف تہجّی کے پردے میں چھپا دیا ہے:

> ''ب، میں ایکٹرس کے گیت، تکلّمات (Monologues) اور حرکات انتہا درجہ کے فحش تھے، اور پردہ پر جو پسِ منظر پیش کیا گیا تھا وہ بس صنفی اختلاط کے آخری مدارج تک پہنچتے پہنچتے رہ گیا تھا۔ ایک ہزار سے زیادہ تماشائی موجود تھے، جن میں شرفاء بھی نظر آتے تھے، اور سب عالمِ بے خودی میں صدائے آفرین مرحبا بلند کر رہے تھے۔''

> ''ل، میں چھوٹے چھوٹے گیت اور ان کے درمیان چھوٹے چھوٹے بول اور ان کے ساتھ حرکات وسکنات، بے شرمی کی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ بچے اور کم سِن نوجوان اپنے والدین کے ساتھ بیٹھے ہوئے اس تماشے کو دیکھ رہے تھے اور پرجوش طریقے سے ہر شدید بے شرمی پر تالیاں بجاتے تھے۔''

''ل، میں حاضرین کے ہجوم نے پانچ مرتبہ شور مچا کر ایک ایسی ایکٹرس کو اعادے پر مجبور کیا جو اپنے ایکٹ کو ایک حد درجہ فحش گیت پر ختم کرتی تھی۔''

''ر، میں حاضرین نے ایسی ہی ایک اور ایکٹرس سے بار بار فرمائش کر کے ایک نہایت فحش چیز کا اعادہ کرایا، آخر اس نے بگڑ کر کہا ــــ ''تم کتنے بے شرم لوگ ہو، دیکھتے نہیں ہو کہ ہال میں بچّے بھی موجود ہیں'' ــــ یہ کہہ کر وہ ایکٹ پورا کیے بغیر ہٹ گئی۔ چیز اتنی فحش تھی کہ وہ عادی مجرمہ بھی اس کی تکرار کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔''

''ز، میں تماشا ختم ہونے کے بعد ایکٹرسوں پر لاٹری ڈالی گئی۔ لاٹری کے ٹکٹ خود ایکٹرسیں دس دس سانیتم(۱) میں فروخت کر رہی تھیں۔ جس شخص کے نام جو ایکٹرلیس نکل آئی وہ اس رات کے لیے اس کی تھی۔''

بول بیورو لکھتا ہے کہ بسا اوقات اسٹیج پر بالکل برہنہ عورتیں تک پیش کر دی جاتی ہیں جس کے جسم پر کپڑے کے نام کا ایک تار بھی نہیں ہوتا۔ اوڈلف بریسان (Adolphe Briason) نے ایک مرتبہ فرانس کے مشہور اخبار ''طان'' (Tamps) میں ان چیزوں پر احتجاج کرتے ہوئے لکھا کہ اب بس اتنی کسر رہ گئی ہے کہ اسٹیج پر فعلِ مباشرت کا منظر پیش کر دیا جائے۔ اور سچ یہ ہے کہ ''آرٹ'' کی تکمیل تو اسی وقت ہو گی!

منعِ حمل کی تحریک اور صنفیات (Sexual Science) کے نام نہاد علمی اور طبّی لٹریچر نے بھی بے حیائی پھیلانے، اور لوگوں کے اخلاق بگاڑنے میں بڑا حصّہ لیا ہے۔ پبلک جلسوں میں تقریروں اور میجک لینٹرن کے ذریعے سے، اور مطبوعات میں تصاویر اور تشریحی بیانات کے ذریعے سے حمل اور اس کے متعلقات اور مانعِ حمل آلات کے طریقِ استعمال کی وہ تفصیلات بیان کی جاتی ہیں، جن کے بعد کوئی چیز قابلِ اظہار باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی طرح صنفیات کی کتابوں میں تشریحِ بدن سے لے کر آخر تک معاملاتِ صنفی کے کسی پہلو کو بھی روشنی میں لائے بغیر نہیں چھوڑا جاتا۔ بظاہر ان سب چیزوں پر علم اور سائنس کا غلاف چڑھا دیا گیا ہے تا کہ یہ اعتراض سے بالاتر ہو جائیں۔ بلکہ مزید ترقی کر کے ان چیزوں کی اشاعت کو ''خدمتِ خلق'' کے نام سے بھی موسوم

---

(۱) تقریباً دو آنے۔

کر دیا جاتا ہے اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہم تو لوگوں کو صنفی معاملات میں غلطیاں کرنے سے بچانا چاہتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس لٹریچر اور اس تعلیم کی اشاعت نے عورتوں، مردوں اور کم سِن نوجوانوں میں سخت بے حیائی پیدا کر دی ہے۔ اس کی بدولت آج یہ نوبت آ گئی ہے کہ ایک نوخیز لڑکی جو مدرسے میں تعلیم پاتی ہے اور ابھی سِن بلوغ کو بھی پوری طرح نہیں پہنچی ہے، صنفی معاملات کے متعلق وہ معلومات رکھتی ہے جو کچھ شادی شدہ عورتوں کو بھی حاصل نہ تھیں۔ اور یہی حال نوخیز بلکہ نابالغ لڑکوں کا بھی ہے۔ ان کے جذبات قبل از وقت بیدار ہو جاتے ہیں۔ ان میں صنفی تجربات کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ پوری جوانی کو پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنے آپ کو خواہشات نفسانی کے چنگل میں دے دیتے ہیں۔ نکاح کے لیے تو عمر کی حد مقرر کی گئی ہے، مگر ان تجربات کے لیے حد مقرر نہیں، بارہ تیرہ سال کی عمر ہی سے ان کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

قومی ہلاکت کے آثار

بداخلاقی، نفس پرستی اور لذاتِ جسمانی کی بندگی اس حد کو پہنچ چکی ہو، جہاں عورت، مرد، جوان، بوڑھے، سب کے سب عیش کوشی میں اس قدر منہمک ہو گئے ہوں، اور جہاں انسان کو شہوانیت کے انتہائی اشتعال نے یوں آپے سے باہر کر دیا ہو۔ ایسی جگہ اُن تمام اسباب کا بروئے کار آ جانا بالکل ایک طبعی امر ہے جو کسی قوم کی ہلاکت کے موجب ہوتے ہیں۔ لوگ اسی قسم کی برسرِ انحطاط عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ قوموں کو برسرِ عروج دیکھ کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان کی عیش پرستی ان کی ترقی میں مانع نہیں ہے بلکہ الٹی مددگار ہے، اور یہ کہ ایک قوم کے انتہائی عروج و ترقی کا زمانہ وہ ہوتا ہے جب وہ لذّت پرستی کے انتہائی مرتبہ پر ہوتی ہے۔ لیکن یہ ایک سراسر غلط استنتاج ہے، جہاں تعمیر اور تخریب کی قوتیں ملی جلی کام کر رہی ہوں اور مجموعی حیثیت سے تعمیر کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے، وہاں تخریبی قوتوں کو بھی اسبابِ تعمیر میں شمار کر لینا صرف اس شخص کا کام ہو سکتا ہے جس کی عقل خبط ہو گئی ہو۔

مثال کے طور پر اگر ایک ہوشیار تاجر اپنی ذہانت، محنت اور آزمودہ کاری کے سبب لاکھوں روپیہ کما رہا ہے اور اس کے ساتھ وہ مے نوشی، قمار بازی اور عیاشی میں مبتلا ہو گیا ہے تو آپ کتنی بڑی غلطی کریں گے اگر اس کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو اس خوشحالی اور ترقی کے اسباب میں شمار کر لیں گے۔ دراصل اس کی صفات کا پہلا مجموعہ اس کی تعمیر کا موجب ہے، اور

دوسرا مجموعہ اُس کی تخریب میں لگا ہوا ہے۔ پہلے مجموعہ کی طاقت سے اگر عمارت قائم ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دوسرے مجموعہ کی تخریبی طاقت اپنا اثر نہیں کر رہی ہے۔ ذرا گہری نظر سے دیکھیے تو پتہ چلے گا کہ یہ تخریبی قوتیں اس کے دماغ اور جسم کی طاقتوں کو برابر کھائے جا رہی ہیں۔ اس کی محنت سے کمائی ہوئی دولت پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں، اور اس کو بتدریج تباہ کرنے کے ساتھ ہر وقت اس تاک میں لگی ہوئی ہیں کہ کب ایک فیصلہ کن حملہ کا موقع ملے اور یہ ایک ہی وار میں اس کا خاتمہ کر دیں۔ قمار بازی کا شیطان کسی بُری گھڑی میں اس کی عمر بھر کی کمائی کو ایک سیکنڈ میں غارت کر سکتا ہے اور وہ اس گھڑی کا منتظر بیٹھا ہے۔ مے نوشی کا شیطان وقت آنے پر اُس سے عالمِ مدہوشی میں ایک غلطی کرا سکتا ہے جو یک لخت اُسے دیوالیہ بنا کر چھوڑ دے۔ اور وہ بھی گھات میں لگا ہوا ہے۔ بدکاری کا شیطان بھی اس گھڑی کا انتظار کر رہا ہے جب وہ اُسے قتل یا خودکشی یا کسی اور اچانک تباہی میں مبتلا کر دے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اگر وہ اِن شیاطین کے چنگل میں پھنسا ہوا نہ ہوتا تو اس کی ترقی کا کیا حال ہوتا۔

ایسا ہی معاملہ ایک قوم کا بھی ہے، وہ تعمیری قوتوں کے بل پر ترقی کرتی ہے مگر صحیح رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے ترقی کی طرف چند ہی قدم بڑھانے کے بعد خود اپنی تخریب کے اسباب فراہم کرنے لگتی ہے۔ کچھ مدّت تک تعمیری قوتیں اپنے زور میں اُسے آگے بڑھائے لیے جاتی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ تخریبی قوتیں اس کی زندگی کی طاقت کو اندر ہی اندر گُھن کی طرح کھاتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ آخر اُسے اتنا کھوکھلا کر کے رکھ دیتی ہیں کہ ایک اچانک صدمہ اُس کے قصرِ عظمت کو آن کی آن میں پیوندِ خاک کر سکتا ہے۔ یہاں مختصر طور پر ہم اُن بڑے بڑے نمایاں اسبابِ ہلاکت کو بیان کریں گے جو فرنچ قوم کے اس غلط نظامِ معاشرت نے اس کے لیے پیدا کیے ہیں۔

جسمانی قوتوں کا انحطاط

شہوانیت کے اس تسلّط کا اولین نتیجہ یہ ہوا ہے کہ فرانسیسیوں کی جسمانی قوت رفتہ رفتہ جواب دیتی چلی جا رہی ہے۔ دائمی ہیجانات نے ان کے اعصاب کمزور کر دیے ہیں۔ خواہشات کی بندگی نے ان میں ضبط اور برداشت کی طاقت کم ہی باقی چھوڑی ہے اور امراض خبیثہ کی کثرت نے ان کی صحت پر نہایت مہلک اثر ڈالا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے یہ کیفیت ہے کہ فرانس

کے فوجی حکام کو مجبوراً ہر چند سال کے بعد نئے رنگروٹوں کے لیے جسمانی اہلیت کے معیار کو گھٹا دینا پڑتا ہے۔ کیوں کہ اہلیت کا جو معیار پہلے تھا اب اس معیار کے نوجوان قوم میں کم سے کم تر ہوتے جارہے ہیں۔

یہ ایک معتبر پیمانہ ہے جو تھرما میٹر کی طرح قریب قریب یقینی صحت کے ساتھ بتاتا ہے کہ فرنچ قوم کی جسمانی قوتیں کتنی تیزی کے ساتھ بتدریج گھٹ رہی ہیں۔ امراضِ خبیثہ اس تنزّل کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہیں۔ جنگِ عظیم کے ابتدائی دو سالوں میں جن سپاہیوں کو محض آتشک کی وجہ سے رخصت دے کر ہسپتالوں میں بھیجنا پڑا ان کی تعداد ۷۵۰۰۰ تھی۔ صرف ایک متوسط درجہ کی فوجی چھاؤنی میں بیک وقت ۲۴۲ سپاہی اس مرض میں مبتلا ہوئے۔ ایک طرف اس وقت کی نزاکت دیکھیے کہ فرانسیسی قوم کی موت اور حیات کا فیصلہ درپیش تھا اور اس کے وجود و بقا کے لیے ایک ایک سپاہی کی جانفشانی درکار تھی، ایک ایک فرانک بیش قیمت تھا، اور وقت، قوت، وسائل ہر چیز کی زیادہ سے زیادہ مقدار دفاع میں خرچ ہونے کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف اس قوم کے جوانوں کو دیکھیے کہ کتنے ہزار افراد اس عیّاشی کی بدولت نہ صرف خود کئی کئی مہینوں کے لیے بے کار ہوئے بلکہ انہوں نے اپنی قوم کی دولت اور وسائل کو بھی اس آڑے وقت میں اپنے علاج پر ضائع کرایا۔

ایک فرانسیسی ماہرِ فن ڈاکٹر لیرید (Dr. Laridde) کا بیان ہے کہ فرانس میں ہر سال صرف آتشک سے اور اس کے پیدا کردہ امراض کی وجہ سے ۳۰ ہزار جانیں ضائع ہوتی ہیں اور دق کے بعد یہ مرض سب سے زیادہ ہلاکتوں کا باعث ہوتا ہے۔ یہ صرف ایک مرض خبیث کا حال ہے۔ اور امراضِ خبیثہ کی فہرست صرف اسی ایک مرض پر مشتمل نہیں ہے۔

خاندانی نظام کی بربادی

اس بے قید شہوانیت اور آوارہ منشی کے اس رواجِ عام نے دوسری عظیم الشان مصیبت جو فرانسیسی تمدّن پر نازل کی ہے وہ خاندانی نظام کی تباہی ہے۔ خاندان کا نظام عورت اور مرد کے اس مستقل اور پائدار تعلق سے بنتا ہے جس کا نام نکاح ہے۔ اسی تعلّق کی بدولت افراد کی زندگی میں سکون، استقلال اور ثبات پیدا ہوتا ہے۔ یہی چیز ان کی انفرادیت کو اجتماعیت میں تبدیل کرتی

ہے اور انتشار (انارکی) کے میلانات کو دبا کر انہیں تمدّن کا خادم بناتی ہے۔ اسی نظام کے دائرے میں محبت اور امن اور ایثار کی وہ پاکیزہ فضا پیدا ہوتی ہے جس میں نئی نسلیں صحیح اخلاق، صحیح تربیت اور صحیح قسم کی تعمیرِ سیرت کے ساتھ پروان چڑھ سکتی ہیں۔ لیکن جہاں عورتوں اور مردوں کے ذہن سے نکاح اور اس کے مقصد کا تصوّر بالکل ہی نکل گیا ہو اور جہاں صنفی تعلّق کا کوئی مقصد شہوانی آگ کو بجھا لینے کے سوا لوگوں کے ذہن میں نہ ہو، اور جہاں ذوّاقین و ذوّاقات کے لشکر بھونروں کی طرح پھول پھول کا رس لیتے پھرتے ہوں وہاں یہ نظام نہ قائم ہوسکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا ہے۔ وہاں عورتوں اور مردوں میں یہ صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی کہ ازدواج کی ذمے داریوں اور اس کے حقوق و فرائض، اور اس کے اخلاقی انضباط کا بوجھ سہار سکیں۔ اور اُن کی اس ذہنی و اخلاقی کیفیت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہر نسل کی تربیت پہلی نسل سے بدتر ہوتی ہے۔ افراد میں خود غرضی و خودسری اتنی ترقی کر جاتی ہے کہ تمدّن کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ نفوس میں تلوّن اور سیماب وشی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ قومی سیاست اور اس کے بین الاقوامی رویہّ میں بھی کوئی ٹھیراؤ باقی نہیں رہتا۔ گھر کا سکون بہم نہ پہنچنے کی وجہ سے افراد کی زندگیاں تلخ سے تلخ تر ہوتی جاتی ہیں۔ اور ایک دائمی اضطراب ان کو کسی کل چین نہیں لینے دیتا۔ یہ دنیوی جہنم کا عذاب ہے جسے انسان اپنی احمقانہ لذّت طلبی کے جنون میں خود مول لیتا ہے۔

فرانس میں سالانہ سات آٹھ فی ہزار کا اوسط ان مردوں اور عورتوں کا ہے جو ازدواج کے رشتے میں منسلک ہوتے ہیں۔ یہ اوسط خود اتنا کم ہے کہ اسے دیکھ کر آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آبادی کا کتنا کثیر حصّہ غیر شادی شدہ ہے۔ پھر اتنی قلیل تعداد جو نکاح کرتی ہے اُن میں بھی بہت کم لوگ ایسے ہیں جو باعصمت رہنے اور پاک اخلاقی زندگی بسر کرنے کی نیت سے نکاح کرتے ہیں۔ اس ایک مقصد کے سوا ہر دوسرا ممکن مقصد ان کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ حتّٰی کہ عامّۃ الورود مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نکاح سے پہلے ایک عورت نے جو بچّہ ناجائز طور پر جنا ہے، نکاح کر کے اس کو مولودِ جائز بنا دیا جائے۔ چنانچہ پول بیورو لکھتا ہے کہ:

> ''فرانس کے کام پیشہ لوگوں (Working Classes) میں یہ عام دستور ہے کہ نکاح سے پہلے عورت اپنے ہونے والے شوہر سے اس بات کا وعدہ لے لیتی ہے کہ وہ اس بچّے کو اپنا بچّہ تسلیم کرے گا۔ ۱۹۱۷ میں سین (Siene) کی عدالتِ دیوانی کے سامنے

ایک عورت نے بیان دیا کہ ''میں نے شادی کے وقت ہی اپنے شوہر کو اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ اس شادی سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے قبل از نکاح آزادانہ تعلقات سے جو بچّے پیدا ہوئے ہیں ان کو ''حلالی'' بنا دیا جائے۔ باقی رہی یہ بات کہ میں اس کے ساتھ بیوی بن کر زندگی گزاروں تو یہ نہ اُس وقت میرے ذہن میں تھی نہ اب ہے۔ اسی بنا پر جس روز شادی ہوئی اسی روز ساڑھے پانچ بجے میں اپنے شوہر سے الگ ہوگئی اور آج تک اس سے نہیں ملی۔ کیوں کہ میں فرائضِ زوجیت ادا کرنے کی کوئی نیت نہ رکھتی تھی۔'' (ص:۵۵)

پیرس کے ایک مشہور کالج کے پرنسپل نے بیورو سے بیان کیا کہ:

''عموماً'' نوجوان نکاح میں صرف یہ مقصد پیشِ نظر رکھتے ہیں کہ گھر پر بھی ایک داشتہ کی خدمات حاصل کرلیں۔ دس بارہ سال تک وہ ہر طرف آزادانہ مزے چکھتے پھرتے ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ اس قسم کی بے ضابطہ آوارہ زندگی سے تھک کر وہ ایک عورت سے شادی کرلیتے ہیں، تاکہ گھر کی آسائش بھی کسی حد تک بہم پہنچے اور آزادانہ ذوّاقی کا لطف بھی حاصل کیا جاتا رہے۔'' (ص:۵۶)

''فرانس میں شادی شدہ اشخاص کا زنا کار ہونا قطعاً کوئی معیوب یا قابلِ ملامت فعل نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے علاوہ کوئی مستقل داشتہ رکھتا ہو، تو وہ اسے چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اور سوسائٹی اس فعل کو بالکل ایک معمولی اور متوقع بات سمجھتی ہے۔'' (ص:۷۶،۷۷)

ان حالات میں نکاح کا رشتہ اس قدر بودا ہو کر رہ گیا ہے کہ بات بات میں ٹوٹ جاتا ہے۔ بسا اوقات اس بیچارے کی عمر چند گھنٹوں سے متجاوز نہیں ہوتی۔ چنانچہ فرانس کے ایک ایسے معزز شخص نے جو کئی مرتبہ وزیر رہ چکا تھا، اپنی شادی سے صرف پانچ گھنٹہ بعد اپنی بیوی سے طلاق حاصل کرلی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں طلاق کی موجب بن جاتی ہیں، جنہیں سن کر ہنسی آتی ہے۔ مثلاً فریقین میں سے کسی ایک کا سوتے میں خرّاٹے لینا، یا کتّے کو پسند نہ کرنا، سین کی عدالتِ دیوانی نے ایک مرتبہ صرف ایک تاریخ میں ۲۹۴ نکاح فسخ کیے۔ ۱۸۴۴ میں جب طلاق کا نیا قانون پاس ہوا تھا، چار ہزار طلاق واقع ہوئے تھے۔ ۱۹۰۰ میں یہ تعداد ساڑھے سات ہزار تک پہنچی۔ ۱۹۱۳ میں ۱۶/ ہزار اور ۱۹۳۱ میں ۲۱/ ہزار۔

نسل کشی

بچّوں کی پرورش ایک اعلیٰ درجہ کا اخلاقی کام ہے، جو ضبطِ نفس، خواہشات کی قربانی، تکلیفوں اور محنتوں کی برداشت اور جان و مال کا ایثار چاہتا ہے، خودغرض نفس پرست لوگ جن پر انفرادیت اور بہیمیّت کا پورا تسلّط ہو چکا ہو، اس خدمت کی انجام دہی کے لیے کسی طرح راضی نہیں ہو سکتے۔

ساٹھ ستّر برس سے فرانس میں منعِ حمل کی تحریک کا زبردست پرچار ہو رہا ہے۔ اس تحریک کی بدولت سرزمینِ فرانس کے ایک ایک مرد اور ایک ایک عورت تک ان تدابیر کا علم پہنچا دیا گیا ہے جن سے آدمی اس قابل ہو سکتا ہے کہ صنفی تعلّق اور اس کی لذّات سے متمتع ہونے کے باوجود اس فعل کے قدرتی نتیجہ، یعنی استقرارِ حمل اور تولیدِ نسل سے بچ سکے۔ کوئی شہر، قصبہ یا گاؤں ایسا نہیں ہے جہاں مانعِ حمل دوائیں اور آلات برسرِ عام فروخت نہ ہوتے ہوں اور ہر شخص ان کو حاصل نہ کر سکتا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آزاد شہوت رانی کرنے والے لوگ ہی نہیں بلکہ شادی شدہ جوڑے بھی کثرت سے ان تدابیر کو استعمال کرتے ہیں۔ اور ہر زن و مرد کی یہ خواہش ہے کہ ان کے درمیان بچّہ، یعنی وہ بلا جو تمام لطف ولذّت کو کرکرا کر دیتی ہے، کسی طرح خلل انداز نہ ہونے پائے۔ فرانس کی شرحِ پیدائش جس رفتار سے گھٹ رہی ہے اس کو دیکھ کر ماہرفن نے اندازہ لگایا ہے کہ منعِ حمل کی اس وبائے عام کی بدولت کم از کم ۶ لاکھ انسانوں کی پیدائش ہر سال روک دی جاتی ہے۔

ان تدابیر کے باوجود جو حمل ٹھیر جاتے ہیں ان کو اسقاط کے ذریعے سے ضائع کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح مزید تین چار لاکھ انسان دنیا میں آنے سے روک دیے جاتے ہیں۔ اسقاطِ حمل صرف غیر شادی شدہ عورتیں ہی نہیں کراتیں بلکہ شادی شدہ بھی اس معاملہ میں ان کی ہم پلّہ ہیں۔ اخلاقاً اس فعل کو نا قابلِ اعتراض بلکہ عورت کا حق سمجھا جاتا ہے۔ قانون نے اس کی طرف سے گویا آنکھیں بند کر لی ہیں۔ اگرچہ کتابِ آئین میں یہ فعل ابھی تک جرم ہے، لیکن عملاً یہ حال ہے کہ ۳۰۰ میں سے بہ مشکل ایک کے چالان کی نوبت آتی ہے، اور پھر جن کا چالان ہوتا ہے اُن میں سے بھی ۷۵ فیصدی عدالت میں جا کر چھوٹ جاتے ہیں۔ اسقاط کی طبّی تدابیر اتنی

آسان اور اس قدر معلومِ عوام کردی گئی ہیں کہ اکثر عورتیں خود ہی اسقاط کرلیتی ہیں۔ اور جو نہیں کرسکتیں انہیں طبّی امداد حاصل کرنے میں کوئی دقّت نہیں ہوتی۔ پیٹ کے بچّے کو ہلاک کردینا ان لوگوں کے لیے بالکل ایسا ہوگیا ہے جیسے کسی درد کرنے والے دانت کو نکلوا دینا۔

اس ذہنیت نے فطرتِ مادری کو اتنا مسخ کردیا ہے کہ وہ ماں جس کی محبت کو دنیا ہمیشہ سے محبت کا بلند ترین منتہیٰ سمجھتی رہی ہے، آج اپنی اولاد سے بیزار و متنفّر بلکہ اس کی دشمن ہوگئی ہے۔ منعِ حمل اور اسقاط سے بچ بچا کر بھی جو بچّے دنیا میں آجاتے ہیں، ان کے ساتھ سخت بے رحمی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس دردناک حقیقت کو پول بیورو نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''آئے دن اخبارات میں اُن بچّوں کے مصائب کی اطلاعات شائع ہوتی رہتی ہیں جن پر اُن کے ماں باپ سخت سے سخت ظلم ڈھاتے ہیں۔ اخباروں میں تو صرف غیر معمولی واقعات ہی کا تذکرہ آتا ہے مگر لوگ واقف ہیں کہ عموماً ان بچّوں ــــ ناخواندہ مہمانوں ــــ کے ساتھ کیسا بے رحمانہ برتاؤ کیا جاتا ہے، جن سے اُن کے والدین صرف اس لیے دل برداشتہ ہیں کہ ان کمبختوں نے آکر زندگی کا سارا لطف غارت کردیا۔ جرأت کی کمی اسقاط میں مانع ہوجاتی ہے اور اس طرح اِن معصوموں کو آنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مگر جب یہ آجاتے ہیں تو انہیں اس کی پوری سزا بھگتنی پڑتی ہے۔'' (ص:۷۴)

''یہ بیزاری اور نفرت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت کا چھ ماہ کا بچّہ مرگیا تو وہ اس کی لاش کو سامنے رکھ کر خوشی کے مارے ناچی اور گائی اور اپنے ہمسایوں سے کہتی پھری کہ اب ہم دوسرا بچّہ نہ ہونے دیں گے۔ مجھے اور میرے شوہر کو اس بچّے کی موت سے بڑا اطمینان نصیب ہوا ہے۔ دیکھو تو سہی ایک بچّہ کیا چیز ہوتا ہے۔ ہر وقت روں روں کرتا رہتا ہے، گندگی پھیلاتا ہے، اور آدمی کو کبھی اس سے نجات نصیب نہیں ہوتی۔'' (ص:۷۵)

اس سے بھی زیادہ دردناک بات یہ ہے کہ بچّوں کو قتل کرنے کی وبا تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور فرانسیسی حکومت اور اس کی عدالتیں اسقاطِ حمل کی طرح اس جرمِ عظیم کے معاملے میں بھی کمال درجہ کا تغافل برت رہی ہیں۔ مثلاً فروری ۱۹۱۸ میں لائر (Loire) کی عدالت میں دو لڑکیاں اپنے بچّوں کے قتل کے الزام میں پیش ہوئیں اور دونوں بری کردی گئیں۔ ان میں سے

ایک لڑکی نے اپنے بچّے کو پانی میں ڈبو کر ہلاک کیا تھا۔ اس کے ایک بچّے کو اس کے رشتہ دار پہلے سے پرورش کر رہے تھے اور اس دوسرے بچّے کو بھی وہ پرورش کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ مگر اس نے پھر بھی یہی فیصلہ کیا کہ اس غریب کو جیتا نہ چھوڑے۔ عدالت کی رائے میں اس کا جرم قابلِ معافی تھا۔ دوسری لڑکی نے اپنے بچّے کو گلا گھونٹ کر مارا، اور جب گلا گھونٹنے پر بھی اس میں کچھ جان باقی رہ گئی تو دیوار پر مار کر اس کا سر پھوڑ دیا۔ یہ عورت بھی فرانسیسی ججوں اور جیوری کی نگاہ میں قصاص کی سزاوار نہ ٹھہری، اسی ۱۹۱۸ کے ماہ مارچ میں سین کی عدالت کے سامنے ایک رقّاصہ پیش ہوئی جس نے اپنے بچّہ کی زبان حلق سے کھینچنے کی کوشش کی۔ پھر اس کا سر پھوڑا اور اس کا گلا کاٹ ڈالا۔ یہ عورت بھی جج اور جیوری، کسی کی رائے میں مجرم نہ تھی۔

جو قوم اپنی نسل کی دشمنی میں اس حد کو پہنچ جائے اُسے دنیا کی کوئی تدبیر فنا ہونے سے نہیں بچا سکتی۔ نئی نسلوں کی پیدائش ایک قوم کے وجود کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر کوئی قوم اپنی نسل کی دشمن ہے تو دراصل وہ اپنی آپ دشمن ہے، خودکشی کر رہی ہے۔ کوئی بیرونی دشمن نہ ہو تب بھی وہ آپ ہی اپنی ہستی کو مٹا دینے کے لیے کافی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں، فرانس کی شرحِ پیدائش گزشتہ ساٹھ سال سے پیہم گرتی جا رہی ہے، کسی سال شرحِ اموات شرحِ پیدائش سے بڑھ جاتی ہے۔ کسی سال دونوں برابر رہتی ہیں۔ اور کبھی شرحِ پیدائش شرحِ اموات کی بہ نسبت مشکل سے ایک فی ہزار زائد ہوتی ہے۔ دوسری طرف سرزمینِ فرانس میں غیر قوموں کے مہاجرین کی تعداد روز افزوں ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۱ میں فرانس کی ۴ کروڑ ۱۸ لاکھ آبادی میں ۲۸ لاکھ ۹۰ ہزار غیر قوموں کے لوگ تھے۔ یہ صورتِ حال یوں ہی جاری رہی تو بیسویں صدی کے اختتام تک فرانسیسی قوم عجب نہیں کہ خود اپنے وطن میں اقلیت بن کر رہ جائے۔

یہ انجام ہے اُن نظریات کا جن کی بنا پر عورتوں کی آزادی اور حقوقِ نسواں کی تحریک انیسویں صدی کے آغاز میں اٹھائی گئی تھی۔

باب ۵ :

چند اور مثالیں

ہم نے محض تاریخی بیان کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے فرانس کے نظریات اور فرانس ہی کے نتائج بیان کیے ہیں، لیکن یہ گمان کرنا صحیح نہ ہوگا کہ فرانس اس معاملے میں منفرد ہے۔ فی الحقیقت آج اُن تمام ممالک کی کم و بیش یہی کیفیت ہے، جنہوں نے وہ اخلاقی نظریات اور معاشرت کے وہ غیر متوازن اصول اختیار کیے ہیں، جن کا ذکر پچھلے ابواب میں کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ممالک متحدہ امریکہ کو لیجیے جہاں یہ نظامِ معاشرت اس وقت اپنے پورے شباب پر ہے۔

بچّوں پر شہوانی ماحول کے اثرات

جج بن لِنڈ سے (Ben Lindsey) جس کو ڈنور (Denver) کی عدالتِ جرائمِ اطفال (Juvenile Court) کا صدر ہونے کی حیثیت سے امریکہ کے نوجوانوں کی اخلاقی حالت سے واقف ہونے کا بہت زیادہ موقع ملا ہے۔ اپنی کتاب "Revolt of Modern Youth" میں لکھتا ہے کہ امریکہ میں بچّے قبل از وقت بالغ ہونے لگے ہیں اور بہت کچی عمر میں ان کے اندر صنفی احساسات بیدار ہو جاتے ہیں۔ اس نے نمونے کے طور پر ۳۱۲ لڑکیوں کے حالات کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ۲۵۵ ایسی تھیں جو گیارہ اور تیرہ برس کی درمیانی عمر میں بالغ ہو چکی تھیں۔ اور ان کے اندر ایسی صنفی خواہشات اور ایسے جسمانی مطالبات کے آثار پائے جاتے تھے جو ایک ۱۸ برس اور اس سے بھی زیادہ عمر کی لڑکی میں ہونی چاہییں۔ (ص:۸۲-۸۶)

ڈاکٹر ایڈتھ ہوکر (Dr. Edith Hwoker) اپنی کتاب "Laws of Sex" میں لکھتا ہے کہ:

''نہایت مہذب اور دولت مند طبقوں میں بھی یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ ساتھ

آٹھ برس کی لڑکیاں اپنے ہم عمر لڑکوں سے عشق و محبت کے تعلقات رکھتی ہیں، جن کے ساتھ بسا اوقات مباشرت بھی ہو جاتی ہے۔''

اس کا بیان ہے:

''ایک سات برس کی چھوٹی سی لڑکی جو نہایت شریف خاندان کی چشم و چراغ تھی۔ خود اپنے بڑے بھائی اور اس کے چند دوستوں سے ملوّث ہوئی۔ ــــ ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ پانچ بچّوں کا ایک گروہ جو دو لڑکیوں اور تین لڑکوں پر مشتمل تھا اور جن کے گھر پاس پاس واقع تھے، باہم شہوانی تعلّقات میں وابستہ پائے گئے اور انہوں نے دوسرے ہم سن بچّوں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ ان میں سب سے بڑے بچّے کی عمر صرف دس سال کی تھی ــــ ایک اور واقعہ ایک ۹ سال کی بچی کا ہے جو بظاہر بہت حفاظت سے رکھی جاتی تھی۔ اس بچی کو متعدد ''عشاق'' کی منظورِ نظر ہونے کا فخر حاصل تھا۔'' (ص:۳۲۸)

بالٹیمور (Baltimore) کے ایک ڈاکٹر کی رپورٹ ہے کہ ایک سال کے اندر اس کے شہر میں ایک ہزار سے زیادہ ایسے مقدمات پیش ہوئے جن میں بارہ برس سے کم عمر والی لڑکیوں کے ساتھ مباشرت کی گئی تھی۔ (ص:۱۷۷)

یہ پہلا ثمرہ ہے اس ہیجان انگیز ماحول کا جس میں ہر طرف جذبات کو برانگیختہ کرنے والے اسباب فراہم ہو گئے ہوں۔ امریکہ کا ایک مصنّف لکھتا ہے کہ:

''ہماری آبادی کا اکثر و بیشتر حصّہ آج کل جن حالات میں زندگی بسر کر رہا ہے وہ اس قدر غیر فطری ہیں کہ لڑکے اور لڑکیوں کو دس پندرہ برس کی عمر ہی میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ عشق رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ نہایت افسوسناک ہے۔ اس قسم کی قبل از وقت صنفی دلچسپیوں سے بہت برے نتائج رونما ہو سکتے ہیں، اور ہوا کرتے ہیں۔ ان کا کم سے کم نتیجہ یہ ہے کہ نوعمر لڑکیاں اپنے دوستوں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں یا کم سنی میں شادیاں کر لیتی ہیں، اور اگر محبت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے تو خودکشی کر لیتی ہیں۔''

تعلیم کا مرحلہ

اس طرح جن بچّوں میں قبل از وقت صنفی احساسات بیدار ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے

پہلی تجربہ گاہ مدارس ہیں۔ مدرسے دو قسم کے ہیں ایک قسم ان مدرسوں کی ہے جن میں ایک ہی صنف کے بچّے داخل ہوتے ہیں۔ دوسری قسم ان مدرسوں کی ہے جن میں تعلیم مخلوط ہے۔

پہلی قسم کے مدرسوں میں صحبتِ ہم جنس (Homo Sexuality) اور خودکاری (Masturbation) کی وبا پھیل رہی ہے، کیوں کہ جن جذبات کو بچپن ہی میں بھڑکایا جاچکا ہے، اور جن کو مشتعل کرنے کے سامان فضا میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں وہ اپنی تسکین کے لیے کوئی نہ کوئی صورت نکالنے پر مجبور ہیں۔ ڈاکٹر ہوکر لکھتا ہے کہ:

> ___ ''اس قسم کی تعلیم گاہوں، کالجوں، نرسوں کے ٹریننگ اسکولوں اور مذہبی مدرسوں میں ہمیشہ اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، جن میں ایک ہی صنف کے دو افراد آپس میں شہوانی تعلق رکھتے ہیں۔ اور صنفِ مقابل سے ان کی دل چسپی فنا ہوچکی ہے۔'' (صفحہ۳۳۱) ___

اس سلسلے میں اس نے بکثرت واقعات ایسے بیان کیے ہیں جن میں لڑکیاں لڑکیوں کے ساتھ اور لڑکے لڑکوں کے ساتھ ملوّث ہوئے اور دردناک انجام سے دوچار ہوئے۔ بعض دوسری کتابوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ''صحبتِ ہم جنس'' کی وبا کس قدر کثرت سے پھیلی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر لوری (Dr. Lowry) اپنی کتاب "Herself" میں لکھتا ہے کہ:

> ''ایک مرتبہ ایک مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر نے چالیس خاندانوں کو خفیہ اطلاع دی کہ ان کے لڑکے اب مدرسے میں نہیں رکھے جاسکتے۔ کیوں کہ ان میں بداخلاقی کی ایک خوفناک حالت کا پتہ چلا ہے۔'' (صفحہ۱۷۹)

اب دوسری قسم کے مدارس کو لیجیے جن میں لڑکیاں اور لڑکے ساتھ مل کر پڑھتے ہیں۔ یہاں اشتعال کے اسباب بھی موجود ہیں اور اس کو تسکین دینے کے اسباب بھی۔ جس ہیجانِ جذبات کی ابتدا بچپن میں ہوئی تھی، یہاں پہنچ کر اس کی تکمیل ہوجاتی ہے۔ بدترین فحش لٹریچر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔ عشقیہ افسانے، نام نہاد ''آرٹ'' کے رسالے، صنفی مسائل پر نہایت گندی کتابیں، اور منعِ حمل کی معلومات فراہم کرنے والے مضامین۔ یہ ہیں وہ چیزیں جو عنفوانِ شباب میں مدرسوں اور کالجوں کے طالبین و طالبات کے لیے سب سے زیادہ جاذبِ نظر ہوتی ہیں۔ مشہور امریکن مصنف ہینڈرچ فان لون (Hendrich Fan Loon) کہتا ہے کہ:

''یہ لٹریچر جس کی سب سے زیادہ مانگ امریکن یونیورسٹیوں میں ہے، گندگی فحش اور بیہودگی کا بدترین مجموعہ ہے جو کسی زمانے میں اس قدر آزادی کے ساتھ پبلک میں پیش نہیں کیا گیا۔ اس لٹریچر سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں، دونوں صنفوں کے جوان افراد ان پر نہایت آزادی اور بے باکی سے مباحثے کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد عملی تجربات کی طرف قدم بڑھایا جاتا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں مل کر Petting Parties کے لیے نکلتے ہیں۔ جن میں شراب اور سگریٹ کا استعمال خوب آزادی سے ہوتا ہے اور ناچ سے پورا لطف اٹھایا جاتا ہے۔''(۱)

لنڈسے کا اندازہ ہے کہ ہائی اسکول کی کم از کم ۴۵ فیصدی لڑکیاں مدرسہ چھوڑنے سے پہلے خراب ہو چکتی ہیں اور بعد کے تعلیمی مدارج میں اوسط اس سے بہت زیادہ ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''ہائی اسکول کا لڑکا بہ مقابلہ ہائی اسکول کی لڑکی کے جذبات کی شدّت میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ عموماً لڑکی ہی کسی نہ کسی طرح پیش قدمی کرتی ہے اور لڑکا اس کے اشاروں پر ناچتا ہے۔''

تین زبردست محرِکات

مدرسے اور کالج میں پھر بھی ایک قسم کا ڈسپلن ہوتا ہے جو کسی حد تک آزادیِ عمل میں رکاوٹ پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن یہ نوجوان جب تعلیم گاہوں سے مشتعل جذبات اور بگڑی ہوئی عادات لیے ہوئے زندگی کے میدان میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی شورش تمام حدود و قیود سے آزاد ہو جاتی ہے۔ یہاں ان کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے ایک پورا آتش خانہ موجود ہوتا ہے اور ان کے بھڑکتے ہوئے جذبات کی تسکین کے لیے ہر قسم کا سامان بھی کسی دقّت کے بغیر فراہم ہو جاتا ہے۔

ایک امریکن رسالہ میں ان اسباب کو جن کی وجہ سے وہاں بداخلاقی کی غیر معمولی اشاعت ہو رہی ہے اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''تین شیطانی قوتیں ہیں جن کی تثلیث آج ہماری دنیا پر چھا گئی ہے۔ اور یہ تینوں ایک جہنم تیار کرنے میں مشغول ہیں۔ فحش لٹریچر جو جنگِ عظیم کے بعد سے حیرت انگیز

---

(۱) How i can Get Married P.172.

رفتار کے ساتھ اپنی بے شرمی اور کثرتِ اشاعت میں بڑھتا چلا جارہا ہے۔ متحرک تصویریں جو شہوانی محبت کے جذبات کو نہ بھڑکاتی ہیں بلکہ عملی سبق بھی دیتی ہیں۔ عورتوں کا گراہوا اخلاقی معیار جو ان کے لباس، اور بسا اوقات ان کی برہنگی، اور سگرٹ کے روز افزوں استعمال، اور مردوں کے ساتھ ان کے ہر قید و امتیاز سے ناآشنا اختلاط کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ تین چیزیں ہمارے یہاں بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ اور ان کا نتیجہ مسیحی تہذیب و معاشرت کا زوال اور آخر کار تباہی ہے۔ اگر ان کو نہ روکا گیا تو ہماری تاریخ بھی روم اور ان دوسری قوموں کے مماثل ہوگی جن کو یہی نفس پرستی اور شہوانیت، ان کی شراب اور عورتوں اور ناچ رنگ سمیت فنا کے گھاٹ اتار چکی ہے۔"

یہ تین اسباب جو تمدّن و معاشرت کی پوری فضا پر چھائے ہوئے ہیں ہر اس جوان مرد اور جوان عورت کے جذبات میں ایک دائمی تحریک پیدا کرتے رہتے ہیں جس کے جسم میں تھوڑا سا بھی گرم خون موجود ہے، فواحش کی کثرت اس تحریک کا لازمی نتیجہ ہے۔

فواحش کی کثرت

امریکہ میں جن عورتوں نے زناکاری کو مستقل پیشہ بنالیا ہے ان کی تعداد کا کم سے کم اندازہ چار پانچ لاکھ کے درمیان ہے۔(۱) مگر امریکہ کی بیسوا کو ہندستان کی بیسوا پر قیاس نہ کرلیجیے۔ وہ خاندانی بیسوا نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی عورت ہے جو کل تک کوئی آزاد پیشہ کرتی تھی۔ بری صحبت میں خراب ہوگئی اور قحبہ خانے میں آبیٹھی۔ چند سال یہاں گزارے گی۔ پھر اس کام کو چھوڑ کر کسی دفتر یا کارخانے میں ملازم ہوجائے گی۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ امریکہ کی پچاس فیصدی بیسوائیں خانگی ملازموں (Domestic Servants) میں سے بھرتی ہوتی ہیں، اور باقی ۵۰ فیصدی ہسپتالوں، دفتروں اور دوکانوں کی ملازمتیں چھوڑ کر آتی ہیں۔ عموماً پندرہ اور بیس سال کی عمر میں یہ پیشہ شروع کیا جاتا ہے اور پچیس تیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد وہ عورت جو کل بیسوا تھی، قحبہ خانے سے منتقل ہوکر کسی دوسرے آزاد پیشے میں چلی جاتی ہے۔(۲) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امریکہ میں چار پانچ لاکھ بیسواؤں کی موجودگی در حقیقت کیا معنی رکھتی ہے۔

Prostitution in the United States P. 138-9 (۱)

Prostitution in the United States P. 64-69 (۲)

جیسا کہ پچھلے باب میں بیان کیا جاچکا ہے، مغربی ممالک میں فاحشہ گری ایک منظم بین الاقوامی کاروبار کی حیثیت رکھتی ہے۔ امریکہ میں نیویارک، ریوڈی جینز واور بیونس آئرس اس کاروبار کی بڑی منڈیاں ہیں۔ نیویارک کی دوسب سے بڑی ''تجارتی کوٹھیوں'' میں سے ہرایک کی ایک ایک انتظامی کونسل ہے جس کے صدر اور سکریٹری باقاعدہ انتخاب کیے جاتے ہیں۔ ہر ایک نے قانونی مشیر مقرر کر رکھے ہیں، تاکہ کسی عدالتی قضیہ میں پھنس جانے کی صورت میں ان کے مفاد کی حفاظت کریں۔ جوان لڑکیوں کو بہکانے اور اڑا کر لانے کے لیے ہزارہا دلاّل مقرر ہیں جو ہر جگہ شکار کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں۔ ان شکاریوں کی دست برد کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ شکاگو میں آنے والے مہاجرین کی لیگ کے صدر نے ایک مرتبہ ۱۵ مہینے کے اعدادو شمار جمع کیے تھے تو معلوم ہوا کہ اس مدّت میں ۲۰۰ ۷ لڑکیوں کے خطوط لیگ کے دفتر کو موصول ہوئے جن میں لکھا تھا کہ وہ شکاگو پہنچنے والی ہیں مگر ان میں صرف ۱۷۰۰ اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ سکیں۔ باقی کا کچھ پتہ نہیں چل سکا کہ کہاں گئیں۔

قحبہ خانوں کے علاوہ بکثرت ملاقات خانے (Assignation Houses) اور "Call Houses" ہیں جو اس غرض کے لیے آراستہ رکھے جاتے ہیں کہ ''شریف'' اصحاب اور خواتین جب باہم ملاقات فرمانا چاہیں تو وہاں ان کی ملاقات کا انتظام کردیا جائے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ایک شہر میں ایسے ۷۸ مکان تھے۔ ایک دوسرے شہر میں ۴۳، ایک اور شہر میں ۳۳۔(۱) ان مکانوں میں صرف بن بیاہی خواتین ہی نہیں جاتیں بلکہ بہت سی بیاہی خواتین کا بھی وہاں گزر ہوتا رہتا ہے۔(۲)

ایک مشہور ریفارمر کا بیان ہے کہ:

> ''نیویارک کی شادی شدہ آبادی کا پورا ایک تہائی حصہ ایسا ہے جو اخلاقی اور جسمانی حیثیت سے اپنی ازدواجی ذمے داریوں میں وفادار نہیں ہے اور نیویارک کی حالت ملک کے دوسرے حصوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔''(۳)

---

(۱) Ibid. P. 38

(۲) Ibid. P. 36

(۳) Herself. P. 116

امریکہ کے مصلحینِ اخلاق کی ایک مجلس "Committee of Fourteen" کے نام سے مشہور ہے۔ اس مجلس کی طرف سے بداخلاقی کے مرکزوں کی تلاش اور ملک کی اخلاقی حالت کی تحقیقات اور اصلاحِ اخلاق کی عملی تدابیر کا کام بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے۔ اس کی رپورٹوں میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کے جتنے رقص خانے، نائٹ کلب، حسن گاہیں (Beauty Saloons) ہاتھوں کو خوبصورت بنانے کی دوکانیں (Manicure Shops) مالش کدے (Massage Rooms) اور بال سنوارنے کی دکانیں (Hair Dressings) ہیں، قریب قریب سب باقاعدہ فحبہ خانے بن چکے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی بدتر، کیوں کہ وہاں ناقابلِ بیان افعال کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔

امراضِ خبیثہ

فواحش کی اس کثرت کا لازمی نتیجہ امراضِ خبیثہ کی کثرت ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ امریکہ کی قریب قریب ۹۰ فیصدی آبادی ان امراض سے متأثر ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے سرکاری دواخانوں میں اوسطاً ہر سال آتشک کے دو لاکھ اور سوزاک کے ایک لاکھ ۶۰ ہزار مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ ۶۵ دواخانے صرف انہی امراض کے لیے مخصوص ہیں۔ مگر سرکاری دواخانوں سے زیادہ مرجوعہ پرائیوٹ ڈاکٹروں کا ہے، جن کے پاس آتشک کے ۶۱ فیصدی اور سوزاک کے ۸۹ فیصدی مریض جاتے ہیں۔ (جلد ۲۳، صفحہ ۴۵)

تیس اور چالیس ہزار کے درمیان بچّوں کی اموات صرف موروثی آتشک کی بدولت ہوتی ہیں۔ دق کے سوا بقیہ تمام امراض سے جتنی موتیں واقع ہوتی ہیں۔ ان سب سے زیادہ تعداد ان اموات سے ہے جو صرف آتشک کی بدولت ہوتی ہیں۔ سوزاک کے متعلق ماہرین کا کم سے کم تخمینہ ہے کہ ۶۰ فیصدی جوان اشخاص اس مرض میں مبتلا ہیں، جن میں شادی شدہ بھی ہیں اور غیر شادی شدہ بھی۔ امراضِ نسواں کے ماہرین کا متفقہ بیان ہے کہ شادی شدہ عورتوں کے اعضاء جنسی پر جتنے آپریشن کیے جاتے ہیں، ان میں سے ۷۵ فیصدی ایسی نکلتی ہیں جن میں سوزاک کا اثر پایا جاتا ہے۔(۱)

---

(۱) Laws of Sex P. 204

طلاق اور تفریق

ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ خاندان کا نظم اور ازدواج کا مقدس رابطہ کہاں قائم رہ سکتا ہے۔ آزادی کے ساتھ اپنی روزی کمانے والی عورتیں جن کو شہوانی ضروریات کے سوا اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں بھی مرد کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جن کو شادی کے بغیر آسانی کے ساتھ مرد بھی مل سکتے ہیں، شادی کو ایک فضول چیز سمجھتی ہیں۔ جدید فلسفہ اور مادّہ پرستانہ خیالات نے ان کے وجدان سے یہ احساس بھی دور کر دیا ہے کہ شادی کے بغیر کسی شخص سے تعلّقات رکھنا کوئی عیب یا گناہ ہے۔ سوسائٹی کو بھی اس ماحول نے اس قدر بے حس بنا دیا ہے کہ وہ ایسی عورتوں کو قابلِ نفرت یا قابلِ ملامت نہیں سمجھتی۔

جج لنڈ سے امریکہ کی عام لڑکیوں کے خیالات کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے:

> ''میں شادی کیوں کروں؟ میرے ساتھ کی جن لڑکیوں نے گزشتہ دو سالوں میں شادیاں کی ہیں، ہر دس میں سے پانچ کی شادی کا انجام طلاق پر ہوا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس زمانے کی ہر لڑکی محبت کے معاملے میں آزادیِ عمل کا فطری حق رکھتی ہے۔ ہم کو منعِ حمل کی کافی تدبیریں معلوم ہیں۔ اس ذریعے سے یہ خطرہ بھی دور کیا جا سکتا ہے کہ ایک حرامی بچّے کی پیدائش کوئی پیچیدہ صورتِ حال پیدا کر دے گی۔ ہم کو یقین ہے کہ روایتی طریقوں کو اس جدید طریقہ سے بدل دینا عقل کا مقتضا ہے۔''

ان خیالات کی بے شرم عورتوں کو اگر کوئی چیز شادی پر آمادہ کرتی ہے تو وہ جذبۂ محبت ہے۔ لیکن اکثر یہ جذبہ بھی دل اور روح کی گہرائی میں نہیں ہوتا، بلکہ محض ایک عارضی کشش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خواہشات کا نشہ اتر جانے کے بعد زوجین میں کوئی الفت باقی نہیں رہتی۔ مزاج اور عادات کی ادنیٰ ناموافقت ان کے درمیان منافرت پیدا کر دیتی ہے۔ آخر کار عدالت میں طلاق یا تفریق کا دعویٰ پیش ہو جاتا ہے۔ لنڈ سے لکھتا ہے:

> ''۱۹۲۲ میں ڈنور میں ہر شادی کے ساتھ ایک واقعہ تفریق کا پیش آیا، اور دو شادیوں کے مقابلے میں ایک مقدمہ طلاق کا پیش ہوا۔ یہ حالت محض ڈنور ہی کی نہیں ہے۔ امریکہ کے تقریباً تمام شہروں کی قریب قریب یہی حالت ہے۔''

پھر لکھتا ہے:

''طلاق اور تفریق کے واقعات بڑھتے جارہے ہیں اور اگر یہی حالت رہی جیسی کہ امید ہے، تو غالباً ملک کے اکثر حصّوں میں جتنے شادی کے لائسنس دیے جائیں گے اتنے ہی طلاق کے مقدمے پیش ہوں گے۔''(۱)

کچھ عرصہ ہوا کہ ڈیٹرائے (Detroit) کے اخبار ''فری پریس'' میں ان حالات پر ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس کا ایک فقرہ یہ ہے:

''نکاحوں کی کمی، طلاقوں کی زیادتی، اور نکاح کے بغیر مستقل یا عارضی ناجائز تعلقات کی کثرت، یہ معنی رکھتی ہے کہ ہم حیوانیت کی طرف واپس جارہے ہیں۔ بچّے پیدا کرنے کی فطری خواہش مٹ رہی ہے، پیداشدہ بچّوں سے غفلت برتی جارہی ہے۔ اور اس امر کا احساس رخصت ہورہا ہے کہ خاندان اور گھر کی تعمیر، تہذیب اور آزاد حکومت کے بقا کے لیے ضروری ہے۔ اس کے برعکس تہذیب اور حکومت کے انجام سے ایک بے دردانہ بے اعتنائی پیدا ہورہی ہے۔''

طلاق اور تفریق کی اس کثرت کا علاج اب یہ نکالا گیا ہے کہ Compassionate Marriage یعنی ''آزمائشی نکاح'' کو رواج دیا جائے۔ مگر یہ علاج اصل مرض سے بھی بدتر ہے۔ آزمائشی نکاح کے معنی یہ ہیں کہ مرد اور عورت ''پرانے فیشن کی شادی'' کیے بغیر کچھ عرصہ تک باہم مل کر رہیں۔ اگر اس یکجائی میں دل سے دل مل جاتے ہیں تو شادی کرلیں۔ ورنہ دونوں الگ ہوکر کہیں اور قسمت آزمائی کریں۔ دورانِ آزمائش میں دونوں کو اولاد پیدا کرنے سے پرہیز کرنا لازمی ہے۔ کیوں کہ بچّے کی پیدایش کے بعد ان کو باضابطہ نکاح کرنا پڑے گا، یہ وہی چیز ہے جس کا نام روس میں آزاد محبت (Free Love) ہے۔

قومی خودکُشی

نفس پرستی، ازدواجی ذمّے داریوں سے نفرت، خاندانی زندگی سے بیزاری اور ازدواجی تعلقات کی ناپائیداری نے عورت کے اُس فطری جذبۂ مادری کو قریب قریب فنا کردیا ہے۔ جو نسوانی جذبات میں سب سے زیادہ اشرف واعلیٰ روحانی جذبہ ہے، اور جس کے بقاء پر نہ صرف تمدّن وتہذیب، بلکہ انسانیت کے بقاء کا انحصار ہے۔ منعِ حمل، اسقاطِ حمل اور قتلِ اطفال

(۱) Revolt of Modern Youth P.211-14

اسی جذبہ کی موت سے پیدا ہوئے ہیں۔ منعِ حمل کی معلومات ہر قسم کی قانونی پابندیوں کے باوجود ممالکِ متحدہ امریکہ میں ہر جوان لڑکی اور لڑکے کو حاصل ہیں۔ مانعِ حمل دوائیں اور آلات بھی آزادی کے ساتھ دکانوں پر فروخت ہوتے ہیں۔ عام آزاد عورتیں تو درکنار مدرسوں اور کالجوں کی لڑکیاں بھی اس سامان کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتی ہیں۔ تاکہ اگر ان کا دوست اتفاقاً اپنا سامان بھول آئے تو ایک پُرلطف شام ضائع نہ ہونے پائے ــــ جج لنڈسے لکھتا ہے:

> ''ہائی اسکول کی کم عمر والی ۴۹۵ لڑکیاں جنہوں نے خود مجھ سے اقرار کیا کہ ان کو لڑکوں سے صنفی تعلقات کا تجربہ ہو چکا ہے، ان میں صرف ۲۵ /ایسی تھیں جن کو حمل ٹھیر گیا تھا، باقیوں میں سے بعض تو اتفاقاً بچ گئی تھیں، لیکن اکثر کو منعِ حمل کی مؤثر تدابیر کا کافی علم تھا۔ یہ واقفیت ان میں اتنی عام ہو چکی ہے کہ لوگوں کو اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔''

کنواری لڑکیاں ان تدابیر کو اس لیے استعمال کرتی ہیں کہ ان کی آزادی میں فرق نہ آئے۔ شادی شدہ عورتیں اس لیے ان سے استفادہ کرتی ہیں کہ بچّہ کی پیدائش سے نہ صرف ان پر تربیت اور تعلیم کا بار پڑ جاتا ہے، بلکہ شوہر کو طلاق دینے کی آزادی میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور تمام عورتیں اس لیے ماں بننے سے نفرت کرنے لگی ہیں کہ زندگی کا پورا پورا لطف اٹھانے کے لیے ان کو اس جنجال سے بچنے کی ضرورت ہے۔ نیز اس لیے بھی کہ ان کے نزدیک بچّے جننے سے اُن کے حسن میں فرق آجاتا ہے۔(۱)

بہر حال اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، ۹۵ فیصدی تعلقاتِ مرد و زن ایسے ہیں جن سے اس تعلق کے فطری نتیجہ کو منعِ حمل کی تدبیروں سے روک دیا جاتا ہے۔ باقی ماندہ، ۵ فیصدی حوادث جن میں اتفاقاً حمل قرار پا جاتا ہے، ان کے لیے اسقاط اور قتلِ اطفال کی تدبیریں موجود ہیں۔ جج لنڈسے کا بیان ہے کہ امریکہ میں ہر سال کم از کم ۱۵ لاکھ حمل ساقط کیے جاتے ہیں اور ہزار ہا بچّے پیدا ہوتے ہی قتل کر دیے جاتے ہیں۔ (ص:۲۲۰)

انگلستان کی حالت

میں ان افسوس ناک تفصیلات کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ مگر نامناسب ہے کہ اس حصۂ بحث کو جارج رائیلی اسکاٹ کی تاریخ الفحشاء (A History of Prostitution) کے چند

---

(۱) Macfado in Manhood and Marriage P. 82

اقتباسات نقل کیے بغیر ختم کر دیا جائے۔ اس کتاب کا مصنّف ایک انگریز ہے اور اس نے زیادہ تر اپنے ہی ملک کی اخلاقی حالات کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

''جن عورتوں کی بسر اوقات کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ اپنے جسم کو کرایہ پر چلا کر روزی کمائیں، ان کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد ان عورتوں کی بھی ہے (اور وہ روز بروز زیادہ ہو رہی ہے) جو اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے لیے دوسرے ذرائع رکھتی ہیں، اور ضمنی طور پر اس کے ساتھ فاحشہ گری بھی کرتی ہیں تا کہ آمدنی میں کچھ اور اضافہ ہو جائے۔ یہ پیشہ ور فاحشات سے کچھ بھی مختلف نہیں ہیں، مگر اس نام کا اطلاق ان پر کیا نہیں جاتا۔ ہم ان کو غیر پیشہ ور فاحشات (Amateur Prostitutes) کہہ سکتے ہیں۔''

ان شوقین یا غیر پیشہ ور فاحشات کی کثرت آج کل جتنی ہے اتنی کبھی نہ تھی۔ سوسائٹی کے نیچے سے لے کر اوپر تک ہر طبقہ میں یہ پائی جاتی ہیں، اگر ان معزز خواتین کو کہیں اشارے میں بھی ''فاحشہ'' کہہ دیا جائے تو یہ آگ بگولہ ہو جائیں گی۔ مگر ان کی ناراضی سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ حقیقت بہر حال یہی ہے کہ ان میں اور پکاؤلی کی کسی بڑی سے بڑی بے شرم بیسوا میں بھی اخلاقی حیثیت سے کوئی وجہ امتیاز نہیں ہے ــــ اب جوان لڑکی کے لیے بدچلنی اور بیبا کی بلکہ سوقیانہ اطوار تک فیشن میں داخل ہو گئے ہیں۔ اور سگریٹ پینا، تلخ شرابیں استعمال کرنا، ہونٹوں پر سرخی لگانا، صنفیات اور منعِ حمل کے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کرنا، فحش لٹریچر پر گفتگو کرنا، یہ سب چیزیں بھی ان کے لیے فیشن بنی ہوئی ہیں ــــ ایسی لڑکیوں اور عورتوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ جو شادی سے پہلے صنفی تعلّقات بلا تکلّف قائم کر لیتی ہیں۔ اور وہ لڑکیاں اب شاذ کے حکم میں ہیں جو کلیسا کی قربان گاہ کے سامنے نکاح کا پیمانِ وفا باندھتے وقت صحیح معنوں میں دوشیزہ ہوتی ہوں۔

آگے چل کر یہ مصنّف ان اسباب کا تجزیہ کرتا ہے جو حالات کو اس حد تک پہنچا دینے کے موجب ہوئے ہیں۔ اور مناسب تر یہ ہے کہ اس تجزیہ کو بھی اسی کے الفاظ میں نقل کیا جائے:

''سب سے پہلے اُس شوقِ آرائش کو لیجیے جن کی وجہ سے ہر لڑکی میں نئے فیشن کے قیمتی لباسوں اور حسن افزائی کے مختلف النوع سامانوں کے بے پناہ حرص پیدا ہو گئی ہے۔ یہ اس بے ضابطہ فاحشہ گری کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب ہے۔ ہر شخص جو

دیکھنے والی آنکھیں رکھتا ہے اس بات کو بآسانی دیکھ سکتا ہے کہ وہ سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں جو اُس کے سامنے روزانہ گزرتی ہیں عموماً اپنے قیمتی کپڑے پہنے ہوئے ہوتی ہیں کہ اُن کی جائز کمائی کسی طرح بھی ایسے لباسوں کی متحمل نہیں ہوسکتی، لہٰذا آج بھی یہ کہنا اتنا ہی صحیح ہے جتنا نصف صدی پہلے صحیح تھا کہ مرد ہی ان کے لیے کپڑے خریدتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے جو مرد اُن کے لیے کپڑے خریدتے تھے وہ ان کے شوہر یا باپ بھائی ہوتے تھے اور اب اُن کے بجائے کچھ دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔''

—— عورتوں کی آزادی کا بھی ان حالات کی پیدائش میں بہت کچھ دخل ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں لڑکیوں پر سے والدین کی حفاظت و نگرانی اس حد تک کم ہوگئی ہے کہ تیس چالیس سال قبل لڑکوں کو بھی اتنی آزادی حاصل نہ تھی، جتنی اب لڑکیوں کو حاصل ہے۔

''ایک اور اہم سبب، جو سوسائٹی میں وسیع پیمانے پر صنفی آوارگی پھیلنے کا موجب ہوا، یہ ہے کہ عورتیں روز افزوں تعداد میں تجارتی کاروبار، دفتری ملازمتوں اور مختلف پیشوں میں داخل ہو رہی ہیں۔ جہاں شب و روز ان کو مردوں کے ساتھ خلط ملط ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اس چیز نے عورتوں اور مردوں کے اخلاقی معیار کو بہت گرا دیا ہے۔ مردانہ اقدامات کے مقابلے میں عورتوں کی قوتِ مزاحمت کو بہت کم کر دیا ہے، اور دونوں صنفوں کے شہوانی تعلق کو تمام اخلاقی بندشوں سے آزاد کر کے رکھ دیا ہے۔ اب جوان لڑکیوں کے ذہن میں شادی اور باعصمت زندگی کا خیال آتا ہی نہیں۔ آزادانہ ''خوش وقتی'' جسے پہلے کبھی آوارہ قسم کے مرد ڈھونڈتے پھرتے تھے، آج ہر لڑکی اس کی جستجو کرتی پھرتی ہے۔ دوشیزگی اور بکارت کو ایک دقیانوسی چیز سمجھا جاتا ہے اور دورِ جدید کی لڑکی اس کو ایک مصیبت خیال کرتی ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کا لطف یہ ہے کہ عہدِ شباب میں لذّاتِ نفس کا جام خوب جی بھر کر پیا جائے۔ اسی چیز کی تلاش میں وہ رقص خانوں نائٹ کلبوں، اور ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کے چکّر لگاتی ہے اور اسی کی جستجو میں وہ بالکل اجنبی مردوں کے ساتھ موٹر کی سیر کے لیے بھی جانے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ جان بوجھ کر خود اپنی خواہش سے اپنے آپ کو ایسے ماحول میں اور ایسے حالات میں پہنچا دیتی ہے، اور پہنچاتی رہتی ہے جو صنفی جذبات کو مشتعل کرنے والے ہیں، اور پھر اس کے جو قدرتی نتائج ہیں ان سے وہ گھبراتی نہیں بلکہ ان کا خیر مقدم کرتی ہے۔''

باب٦ :

فیصلہ کن سوال

ہمارے ملک میں، اور اسی طرح دوسرے مشرقی ممالک میں بھی جو لوگ پردے کی مخالفت کرتے ہیں ان کے سامنے دراصل زندگی کا یہی نقشہ ہے۔ اسی زندگی کے تابناک مظاہر نے ان کے حواس کو متاثر کیا ہے۔ یہی نظریات، یہی اخلاقی اصول اور یہی مادّی و حسّی فوائد ولذائذ ہیں، جن کے روشن پہلو نے ان کے دل و دماغ کو اپیل کیا ہے۔ پردہ سے ان کی نفرت اسی بنا پر ہے کہ اس کا بنیادی فلسفۂ اخلاق اس مغربی فلسفۂ اخلاق کی ضد ہے جس پر یہ ایمان لائے ہیں، اور عملاً ان فائدوں اور لذتوں کے حصول میں مانع ہے جن کو اِن حضرات نے مقصود بنایا ہے۔ اب یہ سوال کہ اس نقشۂ زندگی کے تاریک پہلو، یعنی اس کے عملی نتائج کو بھی یہ لوگ قبول کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں، تو اس باب میں ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے۔

ایک گروہ ان نتائج کو جانتا ہے اور انہیں قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ درحقیقت اس کے نزدیک یہ بھی مغربی زندگی کا روشن پہلو ہی ہے، نہ کہ تاریک۔

دوسرا گروہ اس پہلو کو تاریک سمجھتا ہے۔ ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ مگر ان فائدوں پر بری طرح فریفتہ ہے جو اس طرزِ زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

تیسرا گروہ نہ تو نظریات ہی کو سمجھتا ہے، نہ ان کے نتائج سے واقف ہے اور نہ اس بات پر غور و فکر کی زحمت اٹھانا چاہتا ہے کہ ان نظریات اور ان نتائج کے درمیان کیا تعلق ہے۔ اس کو تو بس وہ کام کرنا ہے جو دنیا میں ہو رہا ہے۔

یہ تینوں گروہ باہم کچھ اس طرح مخلوط ہو گئے ہیں کہ گفتگو کرتے وقت بسا اوقات یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہمارا مخاطب دراصل کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی اختلاط کی وجہ سے

عموماً سخت خلط مبحث پیش آتا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ان کو چھانٹ کر ایک دوسرے سے الگ کیا جائے۔ اور ہر ایک سے اس کی حیثیت کے مطابق بات کی جائے۔

مشرقی مستغربین

پہلے گروہ کے لوگ اس فلسفے اور ان نظریات پر، اور ان تمدّنی اصولوں پر علی وجہ البصیرت ایمان لائے ہیں جن پر مغربی تہذیب و تمدن کی بنا رکھی گئی ہے۔ وہ اسی دماغ سے سوچتے ہیں اور اسی نظر سے زندگی کے مسائل کو دیکھتے ہیں جس سے جدید یورپ کے معماروں نے دیکھا اور سوچا تھا، اور وہ خود اپنے اپنے ملکوں کی تمدنی زندگی کو بھی اسی مغربی نقشہ پر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ عورت کی تعلیم کا منتہائے مقصود ان کے نزدیک واقعی یہی ہے کہ وہ کمانے کی قابلیت بہم پہنچائے اور اس کے ساتھ دل لبھانے کے فنون سے بھی کماحقہ، واقف ہو۔ خاندان میں عورت کی صحیح حیثیت ان کے نزدیک درحقیقت یہی ہے کہ وہ مرد کی طرح خاندان کا کمانے والا رکن بنے اور مشترک بجٹ میں اپنا حصّہ پورا پورا ادا کرے۔ سوسائٹی میں عورت کا اصل مقام ان کی رائے میں یہی ہے کہ وہ اپنے حسن، اپنی آرائش اور اپنی اداؤں سے اجتماعی زندگی میں ایک عنصرِ لطیف کا اضافہ کرے، اپنی خوش گفتاری سے دلوں میں حرارت پیدا کرے۔ اپنی موسیقی سے کانوں میں رس بھر دے، اپنے رقص سے روحوں کو وجد میں لائے اور تھرک تھرک کر اپنے جسم کی ساری خوبیاں آدم کے بیٹوں کو دکھائے تاکہ ان کے دل خوش ہوں، ان کی نگاہیں لذت یاب ہوں اور ان کے ٹھنڈے خون میں تھوڑی سی گرمی آ جائے۔ حیاتِ قومی میں عورت کا کام ان کے خیال میں فی الواقع اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ سوشل ورک کرتی پھرے، میونسپلٹیوں اور کونسلوں میں جائے، کانفرنسوں اور کانگریسوں میں شریک ہو، سیاسی اور تمدّنی اور معاشرتی مسائل کو سلجھانے میں اپنا وقت اور دماغ صَرف کرے، ورزشوں اور کھیلوں میں حصّہ لے، تیراکی اور دوڑ اور کود پھاند اور لمبی لمبی اڑانوں میں ریکارڈ توڑ دے، غرض وہ سب کچھ کرے جو گھر سے باہر ہے اور اس سے کچھ غرض نہ رکھے جو گھر کے اندر ہے۔ اس زندگی کو وہ آئیڈیل زندگی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک دنیوی ترقی کا یہی راستہ ہے اور اس راستہ پر جانے میں جتنے پرانے اخلاقی نظریات مانع ہیں وہ سب کے سب محض لغو اور سراسر باطل ہیں۔ اس نئی زندگی کے لیے پرانی اخلاقی قدروں (Moral Values) کو انھوں نے اسی طرح نئی قدروں سے بدل لیا ہے جس طرح یورپ نے بدلا ہے۔ مادّی فوائد اور

جسمانی لذّتیں ان کی نگاہ میں زیادہ بلکہ اصلی قدر و قیمت رکھتی ہیں، اور ان کے مقابلے میں حیا، عصمت، طہارت، اخلاق، ازدواجی زندگی کی وفاداری، نسب کی حفاظت اور اسی قبیل کی دوسری تمام چیزیں نہ صرف یہ کہ بے قدر ہیں، بلکہ دقیانوسی و تاریک خیالی کے ڈھکوسلے ہیں جنہیں ختم کیے بغیر ترقی کا قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔

یہ لوگ دراصل دینِ مغربی کے سچّے مومن ہیں اور جس نظریہ پر یہ ایمان لائے ہیں اس کو ان تمام تدبیروں سے، جو یورپ میں اس سے پہلے اختیار کی جاچکی ہیں، مشرقی ممالک میں پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

نیا ادب

سب سے پہلے ان کے لٹریچر کو لیجیے جو دماغوں کو تیار کرنے والی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس نام نہاد ادب ـــــ دراصل بے ادبی ـــــ میں پوری کوشش اس امر کی جارہی ہے کہ نئی نسلوں کے سامنے اس نئے اخلاقی فلسفے کو مزیّن بنا کر پیش کیا جائے اور پرانی اخلاقی قدروں کو دل و دماغ کے ایک ایک ریشہ سے کھینچ کر نکال ڈالا جائے۔ مثال کے طور پر میں یہاں اردو کے نئے ادب سے چند نمونے پیش کروں گا:

''ہندستان کے ایک مشہور ماہنامے میں، جس کو ادبی حیثیت سے اس ملک میں کافی وقعت حاصل ہے، ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ''شیریں کا سبق'' صاحبِ مضمون ایک ایسے صاحب ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ، ادبی حلقوں میں مشہور اور ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوجوان صاحبزادی اپنے استاد سے سبق پڑھنے بیٹھی ہیں اور درس کے دوران میں اپنے ایک نوجوان دوست کا نامۂ محبت استاد کے سامنے بغرض مطالعہ و مشورہ پیش فرماتی ہیں۔ اس ''دوست'' سے ان کی ملاقات کسی ''چائے پارٹی'' میں ہوگئی تھی۔ وہاں ''کسی لیڈی نے تعارف کی رسم ادا کردی۔'' اس دن سے میل جول اور مراسلت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اب صاحبزادی یہ چاہتی ہیں کہ استاد جی ان کو اس دوست کے محبت ناموں کا ''اخلاقی جواب'' لکھنا سکھا دیں۔ استاد کوشش کرتا ہے کہ لڑکی کو ان بیہودگیوں سے ہٹا کر پڑھنے کی طرف راغب کرے۔ لڑکی جواب دیتی ہے کہ:

''پڑھنا تو میں چاہتی ہوں مگر ایسا پڑھنا جو میرے جاگتے کے خوابوں کی آرزوؤں میں کامیاب ہونے میں مدد دے۔نہ ایسا پڑھنا جو مجھے ابھی سے بڑھیا بنا دے۔''

استاد پوچھتا ہے: ''کیا ان حضرت کے علاوہ تمہارے اور بھی کچھ نوجوان دوست ہیں؟''

لائق شاگرد جواب دیتی ہے: ''کئی ہیں۔مگر اس نوجوان میں یہ خصوصیت ہے کہ بڑے مزے سے جھڑک دیتا ہے۔''

استاد کہتا ہے کہ ''اگر تمہارے ابا کو تمہاری اس خط و کتابت کا پتہ چل جائے تو کیا ہو؟''

صاحبزادی جواب دیتی ہیں: ''کیا ابّا نے شباب میں اس قسم کے خط نہ لکھے ہوں گے؟ اچھے خاصے فیشن ایبل ہیں۔کیا تعجب ہے کہ اب بھی لکھتے ہوں، خدانخواستہ بوڑھے نہیں ہو گئے ہیں۔''

استاد کہتا ہے کہ: ''اب سے پچاس برس پہلے تو یہ خیال بھی ناممکن تھا کہ کسی شریف زادی کو محبت کا خط لکھا جائے۔'' شریف زادی صاحبہ جواب میں فرماتی ہیں: ''تو کیا اس زمانے کے لوگ صرف بدذاتوں سے ہی محبت کرتے تھے۔بڑے مزے میں تھے اس زمانے کے بدذات اور بڑے بدمعاش تھے اُس زمانے کے شریف۔''

''شیریں'' کے آخری الفاظ، جن پر مضمون نگار نے گویا اپنے ادیبانہ تفلسف کی تان توڑی ہے یہ ہیں:

''ہم لوگوں (یعنی نوجوانوں) کی دُہری ذمے داری ہے۔وہ مسرّتیں جو ہمارے بزرگ کھو چکے ہیں زندہ کریں اور وہ غصّہ اور جھوٹ کی عادتیں جو زندہ ہیں انہیں دفن کر دیں۔''

ایک اور نامور ادبی رسالہ میں اب سے ڈیڑھ سال پہلے ایک مختصر افسانہ ''پشیمانی'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، جس کا خلاصہ سیدھے سادھے الفاظ میں یہ تھا کہ ایک شریف خاندان کی بن بیاہی لڑکی ایک شخص سے آنکھ لڑاتی ہے۔اپنے باپ کی غیر موجودگی، اور ماں کی لاعلمی میں اس کو چپکے سے بلا لیتی ہے۔ناجائز تعلقات کے نتیجہ میں حمل قرار پا جاتا ہے، اس کے بعد وہ اپنے اس ناپاک فعل کو حق بجانب ٹھیرانے کے لیے دل ہی دل میں یوں استدلال کرتی ہے:

''میں پریشان کیوں ہوں؟ میرا دل دھڑکتا کیوں ہے؟ کیا میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے؟ کیا میں اپنی کمزوری پر نادم ہوں؟ شاید ہاں۔لیکن رومانی چاندنی رات کی

داستان تو میری کتاب زندگی میں سنہری الفاظ میں لکھی ہوئی ہے۔ شباب کے مست لمحات کی اس یاد کو تو اب بھی میں اپنا سب سے زیادہ عزیز خزانہ سمجھتی ہوں۔ کیا میں ان لمحات کو واپس لانے کے لیے اپنا سب کچھ دینے کے لیے تیار نہیں؟''

''پھر کیوں میرا دل دھڑکتا ہے؟ کیا گناہ کے خوف سے؟ کیا میں نے گناہ کیا؟ نہیں میں نے گناہ نہیں کیا۔ میں نے کس کا گناہ کیا؟ میرے گناہ سے کس کو نقصان پہنچا؟ میں نے تو قربانی کی، قربانی اس کے لیے۔ کاش کہ میں اس کے لیے اور بھی قربانی کرتی۔ گناہ سے میں نہیں ڈرتی۔ لیکن شاید میں اس چڑیل سوسائٹی سے ڈرتی ہوں۔ اس کی کیسی کیسی معنی خیز اشتباہ آمیز نظریں مجھ پر پڑتی ہیں۔''

''آخر میں اس سے کیوں ڈرتی ہوں؟ اپنے گناہ کے باعث؟ لیکن میرا گناہ ہی کیا ہے؟ کیا جیسا میں نے کیا، ایسا ہی سوسائٹی کی کوئی اور لڑکی نہ کرتی؟ وہ سہانی رات اور وہ تنہائی، وہ کتنا خوبصورت تھا۔ اس نے کیسے میرے منہ پر اپنا منہ رکھ دیا۔ اور اپنی آغوش میں مجھے کھینچ لیا، بھینچ لیا۔ اُف اس کے گرم اور خوشبودار سینے سے میں کس اطمینان کے ساتھ چمٹ گئی۔ میں نے ساری دنیا ٹھکرادی اور اپنا سب کچھ اِن لمحاتِ عیش پر تج دیا۔ پھر کیا ہوا؟ کوئی اور کیا کرتا؟ کیا دنیا کی کوئی عورت اس وقت اُس کو ٹھکرا سکتی تھی؟''

''گناہ؟ میں نے ہرگز گناہ نہیں کیا۔ میں ہرگز نادم نہیں ہوں۔ میں پھر وہی کرنے کو تیار ہوں...... عصمت؟ عصمت ہے کیا؟ صرف کنوارپن؟ یا خیالات کی پاکیزگی؟ میں کنواری نہیں رہی۔ لیکن کیا میں نے اپنی عصمت کھودی؟''

''فسادی چڑیل سوسائٹی کو جو کچھ کرنا ہو کر لے۔ وہ میرا کیا کر سکتی ہے؟ کچھ نہیں! میں اس کی پُرحماقت انگشت نمائی سے کیوں جھینپوں؟ میں اس کی کانا پھوسی سے کیوں ڈروں؟ کیوں اپنا چہرہ زرد کرلوں؟ میں اُس کے بے معنی تمسخر سے کیوں منہ چھپاؤں؟ میرا دل کہتا ہے کہ میں نے ٹھیک کیا، اچھا کیا، خوب کیا۔ پھر میں کیوں چور بنوں، کیوں نہ بابانگِ دہل اعلان کردوں کہ میں نے ایسا کیا اور خوب کیا؟''

یہ طرزِ استدلال اور اندازِ فکر ہے جو ہمارے زمانے کا نیا ادیب ہر لڑکی ــــ شاید خود اپنی بہن اور بیٹی کو بھی ــــ سکھانا چاہتا ہے۔ اُس کی تعلیم یہ ہے کہ ایک جوان لڑکی کو چاندنی

رات میں جو گرم سینہ بھی مل جائے اس سے اس کو چمٹ جانا چاہیے کیوں کہ اس صورت حال میں یہی ایک طریقِ کار ممکن ہے اور جو عورت بھی ایسی حالت میں ہو وہ اس کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ یہ فعل گناہ نہیں بلکہ قربانی ہے اور اس سے عصمت پر بھی کوئی حرف نہیں آتا۔ بھلا خیالات کی پاکیزگی کے ساتھ کنوارپن قربان کر دینے سے بھی کہیں عصمت جاتی ہوگی! اس سے تو عصمت میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا شاندار کارنامہ ہے کہ ایک عورت کی زندگی میں سنہری الفاظ سے لکھا جانا چاہیے، اور اس کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس کی ساری کتابِ زندگی ایسے ہی سنہری الفاظ میں لکھی ہوئی ہو۔ رہی سوسائٹی، تو وہ اگر ایسی عصمت مآب خواتین پر حرف رکھتی ہے تو وہ فسادی اور چڑیل ہے۔ قصوروار وہ خود ہے کہ ایسی ایثار پیشہ لڑکیوں پر حرف رکھتی ہے، نہ کہ وہ صاحبزادی جو ایک رومانی رات میں کسی کھلی ہوئی آغوش کے اندر بھینچے جانے سے انکار نہ فرمائیں۔ ایسی ظالم سوسائٹی جو اتنے اچھے کام کو برا کہتی ہے، ہرگز اس کی مستحق نہیں کہ اس سے ڈرا جائے اور یہ کارِ خیر انجام دے کر اُس سے منہ چھپایا جائے۔ نہیں، ہر لڑکی کو علانیہ اور بے باکانہ اس فضیلتِ اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور خود شرمندہ ہونے کے بجائے ہو سکے تو الٹا سوسائٹی کو شرمندہ کرنا چاہیے —— یہ جرأت و جسارت کبھی بازار میں بیٹھنے والی بیسواؤں کو بھی نصیب نہ تھی، کیوں کہ ان بدنصیبوں کے پاس ایسا فلسفۂ اخلاق نہ تھا جو گناہ کو صواب اور صواب کو گناہ کر دیتا۔ اس وقت کی بیسوا عصمت تو بیچتی تھی مگر اپنے آپ کو خود ذلیل اور گناہگار سمجھتی تھی —— مگر اب نیا ادب ہر گھر کی بہو اور بیٹی کو پہلے زمانے کی بیسواؤں سے بھی دس قدم آگے پہنچا دینا چاہتا ہے کیوں کہ یہ بدمعاشی و فحش کاری کی پشتیبانی کے لیے ایک نیا فلسفۂ اخلاق پیدا کر رہا ہے۔

ایک اور رسالہ میں جس کو ہمارے ملک کے ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل ہے، ایک افسانہ ''دیور'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ مصنّف ایک ایسے صاحب ہیں جن کے والد مرحوم کو عورتوں کے لیے بہترین اخلاقی لٹریچر پیدا کرنے کا شرف حاصل تھا، اور اسی خدمت کی وجہ سے غالباً وہ ہندستان کی اردو خواں عورتوں میں مقبول ترین بزرگ تھے۔

اس افسانہ میں نوجوان ادیب صاحب ایک ایسی لڑکی کے کیریکٹر کو خوشنما بنا کر اپنی بہنوں کے لیے نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں جو شادی سے پہلے ہی اپنے ''دیور کی بھرپور جوانی اور شباب کے ہنگاموں'' کا خیال کر کے ''اپنے جسم میں تھرتھری'' پیدا کر لیا کرتی تھی، اور

کنوارپنے ہی سے اس کا نظریہ یہ تھا کہ ”جو جوانی خاموش اور پرسکون گزر جائے، اس میں اور ضعیفی میں کوئی فرق نہیں۔ میرے نزدیک تو جوانی کے لیے ہنگامے ضروری ہیں جن کا ماخذ کشمکشِ حسن و عشق ہے۔“ اس نظریہ اور ان ارادوں کو لیے ہوئے جب یہ صاحبزادی بیاہی گئیں تو اپنے داڑھی والے شوہر کو دیکھ کر ان کے جذبات پر اوس پڑ گئی۔ اور انہوں نے پہلے سے سوچے ہوئے نقشے کے مطابق فیصلہ کر لیا کہ اپنے شوہر کے حقیقی بھائی سے دل لگائیں گی۔ چنانچہ بہت جلد ہی اس کا موقع آ گیا۔ شوہر صاحب حصولِ تعلیم کے لیے ولایت چلے گئے اور ان کے پیچھے بیوی نے شوہر کی اور بھائی نے بھائی کی خوب دل کھول کر اور مزے لے لے کر خیانت کی۔ مصنّف نے اس کارنامے کو خود اس مجرمہ کے قلم سے لکھا ہے، وہ اپنی سہیلی کو جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے، اپنے تمام کرتوت آپ اپنے قلم سے لکھ کر بھیجتی ہے، اور وہ تمام مراحل پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے جن سے گزر کر دیور اور بھاوج کی یہ آشنائی آخری مرحلے تک پہنچی۔ قلب اور جسم کی جتنی کیفیات صنفی اختلاط کی حالت میں واقع ہو سکتی ہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی بیان کرنے سے وہ نہیں چوکتی۔ بس اتنی کسر رہ گئی ہے کہ فعلِ مباشرت کی تصویر نہیں کھینچی گئی۔ شاید اس کوتاہی میں بھی یہ بات مدّنظر ہوگی کہ ناظرین و ناظرات کا تخیل تھوڑی سی زحمت اٹھا کر خود ہی اس کی خانہ پری کر لے۔

اس نئے ادب کا اگر فرانس کے اُس ادب سے مقابلہ کیا جائے جس کے چند نمونے ہم نے اس سے پہلے پیش کیے ہیں تو صاف نظر آئے گا کہ یہ قافلہ اسی راستے سے اسی منزل کی طرف جا رہا ہے، اسی نظامِ زندگی کے لیے ذہنوں کو نظری اور اخلاقی حیثیت سے تیار کیا جا رہا ہے، اور عنانِ توجہ خاص طور پر عورتوں کی طرف منعطف ہے تاکہ ان کے اندر حیا کی ایک رمق بھی نہ چھوڑی جائے۔

تمدّنِ جدید

یہ فلسفۂ اخلاق اور نظریۂ زندگی میدان میں اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ سرمایہ دارانہ نظامِ تمدّن اور مغربی جمہوریت کے اصول بھی برسرِ کار آ گئے ہیں اور یہ تینوں طاقتیں مل جل کر زندگی کا وہی نقشہ بنا رہی ہیں جو مغرب میں بن چکا ہے۔ صنفیات پر بدترین قسم کا فحش لٹریچر شائع کیا جا رہا ہے جو مدرسوں اور کالجوں کے طالبین و طالبات تک کثرت سے پہنچتا ہے۔ عریاں تصویریں اور آبرو باختہ عورتوں کی شبیہیں ہر اخبار، ہر رسالے، ہر گھر اور ہر دکان کی زینت بن رہی

ہیں۔ گھر گھر اور بازار بازار گراموفون کے وہ ریکارڈ بج رہے ہیں جن میں نہایت رکیک اور گندے گیت بھرے جاتے ہیں، سینما کا سارا کاروبار جذباتِ شہوانی کی انگیخت پر چل رہا ہے، اور پردۂ سیمیں پر فحش کاری و بے حیائی کو ہر شام اتنا مزیّن بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ ہر لڑکی اور لڑکے کی نگاہ میں ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی زندگی اسوۂ حسنہ بن کر رہ جاتی ہے۔ ان شوق پرور اور تمنا آفریں کھیلوں کو دیکھ کر دونوں صنفوں کے نوجوان جب تماشا گاہ سے نکلتے ہیں تو ان کے بے چین ولولے ہر طرف عشق اور رومان کے مواقع ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ یہ سب سرمایہ دارانہ انتفاع کی مختلف شکلیں ہیں۔ اسی سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی بدولت بڑے شہروں میں وہ حالات تیزی کے ساتھ پیدا ہوتے چلے جارہے ہیں جن میں عورتوں کے لیے اپنی روزی آپ کمانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور اسی ظالمانہ نظام کی مدد پر منعِ حمل کا پروپیگنڈہ اپنی دواؤں اور اپنے آلات کے ساتھ میدان میں آ گیا ہے۔

جدید جمہوری نظام نے جس کی برکات زیادہ تر انگلستان اور فرانس کے توسط سے مشرقی ممالک تک پہنچی ہیں، ایک طرف عورتوں کے لیے سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں کے راستے کھول دیے ہیں، دوسری طرف ایسے ادارات قائم کیے ہیں، جن میں عورتوں اور مردوں کے خلط ملط ہونے کی صورتیں لازماً پیدا ہوتی ہیں، اور تیسری طرف قانون کی بندشیں اتنی ڈھیلی کر دی ہیں کہ فواحش کا اظہار ہی نہیں بلکہ عملی ارتکاب بھی اکثر و بیشتر حالات میں جرم نہیں ہے۔

اِن حالات میں جو لوگ پورے انشراحِ قلب کے ساتھ زندگی کے اس راستے پر جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں اُن کے اخلاقیات اور ان کی معاشرت میں قریب قریب مکمل انقلاب واقع ہو گیا ہے۔ اُن کی خواتین اب ایسے لباسوں میں نکل رہی ہیں کہ ہر عورت پر فلم ایکٹرس کا دھوکا ہوتا ہے۔ اُن کے اندر پوری بیبا کی پائی جاتی ہے، بلکہ لباس کی عریانی، رنگوں کی شوخی، بناؤ سنگھار کے اہتمام اور ایک ایک ادا سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صنفی مقناطیس بننے کے سوا کوئی دوسرا مقصد ان خواتین کے پیشِ نظر نہیں ہے۔ حیا کا یہ عالم ہے کہ غسل کا لباس پہن کر مردوں کے ساتھ نہانا، حتّٰی کہ اس حالت میں اپنے فوٹو کھنچوانا اور اخبارات میں شائع کرا دینا بھی اس طبقہ کی کسی شریف خاتون کے لیے موجبِ شرم نہیں ہے۔ بلکہ شرم کا سوال وہاں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ جدید اخلاقی تصورات کے لحاظ سے انسانی جسم کے سب حصّے یکساں ہیں۔ اگر ہاتھ کی ہتھیلی اور پاؤں کے

تلوے کو کھولا جاسکتا ہے تو آخر کنجِ ران اور بُنِ پستان ہی کو کھول دینے میں کیا مضائقہ ہے؟ زندگی کا لطف جس کے مَظاہر کا مجموعی نام آرٹ ہے، ان لوگوں کے نزدیک ہر اخلاقی قید سے بالاتر، بلکہ بجائے خود معیارِ اخلاق ہے، اسی بنا پر باپ اور بھائی اس وقت فخر و مسرّت کے مارے پھولے نہیں سماتے جب ان کی آنکھوں کے سامنے کنواری بیٹی اور بہن اسٹیج پر موسیقی اور رقص اور معشوقانہ اداکاری کے کمالات دکھا کر سینکڑوں پرجوش ناظرین و سامعین سے داد تحسین حاصل کرتی ہے۔ مادّی کامیابی جس کا دوسرا نام مقصدِ زندگی ہے، ان کی رائے میں ہر اس ممکن چیز سے زیادہ قیمتی ہے جسے قربان کر کے یہ شے حاصل کی جاسکتی ہو۔ جس لڑکی نے اس گوہرِ مقصود کی حصول کی قابلیت اور سوسائٹی میں مقبول ہونے کی لیاقت بہم پہنچالی اس نے اگر عصمت کھودی تو گویا کچھ بھی نہ کھویا، بلکہ سب کچھ پالیا۔ اسی بنا پر یہ بات کسی طرح ان کی سمجھ میں آتی ہی نہیں کہ کسی لڑکی کا لڑکوں کے ساتھ مدرسے یا کالج میں پڑھنا، یا عالمِ جوانی میں تنہا حصولِ تعلیم کے لیے یورپ جانا آخر کیوں قابلِ اعتراض ہو۔

مستغربین سے فیصلہ

یہ ہیں وہ لوگ جو پردے پر سب سے زیادہ اعتراض کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ پردہ ایک ایسی حقیر بلکہ بدیہی البطلان چیز ہے کہ اس کی تضحیک کر دینا اور پھبتیاں کس دینا ہی اس کی تردید کے لیے کافی دلیل ہے۔ لیکن یہ رویہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص انسانی چہرے پر سرے سے ناک کی ضرورت ہی کا قائل نہ ہو، اور اس بنا پر وہ ہر اس شخص کا مذاق اڑانا شروع کر دے جس کے چہرے پر اسے ناک نظر آئے۔ اس قسم کی جاہلانہ باتوں سے صرف جاہل ہی مرعوب ہوسکتے ہیں۔ اُن کو، اگر اُن کے اندر کوئی معقولیت موجود ہے، یہ سمجھنا چاہیے کہ ہمارے اور ان کے درمیان دراصل قدروں کا بنیادی اختلاف ہے، جن چیزوں کو ہم قیمتی سمجھتے ہیں وہ ان کے نزدیک بے قیمت ہیں۔ لہٰذا اپنے معیارِ قدر کے لحاظ سے جس طرزِ عمل کو ہم ضروری سمجھتے ہیں وہ لامحالہ ان کی نگاہ میں قطعاً غیر ضروری بلکہ مہمل ٹھیرنا ہی چاہیے۔ مگر بنیادی اختلاف کی صورت میں وہ صرف ایک خفیف العقل آدمی ہوسکتا ہے جو اصل بنائے اختلاف پر گفتگو کرنے کے بجائے فروع پر حملہ شروع کر دے۔ انسانی قدروں کے تعین میں فیصلہ کن چیز اگر کوئی ہے تو وہ قوانینِ فطرت

ہیں۔ قوانینِ فطرت کے لحاظ سے انسان کی ساخت جس چیز کی مقتضی ہو، اور جس چیز میں انسان کی صلاح وفلاح ہو، وہی دراصل قدر کی مستحق ہے۔ آؤ اس معیار پر جانچ کر دیکھ لیں کہ قدروں کے اختلاف میں ہم راستی پر ہیں یا تم ہو۔ علمی دلائل جو کچھ تمہارے پاس ہیں انہیں لے آؤ۔ اور جو دلائل ہم رکھتے ہیں انہیں ہم پیش کرتے ہیں۔ پھر راستباز اور ذی عقل انسانوں کی طرح دیکھو کہ وزن کس طرف ہے۔ اس طریقے سے اگر ہم اپنے معیارِ قدر کو صحیح ثابت کر دیں تو تمہیں اختیار ہے، چاہے ان قدروں کو قبول کرو جو خالص عقل اور علم پر مبنی ہیں۔ چاہے انہی قدروں کے پیچھے پڑے رہو جنہیں مجرّد نفسانی رجحان کی بنا پر تم نے پسند کیا ہے۔ مگر اس دوسری صورت میں تمہاری اپنی پوزیشن اس قدر کمزور ہو جائے گی کہ ہمارے طرزِ عمل کی تضحیک کرنے کے بجائے تم خود تضحیک کے مستحق بن کر رہ جاؤ گے۔

دوسرا گروہ

اس کے بعد ہمارے سامنے دوسرا گروہ آتا ہے۔ پہلے گروہ میں تو غیر مسلم اور نام نہاد مسلمان، دونوں قسم کے لوگ شامل ہیں۔ مگر یہ دوسرا گروہ تمام مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ان لوگوں میں آج کل نیم حجاب اور نیم بے حجابی کی ایک عجیب معجون مرکب استعمال کی جا رہی ہے یہ مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذَالِکَ لَآاِلٰی ھٰؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰؤُلَآءِ کے صحیح مصداق ہیں۔ ایک طرف تو یہ اپنے اندر اسلامی جذبات رکھتے ہیں۔ اخلاق، تہذیب، شرافت اور حسنِ سیرت کے ان معیاروں کو مانتے ہیں جن کو اسلام نے پیش کیا ہے۔ اپنی عورتوں کو حیا اور عصمت کے زیوروں سے آراستہ اور اپنے گھروں کو اخلاقی نجاستوں سے پاک رکھنے کے خواہش مند ہیں، اور ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، جو مغربی تمدن اور معاشرت کے اصولوں کی پیروی سے رونما ہوئے ہیں اور ہونے چاہییں۔ مگر دوسری طرف اسلامی نظمِ معاشرت کے اصول وقوانین کو توڑ کر کچھ رُکتے، کچھ جھجکتے اسی راستہ کی طرف اپنی بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں کو لیے چلے جا رہے ہیں جو مغربی تہذیب کا راستہ ہے۔ یہ لوگ اس غلط فہمی میں ہیں کہ آدھے مغربی اور آدھے اسلامی طریقوں کو جمع کر کے یہ دونوں تہذیبوں کے فوائد ومنافع اکٹھے کر لیں گے۔ یعنی ان کے گھروں میں اسلامی اخلاق بھی محفوظ رہیں گے۔ ان کی خاندانی زندگی کا نظم بھی برقرار رہے گا۔ اور اس کے ساتھ ان کی

معاشرت اپنے اندر مغربی معاشرت کی برائیاں نہیں، بلکہ صرف اس کی دل فریبیاں، اس کی لذتیں اور اس کی مادی منفعتیں جمع کرلے گی۔ لیکن اول تو دو مختلف الاصل اور مختلف المقصد تہذیبوں کی آدھی آدھی شاخیں کاٹ کر پیوند لگانا ہی درست نہیں۔ کیوں کہ اس طرح کے بے جوڑ امتزاج سے دونوں کے فوائد جمع ہونے کے بجائے دونوں کے نقصانات جمع ہو جانا زیادہ قریب از قیاس ہے۔ دوسرے یہ بھی خلافِ عقل اور خلافِ فطرت ہے کہ ایک مرتبہ اسلام کے مضبوط اخلاقی نظام کی بندشیں ڈھیلی کرنے اور نفوس کو قانون شکنی سے لذّت آشنا کر دینے کے بعد آپ اس سلسلہ کو اُسی حد پر روک رکھیں گے جس کو آپ نے خالی از مضرّت سمجھ رکھا ہے۔ یہ نیم عریاں لباسوں کا رواج، یہ زینت و آرائش کا شوق، یہ دوستوں کی محفلوں میں بے باکی کے ابتدائی سبق، یہ سینما اور برہنہ تصویروں اور عشقی افسانوں سے بڑھتی ہوئی دلچسپی، یہ مغربی ڈھنگ پر لڑکیوں کی تعلیم بہت ممکن ہے کہ اپنا فوری اثر نہ دکھائے، بہت ممکن ہے کہ موجودہ نسل اس کی مضرتوں سے محفوظ رہ جائے۔ لیکن یہ سمجھنا بھی کہ آئندہ نسلیں بھی اس سے محفوظ رہیں گی، ایک صریح نادانی ہے۔ تمدّن اور معاشرت میں ہر غلط طریقے کی ابتدا بہت معصوم ہوتی ہے۔ مگر ایک نسل سے دوسری نسل اور دوسری سے تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے وہی چھوٹی سی ابتدا ایک خوفناک غلطی بن جاتی ہے۔ خود یورپ اور امریکہ میں بھی جن غلط بنیادوں پر معاشرت کی تنظیم جدید کی گئی تھی، اس کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہو گئے تھے، بلکہ اس کے پورے پورے نتائج اب تیسری اور چوتھی پشت میں ظاہر ہوئے ہیں۔ پس یہ مغربی اور اسلامی طریقوں کا امتزاج اور یہ نیم بے حجابی دراصل کوئی مستقل اور پائدار چیز نہیں ہے۔ دراصل اس کا فطری رجحان انتہائی مغربیت کی طرف ہے اور جو لوگ اس طریقے پر چل رہے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ انہوں نے فی الحال اس سفر کی ابتدا کی ہے جس کی آخری منزل تک اگر وہ نہیں تو ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد پہنچ کر رہے گی۔

فیصلہ کن سوال

ایسی حالت میں قدم آگے بڑھانے سے پہلے ان لوگوں کو خوب غور و خوض کر کے ایک بنیادی سوال کا فیصلہ کر لینا چاہیے جو مختصراً حسب ذیل ہے:

''کیا آپ مغربی معاشرت کے ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہیں جو یورپ

اور امریکہ میں رونما ہو چکے ہیں، اور جو اس طرزِ معاشرت کے طبعی اور یقینی نتائج ہیں؟ کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں کہ آپ کی سوسائٹی میں بھی وہی ہیجان انگیز اور شہوانی ماحول پیدا ہو؟ آپ کی قوم میں بھی اسی طرح بے حیائی، بے عصمتی اور فواحش کی کثرت ہو؟ امراضِ خبیثہ کی وبائیں پھیلیں؟ خاندان اور گھر کا نظام درہم برہم ہو جائے؟ طلاق اور تفریق کا زور ہو؟ نوجوان مرد اور عورتیں آزاد شہوت رانی کی خوگر ہو جائیں؟ منعِ حمل اور اسقاطِ حمل اور قتلِ اولاد سے نسلیں منقطع کی جائیں؟ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں حدِ اعتدال سے بڑھی ہوئی شہوانیت میں اپنی بہترین عملی قوتوں کو ضائع اور اپنی صحتوں کو برباد کریں؟ حتیٰ کہ کمسن بچّوں تک میں قبل از وقت صنفی میلانات پیدا ہونے لگیں اور اس سے ان کے دماغی اور جسمانی نشوونما میں ابتدا ہی سے فتور برپا ہو جایا کرے؟

اگر مادّی منفعتوں اور حسّی لذتوں کی خاطر آپ ان سب چیزوں کو گوارہ کرنے کے لیے تیار ہیں، تو بلا تأمّل مغربی راستے پر تشریف لے جایئے اور اسلام کا نام بھی زبان پر نہ لایئے۔ اس راستے پر جانے سے پہلے آپ کو اسلام سے قطع تعلق کا اعلان کرنا پڑیگا تا کہ آپ بعد میں اس نام کو استعمال کر کے کسی کو دھوکا نہ دے سکیں۔ اور آپ کی رسوائیاں اسلام اور مسلمانوں کے لیے موجب ننگ و عار نہ بن سکیں۔

لیکن اگر آپ ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اگر آپ کو ایک ایسے صالح اور پاکیزہ تمدن کی ضرورت ہے جس میں اخلاقِ فاضلہ اور ملکاتِ شریفہ پرورش پا سکیں جس میں انسان کو اپنی عقلی اور روحانی اور مادّی ترقی کے لیے ایک پرسکون ماحول مل سکے، جس میں عورت اور مرد بہیمی جذبات کی خلل اندازی سے محفوظ رہ کر اپنی بہترین استعداد کے مطابق اپنے اپنے تمدّنی فرائض انجام دے سکیں، جس میں تمدن کا سنگِ بنیاد یعنی خاندان پورے استحکام کے ساتھ قائم ہو، جس میں نسلیں محفوظ رہیں اور اختلاطِ انساب کا فتنہ برپا نہ ہو، جس میں انسان کی خانگی زندگی، اس کے لیے سکون و راحت کی جنت اور اس کی اولاد کے لیے مشفقانہ تربیت کا گھوارہ اور خاندان کے تمام افراد کے لیے اشتراکِ عمل اور امدادِ باہمی کی انجمن ہو، تو ان مقاصد کے لیے آپ کو مغربی راستہ کا رخ بھی نہ کرنا چاہیے کیوں کہ وہ بالکل مخالف سمت کو جا رہا ہے اور مغرب کی طرف چل کر مشرق کو پہنچ جانا عقلاً محال ہے۔ اگر فی الحقیقت آپ کے مقاصد یہی ہیں تو آپ کو اسلام کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

مگر اس راستہ پر قدم رکھنے سے پہلے آپ کو ان غیر معتدل مادّی منفعتوں اور حسّی لذتوں کی طلب اپنے دل سے نکالنی ہوگی جو مغربی تمدن کے دل فریب مَظاہر کو دیکھ کر پیدا ہوگئی ہے۔ ان نظریات اور تخیّلات سے بھی اپنے دماغ کو خالی کرنا ہوگا جو یورپ سے اس نے مستعار لے رکھے ہیں۔ ان تمام اصولوں اور مقصدوں کو بھی طلاق دینا پڑے گا جو مغربی تمدن و معاشرت سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اسلام اپنے الگ اصول اور مقاصد رکھتا ہے۔ اس کے اپنے مستقل عمرانی نظریات ہیں۔ اس نے ویسا ہی ایک نظامِ معاشرت وضع کیا ہے جیسا کہ اس کے مقاصد اور اس کے اصول اور اس کے عمرانی نظریات کا طبعی اقتضا ہے۔ پھر اس نظامِ معاشرت کا تحفظ وہ ایک خاص ڈسپلن اور ایک خاص ضابطے کے ذریعے سے کرتا ہے جس کے مقرر کرنے میں غایت درجہ کی حکمت اور نفسیاتِ انسانی کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، جس کے بغیر یہ نظامِ معاشرت اختلال و برہمی سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ افلاطون کی جمہوریت کی طرح کوئی خیالی اور وہمی نظام (Utopia) نہیں ہے بلکہ ساڑھے تیرہ صدیوں کے زبردست امتحان میں پورا اتر چکا ہے۔ اور اس طویل مدّت میں کسی ملک اور کسی قوم کے اندر بھی اس کے اثر سے ان خرابیوں کا عُشرِ عشیر بھی رونما نہیں ہوا ہے جو مغربی تمدّن کے اثر سے صرف ایک صدی کے اندر پیدا ہو چکی ہیں۔ پس اگر اس محکم اور آزمودہ نظامِ معاشرت سے آپ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو آپ کو اس کے ضابطہ اور اس کے ڈسپلن کی پوری پوری پابندی کرنی ہوگی، اور یہ حق آپ کو ہرگز حاصل نہ ہوگا کہ اپنی عقل سے نکالے ہوئے یا دوسروں سے سیکھے ہوئے نیم پختہ خیالات اور غیر آزمودہ طریقوں کو، جو اس نظامِ معاشرت کی طبیعت اور اس کے مزاج کے بالکل خلاف ہوں، خواہ مخواہ اس میں ٹھونسنے کی کوشش کریں۔

تیسرا گروہ چونکہ سفہا اور مُغَفَّلین پر مشتمل ہے جن میں خود سوچنے، سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے لہٰذا وہ کسی توجہ کا مستحق نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھیں۔

باب ۷:

قوانینِ فطرت

فطرت نے تمام انواع کی طرح انسان کو بھی ''زوجین''، یعنی دو ایسی صنفوں کی صورت میں پیدا کیا ہے جو ایک دوسرے کی جانب طبعی میلان رکھتی ہیں۔ مگر دوسری انواعِ حیوانی کا جس حد تک مطالعہ کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں اس صنفی تقسیم اور اس طبعی میلان کا مقصد محض بقائے نوع ہے۔ اسی لیے ان میں یہ میلان صرف اس حد تک رکھا گیا ہے جو ہر نوع کے بقا کے لیے ضروری ہے، اور اُن کی جبلّت میں ایسی قوتِ ضابطہ بھی نہیں ہے جو اسے کسی حد پر روک دے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کی طرف دائمی میلان رکھتے ہیں۔ ان کے اندر ایک دوسرے کی طرف جذب و انجذاب اور صنفی کشش کے غیر محدود اسباب فراہم کیے گئے ہیں۔ ان کے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا ایک زبردست داعیہ رکھا گیا ہے۔ اُن کے جسم کی ساخت، اور اُس کے تناسب اور اس کے رنگ و روپ اور اس کے لمس اور اس کے ایک ایک جز میں صنفِ مقابل کے لیے کشش پیدا کر دی گئی ہے، ان کی آواز، رفتار، انداز و ادا، ہر ایک چیز میں کھینچ لینے کی قوت بھر دی گئی ہے۔ اور گرد و پیش کی دنیا میں بھی بے شمار ایسے اسباب پھیلا دیے گئے ہیں جو دونوں کے داعیاتِ صنفی کو حرکت میں لاتے اور انہیں ایک دوسرے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ہوا کی سرسراہٹ، پانی کی روانی، سبزہ کا رنگ، پھولوں کی خوشبو، پرندوں کے چہچہے، فضا کی گھٹائیں، شبِ ماہ کی لطافتیں، غرض جمالِ فطرت کا کوئی مظہر، اور حسنِ کائنات کا کوئی جلوہ ایسا نہیں ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس تحریک کا سبب نہ بنتا ہو۔

پھر انسان کے نظامِ جسمانی کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں طاقت کا جو

زبردست خزانہ رکھا گیا ہے وہ بیک وقت قوتِ حیات اور قوتِ عمل بھی ہے، اور صنفی تعلّق کی قوت بھی۔ وہی غدود (Glands) جو اس کے اعضا کو جیون رس (Harmon) بہم پہنچاتے ہیں، وہ اُس میں چستی، توانائی، ذہانت اور عمل کی طاقت پیدا کرتے ہیں، انہی کے سپرد یہ خدمت بھی کی گئی ہے کہ اس میں صنفی تعلق کی قوت پیدا کریں، اس قوت کو حرکت میں لانے والے جذبات کونشو و نما دیں، اُن جذبات کو ابھارنے کے لیے حسن اور روپ اور نکھار اور پھبن کے گونا گوں آلات بہم پہنچائیں، اور ان آلات سے متاثر ہونے کی قابلیت اُس کی آنکھوں اور اس کے کانوں اور اس کی شامّہ اور لامِسہ حتّٰی کہ اس کی قوتِ متخیّلہ تک میں فراہم کر دیں۔

قدرت کی یہی کارفرمائی انسان کے قوائے نفسانی میں بھی نظر آتی ہے۔ اس کے نفس میں جتنی محرک قوتیں پائی جاتی ہیں ان سب کا رشتہ دو زبردست داعیوں سے ملتا ہے۔ ایک وہ داعیہ جو اُسے خود اپنے وجود کی حفاظت اور اپنی ذات کی خدمت پر ابھارتا ہے۔ دوسرا داعیہ جو اس کو اپنے مقابل کی صنف سے تعلق پر مجبور کرتا ہے۔ شباب کے زمانے میں جب کہ انسان کی عملی قوتیں اپنے پورے عروج پر ہوتی ہیں، یہ دوسرا داعیہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ بسا اوقات پہلے داعیہ کو بھی دبا لیتا ہے اور اس کے اثر سے انسان اس قدر مغلوب ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی جان تک دے دینے اور اپنے آپ کو جانتے بوجھتے ہلاکت میں ڈال دینے میں تأمّل نہیں ہوتا۔

تمدّن کی تخلیق میں صنفی کشش کا اثر

یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ کیا محض بقائے نوع کے لیے؟ نہیں۔ کیوں کہ نوعِ انسانی کو باقی رکھنے کے لیے اس قدر تناسل کی بھی ضرورت نہیں ہے جس قدر مچھلی اور بکری اور ایسی ہی دوسری انواع کے لیے ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ فطرت نے ان سب انواع سے زیادہ صنفی میلان انسان میں رکھا ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ اسبابِ تحریک فراہم کیے ہیں؟ کیا یہ محض انسان کے لطف اور لذت کے لیے ہے؟ یہ بھی نہیں۔ فطرت نے کہیں بھی لطف اور لذت کو مقصود بالذات نہیں بنایا ہے۔ وہ تو کسی بڑے مقصد کی خدمت پر انسان اور حیوان کو مجبور کرنے کے لیے لطف اور لذت کو محض چاشنی کے طور پر لگا دیتی ہے تا کہ وہ اس خدمت کو غیر کا نہیں بلکہ اپنا کام سمجھ کر انجام دیں۔

اب غور کیجیے کہ اس معاملے میں کون سا بڑا مقصد فطرت کے پیشِ نظر ہے؟ آپ جتنا غور کریں گے کوئی اور وجہ اس کے سوا سمجھ میں نہ آئے گی کہ فطرت، دوسری تمام انواع کے بخلاف نوعِ انسانی کو متمدن بنانا چاہتی ہے۔

اسی لیے انسان کے قلب میں صنفی محبت اور عشق کا وہ داعیہ رکھا گیا ہے جو محض جسمانی اتصال اور فعلِ تناسل ہی کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ ایک دائمی معیت اور قلبی وابستگی اور روحانی لگاؤ کا مطالبہ کرتا ہے۔

اسی لیے انسان میں صنفی میلان اس کی واقعی قوتِ مباشرت سے بہت زیادہ رکھا گیا ہے۔ اس میں جتنی خواہش اور صنفی کشش رکھی گئی ہے اگر اسی نسبت سے، بلکہ ایک اور دس کی نسبت سے بھی وہ فعل تناسل کا ارتکاب کرے تو اس کی صحت جواب دے دے، اور عمرِ طبعی کو پہنچنے سے پہلے ہی اس کی جسمانی قوتیں ختم ہو جائیں۔ یہ بات اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ انسان میں صنفی کشش کی زیادتی کا ہونا اس لیے نہیں ہے کہ وہ تمام حیوانات سے بڑھ کر صنفی عمل کرے، بلکہ اس سے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرنا اور اُن کے باہمی تعلق میں استمرار و استقلال پیدا کرنا ہے۔

اسی لیے عورت کی فطرت میں صنفی کشش اور صنفی خواہش کے ساتھ ساتھ شرم و حیا اور تمانع اور فرار اور رکاوٹ کا مادہ رکھا گیا ہے جو کم و بیش ہر عورت میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرار اور منع کی کیفیت اگر چہ دوسرے حیوانات کے اناث میں بھی نظر آتی ہے مگر انسان کی صنفِ اناث میں اس کی قوت و کمیت بہت زیادہ ہے۔ اور اس کو جذبۂ شرم و حیا کے ذریعے سے اور زیادہ شدید کر دیا گیا ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں صنفی مقناطیسیت کا مقصد ایک مستقل وابستگی ہے، نہ یہ کہ ہر صنفی کشش ایک صنفی عمل پر منتج ہو۔

اسی لیے انسان کے بچّے کو تمام حیوانات کے بچّوں سے زیادہ کمزور اور بے بس پیدا کیا گیا ہے۔ بخلاف دوسرے حیوانات کے، انسان کا بچّہ کئی سال تک ماں باپ کی حفاظت اور تربیت کا محتاج ہوتا ہے اور اس میں اپنے آپ کو سنبھالنے اور اپنی مدد آپ کرنے کی قابلیت بہت

دیر میں پیدا ہوتی ہے، اس سے بھی یہ مقصود ہے کہ عورت اور مرد کا تعلق محض تعلقِ صنفی کی حد تک نہ رہے بلکہ اس تعلق کا نتیجہ ان کو باہمی ارتباط و تعاون پر مجبور کر دے۔

اسی لیے انسان کے دل میں اولاد کی محبت تمام حیوانات سے زیادہ رکھی گئی ہے۔ حیوانات ایک قلیل مدت تک اپنے بچّوں کی پرورش کرنے کے بعد اُن سے الگ ہو جاتے ہیں پھر ان میں کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، بلکہ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں۔ بخلاف اس کے انسان ابتدائی پرورش کا زمانہ گزر جانے کے بعد بھی اولاد کی محبت میں گرفتار رہتا ہے۔ حتّٰی کہ یہ محبت اولاد کی اولاد تک منتقل ہوتی ہے، اور انسان کی خود غرض حیوانیت اس محبت کے اثر سے اس درجہ مغلوب ہو جاتی ہے کہ وہ جو کچھ اپنی ذات کے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ اپنی اولاد کے لیے چاہتا ہے۔ اور اس کے دل میں اندر سے یہ امنگ پیدا ہوتی ہے کہ اپنی حدِ امکان تک اولاد کے لیے بہتر سے بہتر اسبابِ زندگی بہم پہنچائے اور اپنی محنتوں کے نتائج اُن کے لیے چھوڑ جائے اس شدید جذبۂ محبت کی تخلیق سے فطرت کا مقصد صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عورت اور مرد کے صنفی تعلق کو ایک دائمی رابطہ میں تبدیل کر دے۔ پھر اس دائمی رابطہ کو ایک خاندان کی ترکیب کا ذریعہ بنائے، پھر خونی رشتوں کی محبت کا سلسلہ بہت سے خاندانوں کو مصاہرت کے تعلق سے مربوط کرتا چلا جائے پھر محبتوں اور محبوبوں کا اشتراک اُن کے درمیان تعاون اور معاملت کا تعلق پیدا کر دے اور اس طرح ایک معاشرہ اور ایک نظامِ تمدّن وجود میں آجائے۔

تمدّن کا بنیادی مسئلہ

اس سے معلوم ہوا کہ یہ صنفی میلان جو انسانی جسم کے ریشے ریشے اور اس کے قلب و روح کے گوشے گوشے میں رکھا گیا ہے، اور جس کی مدد کے لیے بڑے وسیع پیمانہ پر کائنات کے چپّے چپّے میں اسباب و محرکات فراہم کیے گئے ہیں۔ اس کا مقصد انسان کی انفرادیت کو اجتماعیت کی طرف مائل کرنا ہے۔ فطرت نے اس میلان کو تمدّنِ انسانی کی اصل قوتِ محرکہ بنایا ہے۔ اس میلان و کشش کے ذریعے سے نوعِ انسانی کی دو صنفوں میں وابستگی پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر اس وابستگی سے اجتماعی زندگی (Social Life) کا آغاز ہوتا ہے۔

جب یہ امر متحقق ہو گیا، تو یہ بات بھی آپ سے آپ ظاہر ہو گئی کہ عورت اور مرد کے تعلق کا مسئلہ دراصل تمدّن کا بنیادی مسئلہ ہے اور اسی کے صحیح حل پر تمدن کی صلاح وفساد اور اس کی بہتری و بدتری اور اس کے استحکام وضعف کا انحصار ہے۔ نوعِ انسانی کے اِن دونوں حصّوں میں ایک تعلق حیوانی (یا بالفاظِ دیگر خالص صنفی اور سراسر شہوانی) ہے جس کا مقصود بقائے نوع کے سوا کچھ نہیں۔ اور دوسرا تعلق انسانی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں مل کر مشترک اغراض کے لیے اپنی اپنی استعداد اور اپنی اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق تعاون کریں۔ اس تعاون کے لیے ان کی صنفی محبت ایک واسطۂ اتصال کے طور پر کام دیتی ہے، اور یہ حیوانی و انسانی عناصر دونوں مل کر بیک وقت اُن سے تمدّن کا کاروبار چلانے کی خدمت بھی لیتے ہیں۔ اور اس کاروبار کو جاری رکھنے کے لیے مزید افراد فراہم کرنے کی خدمت بھی۔ تمدّن کی صلاح وفساد کا مدار اس پر ہے کہ ان دونوں عناصر کا امتزاج نہایت متناسب اور معتدل ہو۔

مدنیّتِ صالحہ کے لوازم

آیئے اب ہم اس مسئلے کا تجزیہ کر کے معلوم کریں کہ ایک صالح تمدّن کے لیے عورت اور مرد کے حیوانی اور انسانی تعلق میں معتدل اور متناسب امتزاج کی صورت کیا ہے اور اس امتزاج پر بے اعتدالی کی کن کن صورتوں کے عارض ہونے سے تمدن فاسد ہو جاتا ہے۔

۱- میلان صنفی کی تعدیل

سب سے اہم اور مقدم سوال خود اس صنفی کشش اور میلان کا ہے کہ اس کو کس طرح قابو میں رکھا جائے۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ انسان کے اندر یہ میلان تمام حیوانات سے زیادہ طاقتور ہے۔ نہ صرف یہ کہ انسانی جسم کے اندر صنفی تحریک پیدا کرنے والی قوتیں زیادہ شدید ہیں بلکہ باہر بھی اس وسیع کائنات میں ہر طرف بے شمار صنفی محرکات پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ چیز جس کے لیے فطرت نے خود ہی اتنے انتظامات کر رکھے ہیں۔ اگر انسان بھی اپنی توجہ اور قوتِ ایجاد سے کام لے کر اس کو بڑھانے اور ترقی دینے کے اسباب مہیا کرنے لگے اور ایسا طرزِ تمدّن اختیار کرے جس میں اس کی صنفی پیاس بڑھتی چلی جائے، اور پھر اس پیاس کو بجھانے کی آسانیاں بھی پیدا کی

جاتی رہیں، تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ حدِ مطلوب سے بہت زیادہ متجاوز ہوجائے گی۔ انسان کا حیوانی عنصر اس کے انسانی عنصر پر پوری طرح غالب ہوجائے گا۔ اور یہ حیوانیت اس کی انسانیت اور اس کے تمدّن دونوں کو کھا جائے گی۔

صنفی تعلق اور اس کے مبادی اور محرکات میں سے ایک ایک چیز کو فطرت نے لذیذ بنایا ہے مگر جیسا کہ پہلے ہم اشارہ کر چکے ہیں، فطرت نے یہ لذت کی چاٹ محض اپنے مقصد یعنی تعمیرِ تمدن کے لیے لگائی ہے۔ اس چاٹ کا حد سے بڑھ جانا اور اسی میں انسان کا منہمک ہوجانا نہ صرف تمدن بلکہ خود انسان کی بھی تخریب و ہلاکت کا موجب ہوسکتا ہے، ہو رہا ہے اور بارہا ہو چکا ہے۔ جو قومیں تباہ ہو چکی ہیں ان کے آثار اور ان کی تاریخ کو دیکھیے، شہوانیت اُن میں حد سے متجاوز ہو چکی تھی۔ ان کے لٹریچر اسی قسم کے ہیجان انگیز مضامین سے لبریز پائے جاتے ہیں۔ اُن کے تخیلات، ان کے افسانے، ان کے اشعار، ان کی تصویریں، ان کے مجسّمے، ان کے عبادت خانے، ان کے محلّات، سب کے سب اس پر شاہد ہیں۔ جو قومیں اب تباہی کی طرف جارہی ہیں ان کے حالات بھی دیکھ لیجیے۔ وہ اپنی شہوانیت کو آرٹ اور ادبِ لطیف اور ذوقِ جمال اور ایسے کتنے ہی خوشنما اور معصوم ناموں سے موسوم کرلیں، مگر تعبیر کے بدل جانے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ یہ کیا چیز ہے کہ سوسائٹی میں عورت کو عورتوں سے زیادہ مرد کی صحبت اور مرد کو مردوں سے زیادہ عورتوں کی معیت مرغوب ہے؟ یہ کیوں ہے کہ عورتوں اور مردوں میں تزئین و آرائش کا ذوق بڑھتا چلا جارہا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ مخلوط سوسائٹی میں عورت کا جسم لباس سے باہر نکلا پڑتا ہے؟ وہ کون سی شے ہے جس کے سبب سے عورت اپنے جسم کے ایک ایک حصے کو کھول کھول کر پیش کر رہی ہے اور مردوں کی طرف سے هَلْ مِنْ مَّزِيْد کا تقاضا ہے؟ اس کی کیا علت ہے کہ برہنہ تصویریں، ننگے مجسمے اور عریاں ناچ سب سے زیادہ پسند کیے جاتے ہیں؟ اس کا کیا سبب ہے کہ سینما میں اس وقت تک لطف ہی نہیں آتا جب تک عشق و محبت کی چاشنی نہ ہو اور اس پر صنفی تعلقات کے بہت سے قولی اور فعلی مبادی کا اضافہ نہ کیا جائے؟

یہ اور ایسے ہی بہت سے مظاہر اگر شہوانیت کے مظاہر نہیں تو کس چیز کے ہیں؟ جس تمدّن میں ایسا غیر معتدل شہوانی ماحول پیدا ہوجائے اس کا انجام تباہی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔

ایسے ماحول میں صنفی میلان کی شدت اور پیہم ہیجان اور مسلسل تحریک کی وجہ سے ناگزیر ہے کہ نسلیں کمزور ہو جائیں، جسمانی اور عقلی قوتوں کا نشوونما بگڑ جائے، قوائے ذہنی پراگندہ ہو جائیں(۱)۔ فواحش کی کثرت ہو، امراضِ خبیثہ کی وبائیں پھیلیں۔ منعِ حمل اور اسقاطِ حمل اور قتلِ اطفال جیسی تحریکیں وجود میں آئیں، مرد اور عورت بہائم کی طرح ملنے لگیں، بلکہ فطرت نے ان کے اندر جو صنفی میلان تمام حیوانات سے بڑھ کر رکھا ہے، اس کو وہ مقاصدِ فطرت کے خلاف استعمال کریں اور اپنی بہیمیت میں تمام حیوانات سے بازی لے جائیں۔ حتّٰی کہ بندروں اور بکروں کو بھی مات کر دیں۔ لامحالہ ایسی شدید حیوانیت انسانی تمدن و تہذیب بلکہ خود انسانیت کو بھی غارت کر دے گی، اور جو لوگ اس میں مبتلا ہوں گے اُن کا اخلاقی انحطاط اُن کو ایسی پستی میں گرائے گا جہاں سے وہ پھر کبھی نہ اٹھ سکیں گے۔

ایسا ہی انجام اس تمدن کا بھی ہوگا جو تفریط کا پہلو اختیار کرے گا۔ جس طرح صنفی میلان کا حدِ اعتدال سے بڑھ جانا مضر ہے۔ اسی طرح اس کو حد سے زیادہ دبانا اور کچل دینا بھی مضر ہے۔ جو نظامِ تمدّن انسان کو سنیاس اور برہمچریہ اور رہبانیت کی طرف لے جانا چاہتا ہے، وہ فطرت سے لڑتا ہے اور فطرت اپنے مدمقابل سے کبھی شکست نہیں کھاتی بلکہ خود اسی کو توڑ کر رکھ

---

(۱) ایک ڈاکٹر لکھتا ہے: بلوغ کے آغاز کا زمانہ بڑے اہم تغیرات کے ساتھ آتا ہے۔ نفس اور جسم کے مختلف افعال میں اس وقت ایک انقلابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور تمام حیثیتوں سے عام نشوونما ہوتا ہے۔ آدمی کو اس وقت ان تغیرات کو برداشت کرنے اور اس نشوونما کو حاصل کرنے کے لیے اپنی تمام قوت درکار ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے بیماریوں کے مقابلے کی طاقت اس زمانہ میں آدمی کے اندر بہت کم ہوتی ہے۔ عام نشوونما، اعضا کی ترقی اور نفسی و جسمانی تغیرات کا یہ طویل عمل جس کے بعد آدمی بچّہ سے جوان بنتا ہے ایک ایسا تھکا دینے والا عمل ہے جس کے دوران میں طبیعت انتہائی جدوجہد میں مصروف ہوتی ہے۔ اس حالت میں اس پر کوئی غیر معمولی بار ڈالنا جائز نہیں۔ خصوصاً صنفی عمل اور شہوانی ہیجان تو اس کے لیے تباہ کن ہے۔

ایک مشہور جرمن عالمِ نفسیات لکھتا ہے: ”صنفی اعضا کا تعلق چوں کہ لذّت اور جوش کے غیر معمولی ہیجانات (Sensations) کے ساتھ ہے۔ اس وجہ سے یہ اعضا ہماری ذہنی قوتوں میں سے ایک بڑا حصہ اپنی طرف جذب کر لینے یا بالفاظ دیگر ان پر ڈاکہ مار دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ اگر انہیں غلبہ حاصل ہو جائے تو یہ آدمی کو تمدن کی خدمت کے بجائے انفرادی لطف اندوزی میں منہمک کر دیں۔ یہ طاقتور پوزیشن جو اُن کو جسمِ انسانی میں حاصل ہے، آدمی کی صنفی زندگی کو ذرا سی غفلت میں حالتِ اعتدال سے بے اعتدالی کی طرف لے جا کر مفید سے مضر بنا سکتی ہے۔ تعلیم کا اہم ترین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس خطرے کی روک تھام کی جائے۔“

دیتی ہے۔ خالص رہبانیت کا تصور تو ظاہر ہے کہ کسی تمدن کی بنیاد بن ہی نہیں سکتا، کیوں کہ وہ دراصل تمدن وتہذیب کی نفی ہے۔ البتہ راہبانہ تصورات کو دلوں میں راسخ کر کے نظامِ تمدّن میں ایک ایسی غیر صنفی ماحول ضرور پیدا کیا جاسکتا ہے، جس میں صنفی تعلق کو بذاتِ خود ایک ذلیل، قابل نفرت اور گھناؤنی چیز سمجھا جائے۔ اس سے پرہیز کرنے کو معیارِ اخلاق قرار دیا جائے، اور ہر ممکن طریقے سے اس میلان کو دبانے کی کوشش کی جائے، مگر صنفی میلان کا دبنا دراصل انسانیت کا دبنا ہے۔ وہ اکیلا نہیں دبے گا بلکہ اپنے ساتھ انسان کی ذہانت، اور قوتِ عمل، اور عقلی استعداد، اور حوصلہ وعزم، اور ہمت وشجاعت سب کو لے کر دب جائے گا، اس کے دبنے سے انسان کی ساری قوتیں ٹھٹھر کر رہ جائیں گی، اس کا خون سرد اور منجمد ہو کر رہ جائے گا۔ ان میں ابھرنے کی کوئی صلاحیت باقی نہ رہے گی۔ کیوں کہ انسان کی سب سے بڑی محرک طاقت یہی صنفی طاقت ہے۔

پس صنفی میلان کو افراط وتفریط سے روک کر توسط واعتدال کی حالت پر لانا اور اسے ایک مناسب ضابطے سے منضبط (Regulate) کرنا ایک صالح تمدّن کا اوّلین فریضہ ہے۔ اجتماعی زندگی کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ وہ ایک طرف غیر معتدل (Abnormal) ہیجان وتحریک کے ان تمام اسباب کو روک دے جن کو انسان خود اپنے ارادے اور اپنی لذّت پرستی سے پیدا کرتا ہے اور دوسری طرف فطری (Normal) ہیجانات کی تسکین وتشفی کے لیے ایسا راستہ کھول دے جو خود منشائے فطرت کے مطابق ہو۔

۲-خاندان کی تاسیس

اب یہ سوال خود بخود ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ فطرت کا منشا کیا ہے؟ کیا اس معاملے میں ہم کو بالکل تاریکی میں چھوڑ دیا گیا ہے کہ آنکھیں بند کر کے ہم جس چیز پر چاہیں ہاتھ رکھ دیں اور وہی فطرت کا منشا قرار پا جائے؟ یا نوامیس فطرت پر غور کرنے سے ہم منشاء فطرت تک پہنچ سکتے ہیں؟ شاید بہت سے لوگ صورتِ اول ہی کے قائل ہیں، اور اسی لیے وہ نوامیس فطرت پر نظر کیے بغیر ہی کیف ما اتفق جس چیز کو چاہتے ہیں، منشاء فطرت کہہ دیتے ہیں۔ لیکن ایک محقق جب حقیقت کی جستجو کے لیے نکلتا ہے تو چند ہی قدم چل کر اُسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا فطرت آپ ہی اپنے منشا کی طرف صاف انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہی ہے۔

یہ تو معلوم ہے کہ تمام انواعِ حیوانی کی طرح انسان کی بھی زوجین یعنی دوصنفوں کی صورت میں پیدا کرنے اور اُن کے درمیان صنفی کشش کی تخلیق کرنے سے فطرت کا اوّلین مقصد بقائے نوع ہے، لیکن انسان سے فطرت کا مطالبہ صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ وہ اس سے بڑھ کر کچھ دوسرے مطالبات بھی اس سے کرتی ہے اور بادنیٰ تامل ہمیں معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ مطالبات کیا ہیں اور کس نوعیت کے ہیں۔

سب سے پہلے جس چیز پر ہماری نظر پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام حیوانات کے برعکس انسان کا بچّہ نگہداشت اور پرورش کے لیے بہت زیادہ وقت، محنت اور توجہ مانگتا ہے اگر اس کو مجرد ایک حیوانی وجود ہی کی حیثیت سے لے لیا جائے، تب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی حیوانی ضروریات پوری کرنے، یعنی غذا حاصل کرنے اور اپنے نفس کی مدافعت کرنے کے قابل ہوتے ہوتے وہ کئی سال لے لیتا ہے، اور ابتدائی دو تین سال تک تو وہ اتنا بے بس ہوتا ہے کہ ماں کی پیہم توجہ کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ انسان خواہ وحشت کے کتنے ہی ابتدائی درجہ میں ہو، بہر حال نرا حیوان نہیں ہے، کسی نہ کسی مرتبہ کی مدنیّت بہر حال اس کی زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ اور اس مدنیّت کی وجہ سے پرورشِ اولاد کے فطری تقاضے پر لامحالہ دو اور تقاضوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ بچّہ کی پرورش میں اُن تمام تمدنی وسائل سے کام لیا جائے جو اس کے پرورش کرنے والے کو بہم پہنچ سکیں۔ دوسرے یہ کہ بچّے کو ایسی تربیت دی جائے کہ جس تمدنی ماحول میں وہ پیدا ہوا ہے وہاں تمدن کے کارخانے کو چلانے اور سابق کارکنوں کی جگہ لینے کے لیے وہ تیار ہو سکے۔

پھر تمدن جتنا زیادہ ترقی یافتہ اور اعلیٰ درجہ کا ہوتا جاتا ہے یہ دونوں تقاضے بھی اتنے ہی زیادہ بھاری اور بوجھل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک طرف پرورشِ اولاد کے ضروری وسائل ولوازم بڑھتے جاتے ہیں اور دوسری طرف تمدن نہ صرف اپنے قیام و بقا کے لیے اپنے مرتبے کے مطابق اچھے تعلیم و تربیت یافتہ کارکن مانگتا ہے، بلکہ اپنے نشو و ارتقاء کے لیے یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ ہر نسل پہلی نسل سے بہتر اٹھے، یعنی دوسرے الفاظ میں ہر بچّے کا نگہبان اس کو خود اپنے آپ سے بہتر بنانے کی کوشش کرے ـــــ انتہا درجے کا ایثار جو انسان سے جذبۂ خود پسندی تک کی قربانی مانگتا ہے۔

یہ ہے فطرتِ انسانی کے مطالبات اور ان مطالبات کی اوّلین مخاطب عورت ہے۔ مرد ایک ساعت کے لیے عورت سے مل کر ہمیشہ کے لیے اُس سے اور اس ملاقات کی ذمے داری سے الگ ہوسکتا ہے۔ لیکن عورت کو تو اس ملاقات کا قدرتی نتیجہ برسوں کے لیے بلکہ عمر بھر کے لیے پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ حمل قرار پا جانے کے بعد سے کم از کم پانچ برس تک تو یہ نتیجہ اس کا پیچھا کسی طرح چھوڑتا ہی نہیں۔ اور اگر تمدن کے پورے مطالبات ادا کرنے ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مزید پندرہ سال تک وہ عورت، جس نے ایک ساعت کے لیے مرد کی معیّت کا لطف اٹھایا تھا، اس کی ذمے داریوں کا بار سنبھالتی رہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مشترک فعل کی ذمے داری قبول کرنے کے لیے تنہا ایک فریق کس طرح آمادہ ہوسکتا ہے؟ جب تک عورت کو اپنے شریکِ کار کی بے وفائی کے خوف سے نجات نہ ملے، جب تک اسے اپنے بچّے کی پرورش کا پورا اطمینان نہ ہو جائے گا، جب تک اُسے خود اپنی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کے کام سے بھی ایک بڑی حد تک سبکدوش نہ کر دیا جائے، وہ اتنے بھاری کام کا بوجھ اٹھانے پر کیسے آمادہ ہو جائے گی؟ جس عورت کا کوئی قوّام (Protector, Provider) ؎ نہ ہو اس کے لیے تو حمل یقیناً ایک حادثہ، ایک مصیبت، بلکہ ایک خطرناک بلا ہے۔ جس سے چھٹکارا پانے کی خواہش اُس میں طبیعی طور پر پیدا ہونی ہی چاہیے۔ آخر وہ اسے خوش آمدید کس طرح کہہ سکتی ہے؟

لامحالہ یہ ضروری ہے ـــــ اگر نوع کا بقاء اور تمدّن کا قیام و ارتقاء ضروری ہے ـــــ کہ جو مرد جس عورت کو بار آور کرے وہی اس بار کو سنبھالنے میں اس کا شریک بھی ہو، مگر اس شرکت پر اسے راضی کیسے کیا جائے؟ وہ تو فطرتاً خود غرض واقع ہوا ہے۔ جہاں تک بقائے نوع کے طبعی فریضے کا تعلق ہے، اس کے حصے کا کام تو اسی ساعت پورا ہو جاتا ہے جب کہ وہ عورت کو بار آور کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ بار تنہا عورت کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ اور مرد سے وہ کسی طرح بھی چسپاں نہیں ہوتا۔ جہاں تک صنفی کشش کا تعلق ہے وہ بھی اسے مجبور نہیں کرتی کہ اسی عورت کے ساتھ وابستہ رہے۔ وہ چاہے تو اسے چھوڑ کر دوسری اور دوسری کو چھوڑ کر تیسری سے تعلق پیدا کر سکتا ہے اور ہر زمین میں بیج پھینکتا پھر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ معاملہ محض اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بخوشی اس بار کو سنبھالنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ آخر کون سی چیز اُسے مجبور کرنے والی ہے کہ وہ اپنی محنتوں کا پھل اس عورت اور اُس بچّے پر صرف کرے؟ کیوں وہ ایک

دوسری حسین دوشیزہ کو چھوڑ کر اس پیٹ پھولی عورت سے اپنا دل لگائے رکھے؟ کیوں وہ گوشت پوست کے ایک بیکار لوتھڑے کو خواہ مخواہ اپنے خرچ پر پالے؟ کیوں اس کی چیخوں سے اپنی نیند حرام کرے؟ کیوں اس چھوٹے سے شیطان کے ہاتھوں اپنا نقصان کرائے جو ہر چیز کو توڑتا پھوڑتا اور گھر بھر میں گندگی پھیلاتا پھرتا ہے۔ اور کسی کی سن کر نہیں دیتا؟

فطرت نے کسی حد تک اس مسئلہ کے حل کا خود بھی اہتمام کیا ہے، اُس نے عورت میں حُسن، شیرینی، دل لبھانے کی طاقت، اور محبت کے لیے ایثار و قربانی کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے تا کہ ان ہتھیاروں سے مرد کی خودغرضانہ انفرادیت پر فتح پائے اور اُسے اپنا اسیر بنا لے۔ اس نے بچّے کے اندر بھی ایک عجیب قوتِ تسخیر بھر دی ہے تا کہ وہ اپنی تکلیف دہ، برباد کن، پاجیانہ خصوصیت کے باوجود ماں باپ کو اپنے دامِ محبت میں گرفتار رکھے۔ مگر صرف یہی چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ بجائے خود ان کا زور انسان کو اپنے اخلاقی، فطری، تمدّنی، فرائض ادا کرنے کے لیے برسوں نقصان، اذیّت اور قربانی برداشت کرنے پر مجبور کر سکے، آخر انسان کے ساتھ اس کا وہ ازلی دشمن شیطان بھی تو لگا ہوا ہے جو اسے فطرت کے راستے سے منحرف کرنے کی ہر وقت کوشش کرتا رہتا ہے۔ جس کی زنبیلِ عیّاری میں ہر زمانے اور ہر نسل کے لوگوں کو بہکانے کے لیے طرح طرح کی دلیلوں اور ترغیبات کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ بھرا ہوا ہے۔

یہ مذہب کا معجزہ ہے کہ وہ انسان کو — مرد اور عورت دونوں کو — نوع اور تمدّن کے لیے قربانی پر آمادہ کرتا ہے، اور اس خودغرض جانور کو آدمی بنا کر ایثار کے لیے تیار کر دیتا ہے۔ وہ خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء ہی تھے جنہوں نے فطرت کے منشا کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر عورت اور مرد کے درمیان تعلق اور تمدّنی تعاون کی صحیح صورت، نکاح تجویز کی۔ انہی کی تعلیم و ہدایت سے دنیا کی ہر قوم اور روئے زمین کے ہر گوشے میں نکاح کا طریقہ جاری ہوا۔ انہی کے پھیلائے ہوئے اخلاقی اصولوں سے انسان کے اندر اتنی روحانی صلاحیت پیدا ہوئی کہ وہ اس خدمت کی تکلیفیں اور نقصانات برداشت کرے۔ ورنہ حق یہ ہے کہ ماں اور باپ سے زیادہ بچّے کا دشمن اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ انہی کے قائم کیے ہوئے ضوابطِ معاشرت سے خاندانی نظام کی بنا پڑی۔ جس کی مضبوط گرفت لڑکیوں اور لڑکوں کو اس ذمے دارانہ تعلق اور اس اشتراکِ عمل پر مجبور کرتی ہے۔ ورنہ شباب کے حیوانی تقاضوں کا زور اتنا سخت ہوتا ہے کہ محض اخلاقی ذمے داری کا احساس کسی خارجی ڈسپلن

کے بغیر اُن کو آزاد شہوت رانی سے نہ روک سکتا تھا۔ شہوت کا جذبہ بجائے خود اجتماعیت کا دشمن (Anti-Social) ہے۔ یہ خودغرضی، انفرادیت اور انارکی کا میلان رکھنے والا جذبہ ہے۔ اس میں پائیداری نہیں، اس میں احساسِ ذمے داری نہیں، یہ محض وقتی لطف اندوزی کے لیے تحریک کرتا ہے۔ اس دیو کو مسخر کر کے اس سے اجتماعی زندگی کی ــــ اس زندگی کی جو صبر و ثبات، محنت و قربانی، ذمے داری اور پیہم جفاکشی چاہتی ہے ــــ خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں۔ وہ نکاح کا قانون اور خاندان کا نظام ہی ہے جو اس دیو کو شیشے میں اتار کر اُس سے شرارت اور بدنظمی کی ایجنسی چھین لیتا ہے اور اسے مرد و عورت کے اس لگاتار تعاون و اشتراکِ عمل کا ایجنٹ بنا دیتا ہے جو اجتماعی زندگی کی تعمیر کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کی تمدّنی زندگی ختم ہو جائے۔ انسان حیوان کی طرح رہنے لگیں، اور بالآخر نوعِ انسانی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے۔

پس صنفی میلان کو انارکی اور بے اعتدالی سے روک کر اس کے فطری مطالبات کی تشفی و تسکین کے لیے جو راستہ خود فطرت چاہتی ہے کہ کھولا جائے وہ صرف یہی ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کی صورت میں مستقل وابستگی ہو۔ اور اس وابستگی سے خاندانی نظام کی بنا پڑے۔ تمدّن کے وسیع کارخانے کو چلانے کے لیے جن پرزوں کی ضرورت ہے، وہ خاندان کی اسی چھوٹی کارگاہ میں تیار کیے جاتے ہیں۔ یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے جوان ہوتے ہی کارگاہ کے منتظمین کو خود بخود یہ فکر لگ جاتی ہے کہ حتّی الامکان اُن کے ایسے جوڑ لگائیں جو ایک دوسرے کے لیے زیادہ مناسب ہوں تاکہ ان کے ملاپ سے زیادہ سے زیادہ بہتر نسل پیدا ہو سکے۔ پھر اُن سے جو نسل نکلتی ہے، اس کارگاہ کا ہر کارکن اپنے دل کے سچے جذبہ سے کوشش کرتا ہے کہ اس کو جتنا بہتر بنا سکتا ہے بنائے۔ زمین پر اپنی زندگی کا پہلا لمحہ شروع کرتے ہی بچّہ کو خاندان کے دائرہ میں محبت، خبرگیری، حفاظت اور تربیت کا وہ ماحول ملتا ہے جو اس کے نشوونما کے لیے آبِ حیات کا حکم رکھتا ہے۔ درحقیقت خاندان ہی میں بچّے کو وہ لوگ مل سکتے ہیں جو اس سے نہ صرف محبت کرنے والے ہوں، بلکہ جو اپنے دل کی امنگ سے یہ چاہتے ہوں کہ بچّہ جس مرتبہ پر پیدا ہوا ہے اس سے اونچے مرتبے پر پہنچے۔

دنیا میں صرف ماں اور باپ ہی کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بچّے کو ہر لحاظ سے خود اپنے سے بہتر حالت میں اور اپنے سے بڑھا ہوا دیکھیں۔ اس طرح وہ بلا ارادہ غیر شعوری طور پر

آیندہ نسل کو موجودہ نسل سے بہتر بنانے اور انسانی ترقی کا راستہ ہموار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی اس کوشش میں خودغرضی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ اپنے لیے کچھ نہیں چاہتے، وہ بس اپنے بچّے کی فلاح چاہتے ہیں۔ اور اس کے ایک کامیاب اور عمدہ انسان بن کر اٹھنے ہی کو اپنی محنت کا کافی صلہ سمجھتے ہیں۔ ایسے مخلص کارکن (Labourers) اور ایسے بے غرض خادم (Workers) تم کو خاندان کی اس کارگاہ کے باہر کہاں ملیں گے، جو نوعِ انسانی کی بہتری کے لیے نہ صرف بلا معاوضہ محنت کریں، بلکہ اپنا وقت، اپنی آسائش، اپنی قوت و قابلیت اور اپنی محنت کی کمائی، سب کچھ اس خدمت میں صرف کریں؟ جو اس چیز پر اپنی ہر قیمتی شے قربان کرنے کے لیے تیار ہوں؟ جس کا پھل دوسرے کھانے والے ہیں؟ جو اپنی محنتوں کا صلہ بس اس کو سمجھیں کہ دوسروں کے لیے انہوں نے بہتر کارکن اور خادم فراہم کر دیے؟ کیا اس سے زیادہ پاکیزہ اور بلند ترین ادارہ انسانیت میں کوئی دوسرا بھی ہے؟

ہر سال نسلِ انسانی کو اپنے بقا کے لیے اور تمدّنِ انسانی کو اپنے تسلسل و ارتقاء کے لیے ایسے لاکھوں اور کروڑوں جوڑوں کی ضرورت ہے جو بخوشی و رضا اپنے آپ کو اس خدمت اور اس کی ذمے داریوں کے لیے پیش کریں۔ اور نکاح کر کے اس نوعیت کی مزید کارگاہوں کی بنا ڈالیں۔ یہ عظیم الشان کارخانہ جو دنیا میں چل رہا ہے، یہ اسی طرح چل اور بڑھ سکتا ہے کہ اس قسم کے رضاکار پیہم خدمت کے لیے اٹھتے رہیں۔ اور اس کارخانہ کے لیے کام کے آدمی فراہم کرتے رہیں۔ اگر نئی بھرتی نہ ہو، اور قدرتی اسباب سے پُرانے کارکن بیکار ہو کر ہٹتے جائیں تو کام کے آدمی کم اور کم تر ہوتے چلے جائیں گے۔ اور ایک دن یہ سازِ ہستی بالکل بے نوا ہو کر رہ جائے گا۔ ہر آدمی جو اس تمدّن کی مشین کو چلا رہا ہے اس کا فرض صرف یہی نہیں ہے کہ اپنے جیتے جی اس کو چلائے جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ اپنی جگہ لینے کے لیے اپنے ہی جیسے اشخاص مہیّا کرنے کی کوشش کرے۔

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو نکاح کی حیثیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ صنفی جذبات کی تسکین و تشفی کے لیے ایک ہی جائز صورت ہے، بلکہ دراصل یہ ایک اجتماعی فریضہ ہے، یہ فرد پر جماعت کا فطری حق ہے اور فرد کو اس بات کا اختیار ہرگز نہیں دیا جا سکتا کہ وہ نکاح کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ خود اپنے لیے محفوظ رکھے۔ جو لوگ بغیر کسی معقول وجہ کے نکاح سے انکار کرتے

ہیں وہ جماعت کے نکھٹو افراد (Parasites) بلکہ غدّار اور لٹیرے ہیں۔ ہر فرد جو زمین پر پیدا ہوا ہے، اس نے زندگی کا پہلا سانس لینے کے بعد سے جوانی کی عمر کو پہنچنے تک اس بے حد وحساب سرمایہ سے استفادہ کیا ہے جو پچھلی نسلوں نے فراہم کیا تھا، اُن کے قائم کیے ہوئے ادارات ہی کی بدولت اس کو زندہ رہنے، بڑھنے، پھلنے پھولنے اور آدمیت میں نشوونما پانے کا موقع ملا۔ اس دوران میں وہ لیتا ہی رہا، اس نے دیا کچھ نہیں۔ جماعت نے اس امید پر اس کی ناقص قوتوں کی تکمیل کی طرف لے جانے میں اپنا سرمایہ اور اپنی قوت صرف کی کہ جب وہ خود کچھ دینے کے قابل ہوگا، تو دے گا۔ اب اگر وہ بڑا ہو کر اپنے لیے شخصی آزادی اور خود مختاری کا مطالبہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں صرف اپنی خواہشات پوری کروں گا، مگر ان ذمے داریوں اور اُن فرائض کا بوجھ نہ اٹھاؤں گا، جو اُن خواہشات کے ساتھ وابستہ ہیں تو دراصل وہ جماعت کے ساتھ غداری اور دھوکے بازی کرتا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر لمحہ ایک ظلم اور بے انصافی ہے۔ جماعت میں اگر شعور موجود ہو تو وہ اس مجرم کو جنٹلمین، یا معزز لیڈی یا مقدس بزرگ سمجھنے کے بجائے اس نظر سے دیکھے جس سے وہ چوروں، ڈاکوؤں اور جعل سازوں کو دیکھتی ہے۔ ہم نے خواہ چاہا ہو یا نہ چاہا ہو، بہر طور ہم اس تمام سرمایہ اور ذخیرہ کے وارث ہوئے ہیں، جو ہم سے پہلے کی نسلوں نے چھوڑا ہے۔ اب ہم اس فیصلہ میں آزاد کیسے ہو سکتے ہیں کہ جس فطری قانون کے مطابق یہ ورثہ ہم تک پہنچا ہے اس کے منشاء کو پورا کریں یا نہ کریں؟ ایسی نسل تیار کریں یا نہ کریں جو نوعِ انسانی کے اس سرمایہ اور ذخیرہ کی وارث ہو؟ اس کو سنبھالنے کے لیے دوسرے آدمی اسی طرح تیار کریں یا نہ کریں جس طرح ہم خود تیار کیے گئے ہیں؟

۳۔ صنفی آوارگی کا سدّ باب

نکاح اور تاسیسِ خاندان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حصنِ نکاح سے باہر خواہشاتِ صنفی کی تسکین کا دروازہ سختی کے ساتھ بند کیا جائے۔ کیوں کہ اس کے بغیر فطرت کا وہ منشاء پورا نہیں ہو سکتا جس کے لیے وہ نکاح اور تاسیس خاندان کا تقاضا کرتی ہے۔

پرانی جاہلیت کی طرح اس نئی جاہلیت کے دور میں بھی اکثر لوگ زنا کو ایک فطری فعل سمجھتے ہیں اور نکاح ان کے نزدیک محض تمدّن کی ایجاد کردہ مصنوعات یا زوائد میں سے ایک چیز

ہے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ فطرت نے جس طرح ہر بکری کو ہر بکرے کے لیے، اور ہر کتیا کو ہر کتے کے لیے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح ہر عورت کو بھی ہر مرد کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور فطری طریقہ یہی ہے کہ جب خواہش ہو، جب موقع بہم پہنچ جائے، اور جب دونوں صنفوں کے کوئی سے دو فرد باہم راضی ہوں، تو ان کے درمیان اُسی طرح صنفی عمل واقع ہو جائے، جس طرح جانوروں میں ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فطرت انسانی کی بالکل غلط تعبیر ہے۔ ان لوگوں نے انسان کو محض ایک حیوان سمجھ لیا ہے، لہٰذا جب کبھی یہ فطرت کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ان کی مراد حیوانی فطرت ہوتی ہے نہ کہ انسانی فطرت۔ جس منتشر صنفی تعلّق کو یہ فطری کہتے ہیں، وہ حیوانات کے لیے تو ضرور فطری ہے، مگر انسان کے لیے ہرگز فطری نہیں۔ وہ نہ صرف انسانی فطرت کے خلاف ہے، بلکہ اپنے آخری نتائج کے اعتبار سے اس حیوانی فطرت کے بھی خلاف ہو جاتا ہے جو انسان کے اندر موجود ہے۔ اس لیے کہ انسان کے اندر انسانیت اور حیوانیت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ دراصل ایک وجود کے اندر دونوں مل کر ایک ہی شخصیت بناتی ہیں۔ اور دونوں کے مقتضیات باہم ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جاتے ہیں کہ جہاں ایک کے منشا سے منہ موڑا گیا، دوسری کا منشا بھی خود بخود فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔

زنا میں بظاہر آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کم از کم فطرتِ حیوانی کے اقتضا کو پورا کر دیتی ہے، کیوں کہ تناسل اور بقائے نوع کا مقصد مجرد صنفی عمل سے پورا ہو جاتا ہے، عام اِس سے کہ وہ نکاح کے اندر ہو یا باہر۔ لیکن اس سے پہلے جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں اس پر پھر ایک نگاہ ڈال کر دیکھ لیجیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ فعل جس طرح فطرتِ انسانی کے مقصد کو نقصان پہنچاتا ہے اسی طرح فطرتِ حیوانی کے مقصد کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ فطرتِ انسانی چاہتی ہے کہ صنفی تعلق میں استحکام اور استقلال ہو تاکہ بچّہ کو ماں اور باپ مل کر پرورش کریں اور ایک کافی مدّت تک مرد نہ صرف بچّہ کا بلکہ بچّہ کی ماں کا بھی کفیل رہے۔ اگر مرد کو یقین نہ ہو کہ بچّہ اسی کا ہے تو وہ اس کی پرورش کے لیے قربانی اور تکلیفیں برداشت ہی نہ کرے گا اور نہ یہی گوارا کرے گا کہ وہ اس کے بعد اس کے ترکہ کا وارث ہو۔ اسی طرح اگر عورت کو یقین نہ ہو کہ جو مرد اسے بار آور کر رہا ہے وہ اس کی اور اس کے بچّہ کی کفالت کے لیے تیار ہے تو وہ حمل کی مصیبت اٹھانے کے لیے تیار ہی نہ ہو گی۔ اگر بچّہ کی پرورش میں ماں اور باپ تعاون نہ کریں تو اس کی تعلیم و تربیت اور اس کی

اخلاقی، ذہنی اور معاشی حیثیت کبھی اس معیار پر نہ پہنچ سکے گی، جس سے وہ انسانی تمدّن کے لیے کوئی مفید کارکن بن سکے۔ یہ سب فطرتِ انسانی کے مقتضیات ہیں، اور جب ان مقتضیات سے منہ موڑ کر محض حیوانوں کی طرح مرد اور عورت عارضی تعلق قائم کرتے ہیں۔ تو وہ خود فطرتِ حیوانی کے اقتضاء (یعنی توالد و تناسل) سے بھی منہ موڑ جاتے ہیں۔ کیوں کہ اس وقت توالد و تناسل ان کے پیش نظر نہیں ہوتا اور نہیں ہوسکتا۔ اس وقت اُن کے درمیان صنفی تعلق صرف خواہشاتِ نفس کی تسکین اور صرف لذت طلبی و لطف اندوزی کے لیے ہوتا ہے جو سرے سے منشاء فطرت کے خلاف ہے۔

جاہلیتِ جدیدہ کے علمبردار اس پہلو کو خود بھی کمزور پاتے ہیں۔ اس لیے وہ اس پر ایک اور استدلال کا اضافہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر جماعت کے دو افراد آپس میں مِل کر چند ساعتیں لطف اور تفریح میں گزار دیں تو اس میں آخر سوسائٹی کا کیا بگڑتا ہے کہ وہ اس میں مداخلت کرے؟ سوسائٹی اس صورت میں تو ضرور مداخلت کا حق رکھتی ہے جب کہ ایک فریق دوسرے پر جبر کرے یا دھوکے اور فریب سے کام لے۔ یا کسی جماعتی قضیہ کا سبب بنے۔ لیکن جہاں ان میں سے کوئی بات بھی نہ ہو، اور صرف دو اشخاص کے درمیان لذت اندوزی ہی کا معاملہ ہو تو سوسائٹی کو اُن کے بیچ میں حائل ہونے کا کیا حق ہے؟ لوگوں کے ایسے پرائیوٹ معاملات میں بھی اگر دخل دیا جائے تو شخصی آزادی محض ایک لفظ بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔

شخصی آزادی کا یہ تصوّر اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ان جہالتوں میں سے ایک ہے جن کی تاریکی، علم اور تحقیق کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی کافور ہو جاتی ہے۔ تھوڑے سے غور و خوض کے بعد ہی آدمی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ جس آزادی کا مطالبہ افراد کے لیے کیا جارہا ہے اس کے لیے کوئی گنجائش جماعتی زندگی میں نہیں ہے۔ جس کو ایسی آزادی مطلوب ہو اُسے جنگل میں جا کر حیوانوں کی طرح رہنا چاہیے۔ انسانی اجتماع تو دراصل علائق و روابط کے ایسے جال کا نام ہے جس میں ہر فرد کی زندگی دوسرے بے شمار افراد کے ساتھ وابستہ ہے، اُن پر اثر ڈالتی ہے اور اُن سے اثر قبول کرتی ہے۔ اس تعلقِ باہمی میں انسان کے کسی فعل کو بھی خالص شخصی اور بالکل انفرادی نہیں کہا جاسکتا۔ کسی ایسے شخصی فعل کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جس کا اثر بحیثیتِ مجموعی پوری جماعت پر نہ پڑتا ہو۔ افعالِ جوارح تو درکنار، دل میں چھپا ہوا کوئی خیال بھی ایسا نہیں جو ہمارے وجود پر اور اس سے منعکس ہو کر دوسروں پر اثر انداز نہ ہوتا ہو۔ ہمارے قلب و جسم کی ایک ایک حرکت

کے نتائج ہم سے منتقل ہو کر اتنی دور تک پہنچتے ہیں کہ ہمارا علم کسی طرح ان کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ ایک شخص کا اپنی کسی قوت کو استعمال کرنا اُس کی اپنی ذات کے سوا کسی پر اثر نہیں ڈالتا۔ لہٰذا کسی کو اس سے کوئی سروکار نہیں، اور اُسے اپنے معاملے میں پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے؟ اگر مجھے یہ آزادی نہیں دی جا سکتی کہ ہاتھ میں لکڑی لے کر جہاں چاہوں گھماؤں، اپنے پاؤں کو حرکت دے کر جہاں چاہوں گھس جاؤں، اپنی گاڑی کو جس طرح چاہوں چلاؤں، اپنے گھر میں جتنی غلاظت چاہوں جمع کرلوں، اگر یہ اور ایسے ہی بیشمار شخصی معاملات اجتماعی ضوابط کے پابند ہونے ضروری ہیں تو آخر میری قوتِ شہوانی ہی تنہا اس شرف کی حق دار کیوں ہو کہ اُسے کسی اجتماعی ضابطہ کا پابند نہ بنایا جائے اور مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے کہ اسے جس طرح چاہوں صرف کروں؟

یہ کہنا کہ ایک مرد اور ایک عورت باہم مل کر ایک پوشیدہ مقام پر سب سے الگ جو لطف اٹھاتے ہیں اس کا کوئی اثر اجتماعی زندگی پر نہیں پڑتا، محض بچّوں کی سی بات ہے۔ دراصل اس کا اثر صرف اس سوسائٹی پر ہی نہیں پڑتا جس سے وہ براہ راست متعلق ہیں، بلکہ پوری انسانیت پر پڑتا ہے، اور اس کے اثرات صرف حال کے لوگوں ہی تک محدود نہیں رہتے بلکہ آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتے ہیں۔ جس اجتماعی و عمرانی رابطہ میں پوری انسانیت بندھی ہوئی ہے، اس سے کوئی فرد کسی حال میں کسی محفوظ مقام پر بھی الگ نہیں ہے۔ بند کمروں میں، دیواروں کی حفاظت میں بھی وہ اسی طرح جماعت کی زندگی سے مربوط ہے جس طرح بازار یا محفل میں ہے۔ جس وقت وہ خلوت میں اپنی تولیدی طاقت کو ایک عارضی اور غیر نتیجہ لطف اندوزی پر ضائع کر رہا ہوتا ہے اس وقت دراصل وہ اجتماعی زندگی میں بدنظمی پھیلانے اور نوع کی حق تلفی کرنے اور جماعت کو بے شمار اخلاقی، مادی، تمدنی نقصانات پہنچانے میں مشغول ہوتا ہے۔ وہ اپنی خودغرضی سے ان تمام اجتماعی ادارات پر ضرب لگاتا ہے جن سے اس نے جماعت کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے فائدہ تو اٹھایا مگر ان کے قیام و بقا میں اپنا حصّہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ جماعت نے میونسپلٹی سے لے کر اسٹیٹ تک، مدرسہ سے لے کر فوج تک، کارخانوں سے لے کر علمی تحقیقات کی مجلسوں تک، جتنے بھی ادارے قائم کر رکھے ہیں، سب اسی اعتماد پر قائم کیے ہیں کہ ہر فرد جو اُن سے فائدہ اٹھا رہا ہے، اُن کے قیام اور اُن کی ترقی میں اپنا واجبی حصّہ ادا کرے گا۔ لیکن جب اس بے ایمان نے

اپنی قوتِ شہوانی کو اس طرح استعمال کیا کہ اس میں توالد و تناسُل اور تربیتِ اطفال کے فرائض انجام دینے کی سرے سے نیت ہی نہ تھی تو اس نے ایک ہی ضرب میں اپنی حد تک اس پورے نظام کی جڑ کاٹ دی۔ اس نے اُس اجتماعی معاہدہ کو توڑ ڈالا، جس میں وہ عین اپنے انسان ہونے کی حیثیت ہی سے شریک تھا۔ اس نے اپنے ذمہ کا بار خود اٹھانے کے بجائے دوسروں پر سارا بار ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہے، بلکہ ایک چور، خائن اور لٹیرا ہے۔ اس کے ساتھ رعایت کرنا پوری انسانیت پر ظلم کرنا ہے۔

اجتماعی زندگی میں فرد کا مقام کیا ہے، اس چیز کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہ سکتا کہ ایک ایک قوت جو ہمارے نفس اور جسم میں ودیعت کی گئی ہے، محض ہماری ذات کے لیے نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہمارے پاس امانت ہے، اور ہم ان میں سے ہر ایک کے لیے پوری انسانیت کے حق میں جواب دِہ ہیں۔ اگر ہم خود اپنی جان کو یا اپنی قوتوں میں سے کسی کو ضائع کرتے ہیں یا اپنی غلط کاری سے اپنے آپ کو نقصان پہنچاتے ہیں، تو ہمارے اس فعل کی اصلی حیثیت یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہمارا تھا اس کو ہم نے ضائع کیا یا نقصان پہنچا دیا، بلکہ دراصل اس کی حیثیت یہ ہے کہ تمام عالمِ انسانی کے لیے جو امانت ہمارے پاس تھی، اس میں ہم نے خیانت کی اور اپنی اس حرکت سے پوری نوع کو نقصان پہنچایا۔ ہمارا دنیا میں موجود ہونا خود اس بات پر شاہد ہے کہ دوسروں نے ذمے داریوں اور تکلیفوں کا بوجھ اٹھا کر زندگی کا نور ہماری طرف منتقل کیا تب ہی ہم اس عالم میں آئے۔ پھر اسٹیٹ کی تنظیم نے ہماری جان کی حفاظت کی۔ حفظانِ صحت کے محکمے ہماری زندگی کے تحفظ میں لگے رہے۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں نے مل کر ہماری ضروریات فراہم کیں۔ تمام اجتماعی اداروں نے مل کر ہماری قوتوں کو سنوارنے اور تربیت دینے کی کوشش کی اور ہمیں وہ کچھ بنایا جو ہم ہیں۔ کیا ان سب کا یہ جائز بدلہ ہوگا، کیا یہ انصاف ہوگا کہ جس جان اور جن قوتوں کے وجود اور نشو و نما میں دوسروں کا اتنا حصہ ہے اس کو ہم ضائع کر دیں یا مفید بنانے کے بجائے مضر بنائیں؟ خودکشی اسی بنا پر حرام ہے۔ ہاتھ سے شہوت رانی کرنے والے کو اسی وجہ سے دنیا کے سب سے بڑے حکیم نے ملعون کہا ہے (نَاکِحُ الْیَدِ مَلْعُوْنٌ) عملِ قومِ لوط کو اسی بنیاد پر بدترین جرم قرار دیا گیا ہے، اور زنا بھی اسی وجہ سے انفرادی تفریح اور خوش وقتی نہیں ہے بلکہ پوری انسانی جماعت پر ظلم ہے۔

ذرا غور کیجیے، فعلِ زنا کے ساتھ کتنے اجتماعی مظالم کا قریبی اور گہرا رشتہ ہے:

(۱) سب سے پہلے ایک زانی اپنے آپ کو امراضِ خبیثہ کے خطرے میں ڈالتا ہے اور اس طرح نہ صرف اپنی جسمانی قوتوں کی اجتماعی افادیت میں نقص پیدا کرتا ہے، بلکہ جماعت اور نسل کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ سوزاک کے متعلق ہر طبیب آپ کو بتادے گا کہ مجرائے بول کا یہ قرحہ شاذ و نادر ہی کامل طور پر مندمل ہوتا ہے۔ ایک بڑے ڈاکٹر کا قول ہے کہ: "ایک دفعہ سوزاک ہمیشہ کے لیے سوزاک۔" اس سے جگر، مثانہ، انثیین وغیرہ اعضا بھی بسا اوقات آفت رسیدہ ہو جاتے ہیں۔ گٹھیا اور بعض دوسرے امراض کا بھی یہ سبب بن جاتا ہے۔ اس سے مستقل بانجھ پن پیدا ہو جانے کا بھی امکان ہے۔ اور یہ دوسروں کی طرف متعدّی بھی ہوتا ہے۔ رہا آتشک تو کس کو معلوم نہیں کہ اس سے پورا نظامِ جسمانی مسموم ہو جاتا ہے۔ سر سے پاؤں تک کوئی عضو بلکہ جسم کا کوئی جز ایسا نہیں جس میں اس کا زہر نفوذ نہ کر جاتا ہو۔ یہ نہ خود مریض کی جسمانی قوتوں کو ضائع کرتا ہے بلکہ ایک شخص سے نہ معلوم کتنے اشخاص تک مختلف ذرائع سے پہنچ جاتا ہے۔ پھر اس کی بدولت مریض کی اولاد اور اولاد کی اولاد تک بے قصور سزا بھگتتی ہے۔ بچّوں کا اندھا، گونگا، بہرہ، فاتر العقل پیدا ہونا، لطف کی اُن چند گھڑیوں کا ایک معمولی ثمرہ ہے، جنھیں ظالم باپ نے اپنی زندگی کی متاعِ عزیز سمجھا تھا۔

(۲) امراضِ خبیثہ میں تو ہر زانی کا مبتلا ہو جانا یقینی نہیں ہے، مگر اُن اخلاقی کمزوریوں سے کسی کا بچنا ممکن نہیں جو اس فعل سے لازماً تعلق رکھتی ہیں۔ بے حیائی، فریب کاری، جھوٹ، بدنیتی، خود غرضی، خواہشات کی غلامی، ضبطِ نفس کی کمی، خیالات کی آوارگی، طبیعت میں ذوّاقی اور ہرجائی پن، اور ناوفاداری، یہ سب زنا کے وہ اخلاقی اثرات ہیں جو خود زانی کے نفس پر مترتّب ہوتے ہیں۔ جو شخص یہ خصوصیات اپنے اندر پرورش کرتا ہے اس کی کمزوریوں کا اثر محض صنفی معاملات ہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی طرف سے یہی ہدیہ جماعت کو پہنچتا ہے۔ اگر جماعت میں کثرت سے لوگوں کے اندر یہ اوصاف نشو و نما پا گئے ہوں تو ان کی بدولت آرٹ اور ادب، تفریحات اور کھیل، علوم اور فنون، صنعت اور حرفت، معاشرت اور معیشت، سیاست اور عدالت، فوجی خدمات، اور انتظامِ ملکی، غرض ہر چیز کم و بیش ماؤف ہو کر رہے گی۔ خصوصاً جمہوری نظام میں تو افراد کی ایک ایک اخلاقی خصوصیت

کا پوری قوم کی زندگی پر منعکس ہونا یقینی ہے۔ جس قوم کے بیشتر افراد کے مزاج میں کوئی قرار وثبات نہ ہو، اور جس قوم کے اجزاء ترکیبی وفا سے، ایثار سے اور خواہشات پر قابو رکھنے کی صفات سے عاری ہوں اس کی سیاست میں استحکام آخر آئے گا کہاں سے؟

(۳) زنا کو جائز رکھنے کے ساتھ یہ بھی لازم ہوجاتا ہے کہ سوسائٹی میں فاحشہ گری کا کاروبار جاری رہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ایک جوان مرد کو ''تفریح'' کا حق حاصل ہے، وہ گویا ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں ایک معتد بہ طبقہ ایسی عورتوں کا موجود رہنا چاہیے جو ہر حیثیت سے انتہائی پستی و ذلّت کی حالت میں ہوں، آخر یہ عورتیں آئیں گی کہاں سے؟ اسی سوسائٹی ہی میں سے تو پیدا ہوں گی۔ بہر حال کسی کی بیٹی اور بہن ہی تو ہوں گی، وہ لاکھوں عورتیں جو ایک ایک گھر کی ملکہ، ایک ایک خاندان کی بانی، کئی کئی بچّوں کی مربّی بن سکتی تھیں، انہیں کو لاکر تو بازار میں بٹھانا پڑے گا، تاکہ میونسپلٹی کے پیشاب خانوں کی طرح وہ آوارہ مزاج مردوں کے لیے رفعِ حاجت کا محل بنیں۔ ان سے عورت کی تمام شریفانہ خصوصیات چھینی جائیں، انہیں ناز فروشی کی تربیت دی جائے، انہیں اس غرض کے لیے تیار کیا جائے کہ اپنی محبت، اپنے دل، اپنے جسم، اپنے حُسن اور اپنی اداؤں کو ہر ساعت ایک نئے خریدار کے ہاتھ بیچیں، اور کوئی نتیجہ خیز و بارآور خدمت کرنے کے بجائے تمام عمر دوسروں کی نفس پرستی کے لیے کھلونا بنی رہیں۔

(۴) زنا کے جواز سے نکاح کے تمدّنی ضابطہ کو لامحالہ نقصان پہنچتا ہے، بلکہ انجامِ کار نکاح ختم ہوکر صرف زنا ہی زنا رہ جاتی ہے۔ اوّل تو زنا کا میلان رکھنے والے مردوں اور عورتوں میں یہ صلاحیت ہی بہت کم باقی رہ جاتی ہے کہ صحیح ازدواجی زندگی بسر کرسکیں۔ کیوں کہ جو بدنیتی، بدنظری ذوّاقی اور آوارہ مزاجی اس طریق کار سے پیدا ہوتی ہے، اور ایسے لوگوں میں جذبات کی جو بے ثباتی اور خواہشاتِ نفس پر قابو نہ رکھنے کی جو کمزوری پرورش پاتی ہے، وہ ان صفات کے لیے سمِ قاتل ہے جو ایک کامیاب ازدواجی تعلق کے لیے ضروری ہیں۔ وہ اگر ازدواج کے رشتہ میں بندھیں گے بھی تو اُن کے درمیان وہ حسنِ سلوک، وہ سہیوگ، وہ باہمی اعتماد اور وہ مہر و وفا کا رابطہ کبھی استوار نہ ہوگا۔ جس سے اچھی نسل پیدا ہوتی ہے اور ایک مسرت بھرا گھر وجود میں آتا ہے۔ پھر جہاں زنا کی آسانیاں ہوں وہاں عملاً یہ ناممکن

ہے کہ نکاح کا تمدّن پرور طریقہ قائم رہ سکے۔ کیوں کہ جن لوگوں کو ذمے داریاں قبول کیے بغیر خواہشاتِ نفس کی تسکین کے مواقع حاصل ہوں انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ نکاح کر کے اپنے سر پر بھاری ذمے داریوں کا بوجھ لادیں؟

(۵) زنا کے جواز اور رواج سے نہ صرف تمدّن کی جڑ کٹتی ہے، بلکہ خود نسلِ انسانی کی جڑ بھی کٹتی ہے، جیسا کہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے، آزادانہ صنفی تعلق میں مرد اور عورت دونوں میں سے کسی کی بھی یہ خواہش نہیں ہوتی اور نہیں ہوسکتی کہ بقائے نوع کی خدمت انجام دیں۔

(۶) زنا سے نوع اور سوسائٹی کو اگر بچّے ملتے بھی ہیں تو حرامی بچّے ہوتے ہیں۔ نسب میں حلال اور حرام کی تمیز محض ایک جذباتی چیز نہیں ہے جیسا کہ بعض نادان لوگ گمان کرتے ہیں۔ دراصل متعدد حیثیات سے حرام کا بچّہ پیدا کرنا خود بچّے پر اور پورے انسانی تمدّن پر ایک ظلمِ عظیم ہے۔ اوّل تو ایسے بچّے کا نطفہ ہی اُس حالت میں قرار پاتا ہے جب کہ ماں اور باپ دونوں پر خالص حیوانی جذبات کا تسلّط ہوتا ہے، ایک شادی شدہ جوڑے میں صنفی عمل کے وقت جو پاک انسانی جذبات ہوتے ہیں وہ ناجائز تعلق رکھنے والے جوڑے کو کبھی میسّر ہی نہیں آسکتے، ان کو تو مجرد بہیمیت کا جوش ایک دوسرے سے ملاتا ہے، اور اُس وقت تمام انسانی خصوصیات برطرف ہوتی ہیں، لہٰذا ایک حرامی بچّہ طبعاً اپنے والدین کی حیوانیت ہی کا وارث ہوتا ہے۔ پھر وہ بچّہ جس کا خیر مقدم کرنے کے لیے نہ ماں تیار ہو نہ باپ، جو ایک مطلوب چیز کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ناگہانی مصیبت کی حیثیت سے والدین کے درمیان آیا ہو، جس کو باپ کی محبت اور اس کے وسائل بالعموم میسّر نہ آئیں، جو صرف ماں کی یک طرفہ تربیت پائے اور وہ بھی ایسی جس میں بے دلی اور بیزاری شامل ہو، جس کو دادا، دادی، نانا، نانی، چچا، ماموں اور دوسرے اہلِ خاندان کی سرپرستی حاصل نہ ہو، وہ بہرحال ایک ناقص و نامکمل انسان ہی بن کر اٹھے گا۔ نہ اس کا صحیح کیرکٹر بن سکے گا نہ اس کی صلاحیتیں چمک سکیں گی، نہ اس کی ترقی اور کارپردازی کے پورے وسائل بہم پہنچ سکیں گے۔ وہ خود بھی ناقص، بے وسیلہ، بے یار و مددگار اور مظلوم ہوگا اور تمدّن کے لیے بھی کسی طرح اتنا مفید نہ بن سکے گا جتنا وہ حلالی ہونے کی صورت میں ہوسکتا تھا۔

آزاد شہوت رانی کے حامی کہتے ہیں کہ بچّوں کی پرورش اور تعلیم کے لیے ایک قومی نظام

ہونا چاہیے تاکہ بچّوں کو ان کے والدین اپنے آزادانہ تعلق سے جنم دیں اور قوم اُن کو پال پوس کر تمدّن کی خدمت کے لیے تیار کرے۔ اس تجویز سے ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کی آزادی اور اُن کی انفرادیت محفوظ رہے اور اُن کی نفسانی خواہشات کو نکاح کی پابندیوں میں جکڑے بغیر تولیدِ نسل و تربیتِ اطفال کا مدعا حاصل ہو جائے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جن لوگوں کو موجودہ نسل کی انفرادیت اتنی عزیز ہے وہ آیندہ نسل کے لیے قومی تعلیم یا سرکاری تربیت کا ایسا سسٹم تجویز کرتے ہیں جس میں انفرادیت کے نشو ونما اور شخصیت کے ارتقاء کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس قسم کے ایک سسٹم میں جہاں ہزاروں لاکھوں بچّے بیک وقت ایک نقشے ایک ضابطے اور ایک ہی ڈھنگ پر تیار کیے جائیں، بچّوں کا انفرادی تشخص کبھی ابھر اور نکھر ہی نہیں سکتا۔ وہاں تو ان میں زیادہ یکسانی اور مصنوعی ہمواری پیدا ہوگی۔ اس کارخانے سے بچّے اسی طرح ایک سی شخصیت لے کر نکلیں گے جس طرح کی بڑی فیکٹری سے لوہے کے پرزے یکساں ڈھلے ہوئے نکلتے ہیں۔ غور تو کرو انسان کے متعلق ان کم عقل لوگوں کا تصور کتنا پست اور کتنا گھٹیا ہے۔ یہ باٹا کے جوتوں کی طرح انسانوں کو تیار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ بچہ کی شخصیت کو تیار کرنا ایک لطیف ترین آرٹ ہے۔ یہ آرٹ ایک چھوٹے نگار خانے ہی میں انجام پاسکتا ہے۔ جہاں ہر مصوّر کی توجہ ایک ایک تصویر پر مرکوز ہو۔ ایک بڑی فیکٹری میں جہاں کرایہ کے مزدور ایک ہی طرز کی تصویر لاکھوں کی تعداد میں تیار کرتے ہوں، یہ آرٹ غارت ہوگا، نہ کہ ترقی کرے گا۔

پھر قومی تعلیم و تربیت کے اس سسٹم میں آپ کو بہرحال ایسے کارکنوں کی ضرورت ہوگی جو سوسائٹی کی طرف سے بچّوں کی پرورش کا کام سنبھالیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس خدمت کو انجام دینے کے لیے ایسے ہی کارکن موزوں ہو سکتے ہیں جو اپنے جذبات اور خواہشات پر قابو رکھتے ہوں اور جن میں خود اخلاقی انضباط پایا جاتا ہو ورنہ وہ بچّوں میں اخلاقی انضباط کیسے پیدا کرسکیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسے آدمی آپ لائیں گے کہاں سے؟ آپ تو قومی تعلیم و تربیت کا سسٹم قائم ہی اس لیے کر رہے ہیں کہ مردوں اور عورتوں کو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح جب آپ نے سوسائٹی میں سے اخلاقی انضباط اور خواہشات کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت کا بیج ہی مار دیا تو اندھوں کی بستی میں آنکھوں والے دستیاب کہاں ہوں گے کہ وہ نئی نسلوں کو دیکھ کر چلنا سکھائیں؟

(۷) زنا کے ذریعے سے ایک خودغرض انسان جس عورت کو بچّہ کی ماں بنا دیتا ہے اُس کی زندگی ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جاتی ہے، اور اس پر ذلت اور نفرتِ عامہّ اور مصائب کا ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے کہ جیتے جی وہ اس کے بوجھ تلے سے نہیں نکل سکتی۔ نئے اخلاقی اصولوں میں اس مشکل کا حل یہ تجویز کیا ہے کہ ہر قسم کی مادری کو مساوی حیثیت دے دی جائے، خواہ وہ قیدِ نکاح کے اندر ہو یا باہر۔

کہا جاتا ہے کہ مادریت بہرحال قابلِ احترام ہے اور یہ کہ جس لڑکی نے اپنی سادگی سے یا بے احتیاطی سے ماں بننے کی ذمے داری قبول کرلی ہے، اس پر یہ ظلم ہے کہ سوسائٹی میں اسے مطعون کیا جائے۔

لیکن اول تو یہ حل ایسا ہے کہ اس میں فاحشہ عورتوں کے لیے چاہے کتنی ہی سہولت ہو، سوسائٹی کے لیے بحیثیت مجموعی سراسر مصیبت ہی مصیبت ہے۔ سوسائٹی فطرتاً حرامی بچّہ کی ماں کو جس نفرت اور ذلت کی نگاہ سے دیکھتی ہے وہ ایک طرف افراد کو گناہ اور بدکاری سے روکنے کے لیے ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اور دوسری طرف وہ خود سوسائٹی میں بھی اخلاقی حِس کے زندہ ہونے کی علامت ہے۔ اگر حرامی بچّہ کی ماں اور حلالی بچّے کی ماں کو مساوی سمجھا جانے لگا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جماعت سے خیر اور شر، بھلائی اور برائی، گناہ اور صواب کی تمیز ہی رخصت ہو گئی۔ پھر اگر بالفرض یہ ہو بھی جائے تو کیا اس سے فی الواقع وہ مشکلات حل ہو جائیں گی جو حرامی بچّے کی ماں کو پیش آتی ہیں۔ تم اپنے نظریہ میں حرام اور حلال دونوں قسم کی مادری کو مساوی قرار دے سکتے ہو، مگر فطرت ان دونوں کو مساوی نہیں کرتی اور حقیقت میں وہ کبھی مساوی ہو ہی نہیں سکتیں۔ ان کی مساوات عقل، منطق، انصاف، حقیقت ہر چیز کے خلاف ہے۔ آخر وہ بے وقوف عورت جس نے شہوانی جذبات کے وقتی ہیجان سے مغلوب ہو کر اپنے آپ کو ایک ایسے خودغرض آدمی کے حوالہ کر دیا جو اس کی اور اس کے بچّہ کی کفالت کا ذمّہ لینے کے لیے تیار نہ تھا اس عقل مند عورت کے برابر کس طرح ہو سکتی ہے جس نے اپنے جذبات کو اس وقت تک اپنے قابو میں رکھا جب تک اسے ایک شریف ذمے دار آدمی نہ مل گیا؟ کون سی عقل ان دونوں کو یکساں کہہ سکتی ہے؟ تم چاہو تو نمائشی طور پر انہیں برابر کر دو، مگر تم اس بے وقوف عورت کو وہ کفالت و حفاظت، وہ ہمدردانہ رفاقت، وہ محبت آمیز نگہداشت، وہ خیر خواہانہ دیکھ بھال اور وہ سکینت و طمانیت کہاں سے دلواؤ گے جو صرف

ایک شوہر والی عورت ہی کو مل سکتی ہے؟ تم اس کے بچّہ کو باپ کی شفقت اور پورے سلسلۂ پدری کی محبت وعنایت کس بازار سے دلاؤ گے؟ زیادہ سے زیادہ تم قانون کے زور سے اس کو نفقہ دلوا سکتے ہو۔ مگر کیا ایک ماں اور ایک بچّہ کو دنیا میں صرف نفقہ ہی کی ضرورت ہوا کرتی ہے؟ پس یہ حقیقت ہے کہ حرام وحلال کی مادریت کو یکساں کر دینے سے گناہ کرنے والیوں کو خارجی تسلّی چاہے کتنی ہی مل جائے بہر حال یہ چیز ان کو ان کی حماقت کے طبعی نتائج سے اور ان کے بچّوں کو اس طرح کی پیدائش کے حقیقی نقصانات سے نہیں بچا سکتی۔

ان وجوہ سے یہ بات جماعتی زندگی کے قیام اور صحیح نشوونما کے لیے اہم ضروریات میں سے ہے کہ جماعت میں صنفی عمل کے انتشار کو قطعی روک دیا جائے۔ اور جذباتِ شہوانی کی تسکین کے لیے صرف ایک ہی دروازہ ـــــ ازدواج کا دروازہ ـــــ کھولا جائے۔ افراد کو زنا کی آزادی دینا اُن کے ساتھ بے جا رعایت اور سوسائٹی پر ظلم، بلکہ سوسائٹی کا قتل ہے۔ جو سوسائٹی اس معاملے کو حقیر سمجھتی ہے اور زنا کو محض افراد کی خوش وقتی (Having a good time) سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہتی ہے اور ''آزادانہ تخم ریزی'' (Sowing Wild Oats) کے ساتھ رواداری برتنے کے لیے تیار ہے، وہ دراصل ایک جاہل سوسائٹی ہے۔ اس کو اپنے حقوق کا شعور نہیں ہے، وہ آپ اپنے ساتھ دشمنی کرتی ہے۔ اگر اسے اپنے حقوق کا شعور ہو اور وہ جانے اور سمجھے کہ صنفی تعلقات کے معاملہ میں انفرادی آزادی کے اثرات جماعتی مفاد پر کیا مترتب ہوتے ہیں تو وہ اس فعل کو اُسی نظر سے دیکھے جس سے چوری، ڈاکہ اور قتل کو دیکھتی ہے بلکہ یہ چوری سے اشد ہے۔ چور، قاتل اور ڈاکو زیادہ سے زیادہ ایک فرد یا چند افراد کا نقصان کرتے ہیں۔ مگر زانی پوری سوسائٹی پر اور اس کی آئندہ نسلوں پر ڈاکہ مارتا ہے۔ وہ بیک وقت لاکھوں کروڑوں انسانوں کی چوری کرتا ہے۔ اس کے جرم کے نتائج اِن سب مجرموں سے زیادہ دُوررس اور زیادہ وسیع ہیں۔

جب یہ تسلیم ہے کہ افراد کی خود غرضانہ دست درازیوں کے مقابلے میں سوسائٹی کی مدد پر قانون کی طاقت ہونی چاہیے، اور جب اسی بنیاد پر چوری، قتل، لوٹ مار، جعلسازی اور غصبِ حقوق کی دوسری صورتوں کو جرم قرار دے کر تعزیر کے زور سے ان کا سدِّ باب کیا جاتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ زنا کے معاملے میں قانون سوسائٹی کا محافظ نہ ہو اور اسے تعزیری جرم قرار نہ دیا جائے۔

اصولی حیثیت سے بھی یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ نکاح اور سفاح دونوں بیک وقت ایک

نظامِ معاشرت کے جز نہیں ہو سکتے۔ اگر ایک شخص کے لیے ذمّے داریاں قبول کیے بغیر خواہشاتِ نفس کی تسکین جائز رکھی جائے تو اسی کام کے لیے نکاح کا ضابطہ مقرر کرنا محض بے معنی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل میں بلاٹکٹ سفر کرنے کو جائز بھی رکھا جائے اور پھر سفر کے لیے ٹکٹ کا قاعدہ بھی مقرر کیا جائے۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی ان دونوں طریقوں کو بیک وقت اختیار نہیں کر سکتا۔ معقول صورت یہی ہے کہ یا تو ٹکٹ کا قاعدہ سرے سے اڑا دیا جائے یا اگر یہ قاعدہ مقرر کرنا ہے تو بلاٹکٹ سفر کرنے کو جرم قرار دیا جائے۔ اسی طرح نکاح اور سفاح کے معاملے میں دو عملی ایک قطعی غیر معقول چیز ہے۔ اگر تمدّن کے لیے نکاح کا ضابطہ ضروری ہے، جیسا کہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے۔ تو اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ سفاح کو جرم قرار دیا جائے۔[1]

جاہلیت کی خصوصیات میں سے یہ بھی ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ جن چیزوں کے نتائج محدود ہوتے ہیں اور جلدی اور محسوس شکل میں سامنے آ جاتے ہیں اُن کا تو ادراک کر لیا جاتا ہے مگر جن کے نتائج وسیع اور دور رس ہونے کی وجہ سے غیر محسوس رہتے ہیں اور دیر میں مترتب ہوا کرتے ہیں انہیں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، بلکہ نا قابلِ اعتنا سمجھا جاتا ہے، چوری، قتل اور ڈکیتی جیسے معاملات کو اہم اور زنا کو غیر اہم سمجھنے کی وجہ یہی ہے۔ جو شخص اپنے گھر میں طاعون کے چوہے جمع کرتا ہے، یا متعدّی امراض پھیلاتا ہے، جاہلیت کا تمدّن اس کو تو معافی کے قابل نہیں سمجھتا، کیوں کہ اس کا فعل صریح طور پر نقصان رساں نظر آتا ہے، مگر جو زنا کار اپنی خود غرضی سے تمدن کی

---

(۱) ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ نکاح سے پہلے ایک جوان آدمی کو خواہشاتِ نفس کی تسکین کا تھوڑا بہت موقع ضرور حاصل ہونا چاہیے۔ کیوں کہ جوانی میں جذبات کے جوش کو روکنا مشکل ہے اور اگر روکا جائے تو صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن اس نتیجہ کی بنا جن مقدمات پر قائم ہے وہ سب غلط ہے۔ جذبات کا ایسا جوش جو روکا نہ جا سکے ایک غیر معمولی (Abnormal) حالت ہے اور معمولی (Normal) انسانوں میں یہ حالت صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ایک غلط نظامِ تمدن ان کو زبردستی مشتعل کرتا ہے۔ ہمارے سینما، ہمارا لٹریچر، ہماری تصویریں، ہماری موسیقی اور اس مخلوط سوسائٹی میں بنی ٹھنی عورتوں کا ہر جگہ مردوں سے متصادم ہونا، یہی وہ اسباب ہیں جو خواہ مخواہ معمولی انسانوں کو شہوانی اعتبار سے غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ ورنہ ایک پُرسکون فضا میں عام مردوں اور عورتوں کو ایسا ہیجان کبھی لاحق نہیں ہو سکتا کہ ذہن اور اخلاقی تربیت سے اس کو ضبط نہ کیا جا سکے۔ اور یہ خیال کہ "جوانی کے زمانہ میں صنفی عمل نہ کرنے سے صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔ لہٰذا صحت برقرار رکھنے کے لیے زنا کرنی چاہیے" ایک مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دراصل صحت اور اخلاق دونوں کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ معاشرت کے اس غلط نظام اور خوش حال زندگی کے اُن غلط معیارات کو بدلا جائے جن کی وجہ سے نکاح مشکل اور سفاح آسان ہو کر رہ گیا ہے۔

جڑ کاٹتا ہے، اس کے نقصانات چوں کہ محسوس ہونے کے بجائے معقول ہیں اس لیے وہ جاہلوں کو ہر رعایت کا مستحق نظر آتا ہے۔ بلکہ ان کی سمجھ میں یہ آتا ہی نہیں کہ اس کے فعل میں جرم کی آخر کون سی بات ہے۔ اگر تمدّن کی بنیاد جاہلیت کے بجائے عقل اور علمِ فطرت پر ہو تو یہ طرزِ عمل کبھی اختیار نہ کیا جائے۔

۴- انسدادِ فواحش کی تدابیر

تمدن کے لیے جو فعل نقصان دہ ہو اس کو روکنے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ اسے بس قانوناً جرم قرار دیا جائے اور اس کے لیے سزا مقرر کر دی جائے بلکہ اس کے ساتھ چار قسم کی تدبیریں اور بھی اختیار کرنا ضروری ہیں۔

- ایک یہ کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے سے افراد کی ذہنیت درست کی جائے اور ان کے نفس کی اس حد تک اصلاح کر دی جائے کہ وہ خود اس فعل سے نفرت کرنے لگیں، اُسے گناہ سمجھیں، اور ان کا اپنا اخلاقی وِجدان انہیں اس کے ارتکاب سے باز رکھے۔
- دوسرے یہ کہ جماعتی اخلاق اور رائے عام کو اس گناہ یا جرم کے خلاف اس حد تک تیار کر دیا جائے کہ عام لوگ اسے عیب اور لائقِ شرم فعل سمجھنے اور اس کے مرتکب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں تاکہ جن افراد کی تربیت ناقص رہ گئی ہو یا جن کا اخلاقی وجدان کمزور ہو انہیں رائے عامہ کی طاقت ارتکابِ جرم سے باز رکھے۔
- تیسرے یہ کہ نظامِ تمدن میں ایسے تمام اسباب کا انسداد کر دیا جائے جو اس جرم کی تحریک کرنے والے اور اس کی طرف ترغیب و تحریص دلانے والے ہوں اور اس کے ساتھ ہی ان اسباب کو بھی حتی الامکان دور کیا جائے جو افراد کو اس فعل پر مجبور کرنے والے ہوں۔
- چوتھے یہ کہ تمدنی زندگی میں ایسی رکاوٹیں اور مشکلات پیدا کر دی جائیں کہ اگر کوئی شخص اس جرم کا ارتکاب کرنا بھی چاہے تو آسانی سے نہ کر سکے۔

یہ چاروں تدبیریں ایسی ہیں جن کی صحت اور ضرورت پر عقل شہادت دیتی ہے، فطرت ان کا مطالبہ کرتی ہے، اور بالفعل ساری دنیا کا تعامل بھی یہی ہے کہ سوسائٹی کا قانون جن جن

چیزوں کو جرم قرار دیتا ہے، ان سب کو روکنے کے لیے تعزیر کے علاوہ یہ چاروں تدبیریں بھی کم و بیش ضرور استعمال کی جاتی ہیں۔ اب اگر یہ مسلّم ہے کہ صنفی تعلقات کا انتشار تمدن کے لیے مہلک ہے اور سوسائٹی کے خلاف ایک شدید جُرم کی حیثیت رکھتا ہے، تو لامحالہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُسے روکنے کے لیے تعزیر کے ساتھ ساتھ وہ سب اصلاحی و انسدادی تدابیر استعمال کرنی ضروری ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس لیے افراد کی تربیت بھی ہونی چاہیے، رائے عام کو بھی اس کی مخالفت کے لیے تیار کرنا چاہیے، تمدّن کے دائرے سے ان تمام چیزوں کو خارج بھی کر دینا چاہیے جو افراد کے شہوانی جذبات کو مشتعل کرتی ہیں، نظامِ معاشرت سے ان رُکاوٹوں کو بھی دُور کرنا چاہیے جو نکاح کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہیں اور مَردوں اور عورتوں کے تعلقات پر ایسی پابندیاں بھی عائد کرنا چاہئیں کہ اگر وہ دائرۂ ازدواج کے باہر صنفی تعلق قائم کرنے کی طرف مائل ہوں تو ان کی راہ میں بہت سے مضبوط حجابات حائل ہو جائیں۔ زنا کو جرم اور گناہ تسلیم کرنے کے بعد کوئی صاحبِ عقل آدمی اِن تدابیر کے خلاف ایک لفظ نہیں کہہ سکتا۔

بعض لوگ اُن تمام اخلاقی و اجتماعی اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں جن کی بنیاد پر زنا کو گناہ قرار دیا گیا ہے مگر ان کا اصرار یہ ہے کہ اس کے خلاف تعزیری اور انسدادی تدابیر اختیار کرنے کے بجائے صرف اصلاحی تدبیروں پر اکتفا کرنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ تعلیم اور تربیت کے ذریعے سے لوگوں میں اتنا باطنی احساس، ان کے ضمیر کی آواز میں اتنی طاقت، اور ان کے اخلاقی وجدان میں اتنا زور پیدا کر دو کہ وہ خود اس گناہ سے رُک جائیں، ورنہ اصلاحِ نفس کے بجائے تعزیر اور انسدادی تدابیر اختیار کرنے کے معنیٰ تو یہ ہوں گے کہ تم آدمیوں کے ساتھ بچّوں کا سا سلوک کرتے ہو، بلکہ آدمیت کی توہین کرتے ہو۔ ہم بھی ان کے ارشاد کو اس حد تک تسلیم کرتے ہیں کہ اصلاحِ آدمیت کا اعلیٰ اور اشرف طریقہ وہی ہے جو وہ بیان فرماتے ہیں۔ تہذیب کی غایت فی الحقیقت یہی ہے کہ افراد کے باطن میں ایسی قوت پیدا ہو جائے، جس سے وہ خود بخود سوسائٹی کے قوانین کا احترام کرنے لگیں اور خود ان کا اپنا ضمیر ان کو اخلاقی ضوابط کی خلاف ورزی سے روک دے۔ اسی غرض کے لیے افراد کی تعلیم و تربیت پر سارا زور صرف کیا جاتا ہے۔ مگر کیا فی الواقع تہذیب اپنی اس غایت کو پہنچ چکی ہے؟ کیا حقیقت میں تعلیم اور اخلاقی تربیت کے ذرائع سے افرادِ انسانی کو اتنا مہذّب بنایا جا چکا ہے کہ ان کے باطن پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہو اور جماعتی نظام

کی حفاظت کے لیے خارج میں کسی انسدادی اور تعزیری تدبیر کی ضرورت باقی نہ رہی ہو؟ زمانۂ قدیم کا ذکر چھوڑیے کہ آپ کی زبان میں وہ ''تاریک دَور'' تھا۔ یہ بیسویں صدی ''یہ قرنِ منوّر'' آپ کے سامنے موجود ہے۔ اس زمانہ میں یورپ اور امریکہ کے مہذّب ترین ممالک کو دیکھ لیجیے جن کا ہر باشندہ تعلیم یافتہ ہے، جن کو اپنے شہریوں کی اعلیٰ تربیت پر ناز ہے، کیا وہاں تعلیم اور اصلاحِ نفس نے جرائم اور قانون شکنی کو روک دیا ہے؟ کیا وہاں چوریاں نہیں ہوتیں؟ ڈاکے نہیں پڑتے؟ قتل نہیں ہوتے؟ جعل اور فریب اور ظلم اور فساد کے واقعات پیش نہیں آتے؟ کیا وہاں پولس، عدالت، جیل، تمدّنی احتساب کسی چیز کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی؟ کیا وہاں افراد کے اندر اخلاقی ذمّے داری کا احساس پیدا ہو گیا ہے کہ اب ان کے ساتھ ''بچوں کا سا سلوک'' نہیں کیا جاتا؟ اگر واقعہ یہ نہیں ہے، اگر اس روشن زمانے میں بھی سوسائٹی کے نظم و آئین کو محض افراد کے اخلاقی وجدان پر نہیں چھوڑا جا سکا ہے، اگر اب بھی ہر جگہ ''آدمیت کی یہ توہین'' ہو رہی ہے کہ جرائم کے سدِّ باب کے لیے تعزیری اور انسدادی دونوں قسم کی تدبیریں استعمال کی جاتی ہیں، تو آخر کیا وجہ ہے کہ صرف صنفی تعلقات ہی کے معاملے میں آپ کو یہ توہین ناگوار ہے؟ صرف اسی ایک معاملے میں کیوں اِن ''بچّوں'' سے ''بڑوں'' کا سا سلوک کیے جانے پر آپ کو اصرار اور اتنا اصرار ہے؟ ذرا ٹٹول کر دیکھیے، کہیں دل میں کوئی چور تو چھپا ہوا نہیں ہے!

کہا جاتا ہے کہ جن چیزوں کو تم شہوانی محرکات قرار دے کر تمدّن کے دائرے سے خارج کرنا چاہتے ہو وہ تو سب آرٹ اور ذوقِ جمال کی جان ہیں، انہیں نکال دینے سے تو انسانی زندگی میں لطافت کا سر چشمہ ہی سُوکھ کر رہ جائے گا، لہٰذا تمہیں تمدّن کی حفاظت اور معاشرت کی اصلاح جو کچھ بھی کرنی ہے اس طرح کرو کہ فنونِ لطیفہ اور جمالیّت کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ ہم بھی ان حضرات کے ساتھ اس حد تک متفق ہیں کہ آرٹ اور ذوقِ جمال فی الواقع قیمتی چیزیں ہیں، جن کی حفاظت، بلکہ ترقی ضرور ہونی چاہیے مگر سوسائٹی کی زندگی اور اجتماعی فلاح ان سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے، اس کو کسی آرٹ اور کسی ذوق پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ آرٹ اور جمالیت کو اگر پھلنا پھولنا ہے تو اپنے لیے نشوونما کا وہ راستہ ڈھونڈیں جس میں وہ اجتماعی زندگی اور فلاح کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکیں۔ جو آرٹ اور ذوقِ جمال زندگی کے بجائے ہلاکت اور فلاح کے بجائے فساد کی طرف لے جانے والا ہو اُسے جماعت کے دائرے میں ہرگز پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا جا سکتا۔ یہ کوئی

ہمارا انفرادی اور خانہ زاد نظریہ نہیں ہے بلکہ یہی عقل وفطرت کا مقتضا ہے، تمام دنیا اس کو اصولاً تسلیم کرتی ہے، اور اسی پر ہر جگہ عمل بھی ہو رہا ہے۔ جن چیزوں کو بھی دنیا میں جماعتی زندگی کے لیے مہلک اور موجبِ فساد سمجھا جاتا ہے انہیں کہیں آرٹ اور ذوقِ جمال کی خاطر گوارا نہیں کیا جاتا۔ مثلاً جو لٹریچر فتنہ وفساد اور قتل وغارت گری پر اُبھارتا ہو اُسے کہیں بھی محض اس کی ادبی خوبیوں کی خاطر جائز نہیں رکھا جاتا۔ جس ادب میں طاعون یا ہیضہ پھیلانے کی ترغیب دی جائے اُسے کہیں برداشت نہیں کیا جاتا، جو سنیما یا تھیٹر امن شکنی اور بغاوت پر اُکساتا ہو اس کو دنیا کی کوئی حکومت منظرِ عام پر آنے کی اجازت نہیں دیتی۔ جو تصویریں ظلم اور فسادات اور شرارت کے جذبات کی مظہر ہوں یا جن میں اخلاق کے تسلیم شدہ اصول توڑے گئے ہوں وہ خواہ کتنی ہی کمالِ فن کی حامل ہوں کوئی قانون اور کسی سوسائٹی کا ضمیر اُن کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جیب کترنے کا فن اگر چہ ایک لطیف ترین فن ہے اور ہاتھ کی صفائی کا اس سے بہتر کمال شاید ہی کہیں پایا جاتا ہو، مگر کوئی اس کے پھلنے پھولنے کا روادار نہیں ہوتا۔ جعلی نوٹ اور چیک اور دستاویزیں تیار کرنے میں حیرت انگیز ذہانت اور مہارت صرف کی جاتی ہے، مگر کوئی اس آرٹ کی ترقی کو جائز نہیں رکھتا۔ ٹھگی میں انسانی دماغ نے اپنی قوتِ ایجاد کے کیسے کیسے کمالات کا اظہار کیا ہے، مگر کوئی مہذّب سوسائٹی ان کمالات کی قدر کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ پس یہ اصول بجائے خود مسلّم ہے کہ جماعت کی زندگی، اس کا امن، اس کی فلاح و بہبود، ہر فنِ لطیف اور ہر ذوقِ جمال و کمال سے زیادہ قیمتی ہے، اور کسی آرٹ پر اُسے قربان نہیں کیا جا سکتا۔ البتّہ اختلاف جس امر میں ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک چیز کو ہم جماعتی زندگی اور فلاح کے لیے نقصان دِہ سمجھتے ہیں اور دوسرے ایسا نہیں سمجھتے، اگر اس امر میں اُن کا نقطۂ نظر بھی وہی ہو جائے جو ہمارا ہے تو انہیں بھی آرٹ اور ذوق جمال پر وہی پابندیاں عائد کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگے گی جن کی ضرورت ہم محسوس کرتے ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ناجائز صنفی تعلقات کو روکنے کے لیے عورتوں اور مردوں کے درمیان حجابات حائل کرنا اور معاشرت میں ان کے آزادانہ اختلاط پر پابندیاں عائد کرنا دراصل اُن کے اخلاق اور اُن کی سیرت پر حملہ ہے۔ اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ گویا تمام افراد کو بدچلن فرض کر لیا گیا ہے اور یہ کہ ایسی پابندیاں لگانے والوں کو نہ اپنی عورتوں پر اعتماد ہے، نہ مردوں پر۔

بات بڑی معقول ہے، مگر اسی طرزِ استدلال کو ذرا آگے بڑھائیے۔ ہر قفل جو کسی دروازے پر لگایا جاتا ہے، گویا اس امر کا اعلان ہے کہ اس کے مالک نے تمام دنیا کو چور فرض کیا ہے۔ ہر پولس مین کا وجود اس پر شاہد ہے کہ حکومت اپنی تمام رعایا کو بدمعاش سمجھتی ہے۔ ہر لین دین میں جو دستاویز لکھوائی جاتی ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ ایک فریق نے دوسرے فریق کو خائن قرار دیا ہے۔ ہر وہ انسدادی تدبیر جو ارتکاب جرائم کی روک تھام کے لیے اختیار کی جاتی ہے، اس کے عین وجود میں یہ مفہوم شامل ہے کہ اُن سب لوگوں کو امکانی مجرم فرض کیا گیا ہے جس پر اس تدبیر کا اثر پڑتا ہو۔ اس طرزِ استدلال کے لحاظ سے تو آپ ہر آن چور، بدمعاش، خائن اور مشتبہ چال چلن کے آدمی قرار دیے جاتے ہیں۔ مگر آپ کی عزّتِ نفس کو ذرا سی ٹھیس بھی نہیں لگتی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ صرف اسی ایک معاملہ میں آپ کے احساسات اتنے نازک ہو گئے ہیں؟

اصل بات وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، جن لوگوں کے ذہن میں پُرانے اخلاقی تصوّرات کا بچا کھچا اثر ابھی باقی ہے وہ زنا اور صنفی انارکی کو بُرا تو سمجھتے ہیں، مگر ایسا زیادہ بُرا نہیں سمجھتے کہ اس کے قطعی انسداد کی ضرورت محسوس کریں۔ اسی وجہ سے اصلاح وانسداد کی تدابیر میں ہمارا اور اُن کا نقطۂ نظر مختلف ہے۔ اگر فطرت کے حقائق اُن پر پوری طرح منکشف ہو جائیں اور وہ اس معاملے کی صحیح نوعیت سمجھ لیں تو انہیں ہمارے ساتھ اس امر میں اتفاق کرنا پڑے گا کہ انسان جب تک انسان ہے اور اس کے اندر جب تک حیوانیت کا عنصر موجود ہے اس وقت تک کوئی ایسا تمدّن، جو اشخاص کی خواہشات اور اُن کے لطف ولذّت سے بڑھ کر جماعتی زندگی کی فلاح کو عزیز رکھتا ہو، ان تدابیر سے غافل نہیں ہو سکتا۔

۵۔ تعلّقِ زوجین کی صحیح صورت

خاندان کی تاسیس اور صنفی انتشار کا سدِّ باب کرنے کے بعد ایک صالح تمدّن کے لیے جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نظامِ معاشرت میں مرد اور عورت کے تعلّق کی صحیح نوعیت متعیّن کی جائے، ان کے حقوق ٹھیک ٹھیک عدل کے ساتھ مقرر کیے جائیں، ان کے درمیان ذمے داریاں پوری مناسبت کے ساتھ تقسیم کی جائیں اور خاندان میں اُن کے مراتب اور وظائف کا تقرّر اس طور پر ہو کہ اعتدال اور توازن میں فرق نہ آنے پائے۔ تمدّن کے جملہ مسائل میں یہ مسئلہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہے، مگر انسان کو اس گتھی کے سلجھانے میں اکثر ناکامی ہوئی ہے۔

بعض قومیں ایسی ہیں جن میں عورت کو مرد پر قوّام بنایا گیا ہے، مگر ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ اس قسم کی قوموں سے کوئی قوم تہذیب و تمدّن کے کسی اعلیٰ مرتبہ پر پہنچی ہو۔ کم از کم تاریخی معلومات کے ریکارڈ میں تو کسی ایسی قوم کا نشان پایا نہیں جاتا جس نے عورت کو حاکم بنایا ہو، پھر دنیا میں عزّت اور طاقت حاصل کی ہو یا کوئی کارِ نمایاں انجام دیا ہو۔

بیشتر اقوامِ عالم نے مرد کو عورت پر قوّام بنایا ہے، مگر اس ترجیح نے اکثر ظلم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ عورت کو لونڈی بنا کر رکھا گیا۔ اس کی تذلیل و تحقیر کی گئی۔ اس کو کسی قسم کے معاشی اور تمدّنی حقوق نہ دیے گئے۔ اس کو خاندان میں ایک ادنیٰ خدمت گار اور مرد کے لیے آلۂ شہوت رانی بنا کر رکھا گیا اور خاندان سے باہر عورتوں کے ایک گروہ کو کسی حد تک علم اور تہذیب کے زیوروں سے آراستہ کیا بھی گیا تو صرف اس لیے کہ وہ مردوں کے صنفی مطالبات زیادہ دلآویز طریقے سے پورے کریں، ان کے لیے اپنی موسیقی سے لذّتِ گوش، اور اپنے رقص اور ناز و ادا سے لذّتِ نظر، اور اپنے صنفی کمالات سے لذّتِ جسم بن جائیں۔ یہ عورت کی توہین و تذلیل کا سب سے زیادہ شرمناک طریقہ تھا جو مرد کی نفس پرستی نے ایجاد کیا، اور جن قوموں نے یہ طریقہ اختیار کیا وہ خود بھی نقصان سے نہ بچ سکیں۔

جدید مغربی تمدّن نے تیسرا طریقہ اختیار کیا ہے یعنی یہ کہ مردوں اور عورتوں میں مساوات ہو، دونوں کی ذمّے داریاں یکساں اور قریب قریب ایک ہی طرح کی ہوں، دونوں ایک ہی حلقۂ عمل میں مسابقت کریں، دونوں اپنی روزی آپ کمائیں اور اپنی ضروریات کے آپ کفیل ہوں، معاشرت کی تنظیم کا یہ قاعدہ ابھی تک پوری طرح تکمیل کو نہیں پہنچا ہے، کیوں کہ مرد کی فضیلت و برتری اب بھی نمایاں ہے، زندگی کے کسی شعبہ میں بھی عورت مرد کی ہم پلّہ نہیں ہے، اور اس کو وہ تمام حقوق حاصل نہیں ہوئے ہیں جو کامل مساوات کی صورت میں اس کو ملنے چاہئیں، لیکن جس حد تک بھی مساوات قائم کی گئی ہے اس نے ابھی سے نظامِ تمدّن میں فساد برپا کر دیا ہے۔ اس سے پہلے ہم تفصیل کے ساتھ اس کے نتائج بیان کر چکے ہیں، لہٰذا یہاں اس پر مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ تینوں قسم کے تمدّن، عدل اور توازن اور تناسب سے خالی ہیں کیوں کہ انہوں نے فطرت کی رہنمائی کو سمجھنے اور ٹھیک اس کے مطابق طریقہ اختیار کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ اگر

عقلِ سلیم سے کام لے کر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فطرت خود ان مسائل کا صحیح حل بتا رہی ہے، بلکہ یہ بھی دراصل فطرت ہی کی زبردست طاقت ہے جس کے اثر سے عورت نہ تو اس حد تک گر سکی جس حد تک اسے گرانے کی کوشش کی گئی، اور نہ اس حد تک بڑھ سکی جس حد تک اس نے بڑھانا چاہا یا مرد نے اسے بڑھانے کی کوشش کی۔ افراط و تفریط کے دونوں پہلو انسان نے غلط اندیش عقل اور اپنے بہکے ہوئے تخیّلات کے اثر سے اختیار کیے ہیں۔ مگر فطرت عدل اور تناسب چاہتی ہے اور خود اس کی صورت بتاتی ہے۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان ہونے میں مرد اور عورت دونوں مساوی ہیں۔ دونوں نوعِ انسانی کے دو مساوی حصّے ہیں۔ تمدّن کی تعمیر اور تہذیب کی تاسیس و تشکیل اور انسانیت کی خدمت میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ دل، دماغ، عقل، جذبات، خواہشات اور بشری ضروریات دونوں رکھتے ہیں۔ تمدّن کی صلاح و فلاح کے لیے دونوں کی تہذیبِ نفس، دماغی تربیت اور عقلی و فکری نشوونما یکساں ضروری ہے تاکہ تمدّن کی خدمت میں ہر ایک اپنا پورا پورا حصّہ ادا کر سکے۔ اس اعتبار سے مساوات کا دعویٰ بالکل صحیح ہے اور ہر صالح تمدن کا فرض یہی ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اپنی فطری استعداد اور صلاحیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کا موقع دے، اُن کو علم اور اعلیٰ تربیت سے مزیّن کرے، انہیں بھی مَردوں کی طرح تمدّنی و معاشی حقوق ادا کرے اور انہیں معاشرت میں عزّت کا مقام بخشے تاکہ اُن میں عزّتِ نفس کا احساس پیدا ہو اور ان کے اندر وہ بہترین بشری صفات پیدا ہو سکیں جو صرف عزّتِ نفس کے احساس ہی سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ جن قوموں نے اس قسم کی مساوات سے انکار کیا ہے، جنہوں نے اپنی عورتوں کو جاہل، ناتربیت یافتہ، ذلیل اور حقوقِ مدنیّت سے محروم رکھا ہے، وہ خود پستی کے گڑھے میں گر گئی ہیں، کیوں کہ انسانیت کے پورے نصف حصّہ کو گرا دینے کے معنیٰ خود انسانیت کو گرا دینے کے ہیں۔ ذلیل ماؤں کی گودیوں سے عزّت والے اور ناتربیت یافتہ ماؤں کی آغوش سے اعلیٰ تربیت والے اور پست خیال ماؤں کے گہوارے سے اونچے خیال والے انسان نہیں نکل سکتے۔

لیکن مساوات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں کا حلقۂ عمل ایک ہی ہو۔ دونوں ایک ہی سے کام کریں، دونوں پر زندگی کے تمام شعبوں کی ذمّے داریاں یکساں عائد کر دی جائیں اور نظامِ تمدّن میں دونوں کی حیثیتیں بالکل ایک سی ہوں۔ اِس کی تائید میں سائنس کے

مشاہدات اور تجربات سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ عورت اور مرد اپنی جسمانی استعداد اور قوت کے لحاظ سے مساوی (Equipotential) ہیں۔ مگر صرف یہ امر کہ ان دونوں میں اس قسم کی مساوات پائی جاتی ہے۔ اس امر کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ فطرت کا مقصود بھی دونوں سے ایک ہی طرح کے کام لینا ہے۔ ایسی رائے قائم کرنا اس وقت تک دُرست نہیں ہوسکتا جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ دونوں کے نظامِ جسمانی بھی یکساں ہیں۔ دونوں پر فطرت نے ایک ہی جیسی خدمات کا بار بھی ڈالا ہے اور دونوں کی نفسی کیفیات بھی ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ انسان نے اب تک جتنی سائنٹفک تحقیقات کی ہے اس سے ان تینوں تنقیحات کا جواب نفی میں ملتا ہے۔

علم الحیات (Biology) کی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ عورت اپنی شکل وصورت اور ظاہری اعضا سے لے کر اپنے جسم کے ذرّات اور نسیجی خلایا (Protein Molecules of Tissues Cells) تک، ہر چیز میں مرد سے مختلف ہے۔ جس وقت رحم میں بچّے کے اندر صنفی تشکیل (Sex Formation) واقع ہوتی ہے۔ اُسی وقت سے دونوں صنفوں کی جسمانی ساخت بالکل ایک دوسرے سے مختلف صورت میں ترقی کرتی ہے۔ عورت کا پورا نظامِ جسمانی اس طور پر بنایا جاتا ہے کہ بچّہ جننے اور اس کی پرورش کرنے کے لیے مستعد ہو۔ ابتدائی جنینی تشکیل سے لے کر سنِ بلوغ تک اس کے جسم کا پورا نشو ونما اسی استعداد کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے اور یہی چیز اس کی آیندہ زندگی کا راستہ متعیّن کرتی ہے۔

بالغ ہونے پر ایّامِ ماہواری کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کے اثر سے اس کے جسم کے تمام اعضاء کی فعلیت متاثّر ہوتی ہے۔ اکابرِ فنِ حیاتیات وعضویات کے مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایّامِ ماہواری میں عورت کے اندر حسبِ ذیل تغیّرات ہوتے ہیں:

۱۔ جسم میں حرارت کو روکنے کی قوّت کم ہو جاتی ہے، اس لیے حرارت زیادہ خارج ہوتی ہے اور درجۂ حرارت گر جاتی ہے۔

۲۔ نبض سُست ہو جاتی ہے۔ خون کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ خلایائے دم کی تعداد میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔

۳۔ درون افرازی غدود (Endocrines) گلے کی گلٹیوں (Tonsils) اور غدود المفادی (Lymphatic Glands) میں تغیر واقع ہو جاتا ہے۔

۴- پروٹینی تحوّل (Protein Metabolism) میں کمی آ جاتی ہے۔

۵- فاسفیٹس اور کلورائیڈس کے اخراج میں کمی اور ہوائی تحوّل (Gaseous Metabolism) میں انحطاط رونما ہوتا ہے۔

۶- ہضم میں اختلال واقع ہوتا ہے اور غذا کے پروٹینی اجزاء اور چربی کے جزوِ بدن بننے میں کمی ہو جاتی ہے۔

۷- تنفّس کی قابلیت میں کمی اور گویائی کے اعضاء میں خاص تغیرات واقع ہوتے ہیں۔

۸- عضلات میں سُستی اور احساسات میں بلادت آ جاتی ہے۔

۹- ذہانت اور خیالات کو مرکوز کرنے کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔

یہ تغیّرات ایک تندرست عورت کو بیماری کی حالت سے اس قدر قریب کر دیتے ہیں کہ درحقیقت اس وقت صحت اور مرض کے درمیان کوئی واضح خط کھینچنا مشکل ہوتا ہے۔ سو میں سے بہ مشکل ۲۳ عورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو ایّامِ ماہواری بغیر کسی درد اور تکلیف کے آتے ہوں۔ ایک مرتبہ ۱۰۲۰ عورتوں کو بلا انتخاب لے کر اُن کے حالات کی تحقیق کی گئی تو اُن میں سے ۸۴ فی صدی ایسی نکلیں جن کو ایّام ماہواری میں درد اور دوسری قسم کی تکلیفوں سے سابقہ پیش آتا تھا۔ ڈاکٹر امیل نووک جو اس شعبۂ علم کا بڑا محقّق ہے، لکھتا ہے:

''حائضہ عورتوں میں عموماً جو کیفیات پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں۔ دردِ سر، تکان، اعضا شِکنی، اعصابی کمزوری، طبیعت کی پستی، مثانہ کی بے چینی، ہضم کی خرابی، بعض حالات میں قبض، کبھی کبھی متلی اور قے۔ اچھی خاصی تعداد ایسی عورتوں کی ہے جن کی چھاتیوں میں ہلکا سا درد ہوتا ہے اور کبھی کبھی وہ اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ ٹیسیں سی اُٹھتی معلوم ہوتی ہیں۔ بعض عورتوں کا غدّہ درقیہ (تھائی رائڈ) اس زمانے میں سُوج جاتا ہے، جس سے گلا بھاری ہو جاتا ہے، بسا اوقات فتورِ ہضم کی شکایت ہوتی ہے، اور اکثر سانس لینے میں دقّت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کریگر نے جتنی عورتوں کا معائنہ کیا ان میں آدھی ایسی تھیں جن کو ایّامِ ماہواری میں بدہضمی کی شکایت ہو جاتی تھی اور آخری دنوں میں قبض ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر گب ہارڈ کا بیان ہے کہ ایسی عورتیں بہت کم مشاہدہ میں آئی ہیں جن کو زمانۂ حیض میں کوئی تکلیف نہ ہوتی ہو۔ بیشتر ایسی ہی دیکھی گئی ہیں جنہیں دردِ سر، تکان، زیرِ ناف درد اور بھوک کی کمی لاحق ہوتی ہے، طبیعت میں چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے اور رونے کو جی چاہتا ہے۔''

ان حالات کے اعتبار سے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ایّامِ ماہواری میں عورت دراصل بیمار ہوتی ہے۔ یہ ایک بیماری ہی ہے جو اُسے ہر مہینہ لاحق ہوتی رہتی ہے۔

ان جسمانی تغیرات کا اثر لامحالہ عورت کے ذہنی قویٰ اور اس کے افعالِ اعضاء پر بھی پڑتا ہے۔ ۱۹۰۹ میں ڈاکٹر Voice Chevsky نے گہرے مشاہدے کے بعد یہ نتیجہ ظاہر کیا تھا کہ اس زمانے میں عورت کے اندر مرکزیّتِ خیال اور دماغی محنت کی طاقت کم ہوجاتی ہے۔ پروفیسر Krschiskevsky نفسیاتی مشاہدات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس زمانے میں عورت کا نظامِ عصبی نہایت اشتعال پذیر ہوجاتا ہے۔ احساسات میں بلادت اور ناہمواری پیدا ہوجاتی ہے۔ مرتب انعکاسات کو قبول کرنے کی صلاحیت کم اور بسا اوقات باطل ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ پہلے سے حاصل شدہ مرتّب انعکاسات میں بھی بدنظمی پیدا ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے اس کے وہ افعال بھی درست نہیں رہتے جن کی وہ اپنی روزمرّہ زندگی میں خوگر ہوتی ہے۔ ایک عورت جو ٹرام کی کنڈکٹر ہے اس زمانے میں غلط ٹکٹ کاٹ دے گی اور ریزگاری گننے میں الجھے گی۔ ایک موٹر ڈرائیور عورت گاڑی آہستہ اور ڈرتے ڈرتے چلائے گی اور ہر موڑ پر گھبرا جائے گی۔ ایک لیڈی ٹائپسٹ غلط ٹائپ کرے گی، دیر میں کرے گی، کوشش کے باوجود الفاظ چھوڑ جائے گی، غلط جملے بنائے گی، کسی حرف پر انگلی مارنی چاہے گی اور ہاتھ کسی پر جا پڑے گا۔ ایک بیرسٹر عورت کی قوتِ استدلال دُرست نہ رہے گی اور اپنے مقدمہ کو پیش کرنے میں اس کا دماغ اور اس کی قوتِ بیان دونوں غلطی کریں گے۔ ایک مجسٹریٹ عورت کی قوّتِ فہم اور قوّتِ فیصلہ دونوں متاثّر ہوجائیں گی۔ ایک دندان ساز عورت کو اپنا کام کرتے وقت مطلوبہ اوزار مشکل سے ملیں گے۔ ایک گانے والی عورت اپنے لہجہ اور آواز کی خوبی کھودے گی۔ حتیٰ کہ ایک ماہرِ نطقیات محض آواز سُن کر بتادے گا کہ گانے والی اس وقت حالتِ حیض میں ہے۔

پروفیسر لاپنسکی (Lapinsky) اپنی کتاب "The Development of Personality in Woman" میں لکھتا ہے کہ زمانۂ حیض عورت کو اس کی آزادیٔ عمل سے محروم کردیتا ہے۔ وہ اُس وقت اضطراری حرکات کی غلام ہوتی ہے اور اس میں بالارادہ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی قوت بہت کم ہوجاتی ہے۔

یہ سب تغیرات ایک تندرست عورت میں ہوتے ہیں اور بآسانی ترقی کرکے مرض کی

صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ ریکارڈ پر ایسے واقعات بکثرت موجود ہیں کہ اس حالت میں عورت دیوانی سی ہو جاتی ہے۔ ذرا سے اشتعال سے غضبناک ہو جانا، وحشیانہ اور احمقانہ حرکات کر بیٹھنا، حتیٰ کہ خودکشی تک کر گزرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ڈاکٹر کرافٹ ایبنگ (Kraft Abeing) لکھتا ہے کہ روزمرّہ کی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو عورتیں نرم مزاج، سلیقہ منداور خوش خلق ہوتی ہیں اُن کی حالت ایّامِ ماہواری کے آتے ہی یکایک بدل جاتی ہے۔ یہ زمانہ ان کے اوپر گویا ایک طوفان کی طرح آتا ہے، وہ چڑ چڑی، جھگڑالو اور کٹ کھنی ہو جاتی ہیں۔ نوکر اور بچّے اور شوہر سب اُن سے نالاں ہوتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اجنبی لوگوں سے بھی بُری طرح پیش آتی ہیں۔ بعض دوسرے اہلِ فن گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عورتوں سے اکثر جرائم حالتِ حیض میں سرزد ہوتے ہیں کیوں کہ وہ اس وقت اپنے قابو میں نہیں ہوتیں۔ ایک اچھی خاصی نیک عورت اس زمانے میں چوری کر گزرے گی اور بعد میں خود اس کو اپنے فعل پر شرم آئے گی ـــــ وائن برگ (Weinberg) اپنے مشاہدات کی بنا پر لکھتا ہے کہ خودکشی کرنے والی عورتوں میں ۵۰ فی صدی ایسی پائی گئی ہیں جنہوں نے حالتِ حیض میں یہ فعل کیا ہے۔ اسی بنا پر ڈاکٹر کرافٹ ایبنگ کی رائے یہ ہے کہ بالغ عورتوں پر جب کسی جُرم کی پاداش میں مقدمہ چلایا جائے تو عدالت کو اس امر کی تحقیق کر لینی چاہیے کہ یہ جُرم کہیں حالتِ حیض میں تو نہیں کیا گیا ہے۔

ایّامِ ماہواری سے بڑھ کر حمل کا زمانہ عورت پر سخت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ریپریف (Reprev) لکھتا ہے کہ حمل کے زمانے میں عورت کے جسم سے فضلات کا اخراج بسا اوقات فاقہ زدگی کی حالت سے بھی زیادہ مقدار میں ہوتا ہے۔ اس زمانے میں عورت کے قویٰ کسی طرح بھی جسمانی اور دماغی محنت کا وہ بار نہیں سنبھال سکتے جو حمل کے ماسوا دوسرے ایام میں سنبھال سکتے ہیں۔ جو حالات اس زمانے میں عورت پر گزرتے ہیں وہ اگر مرد پر گزریں یا غیر زمانۂ حمل میں خود عورت پر گزریں تو قطعی بیماری کا حکم لگا دیا جائے، اس زمانے میں کئی مہینے تک اس کا نظامِ عصبی مختل رہتا ہے، اس کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے، اس کے تمام عناصر روحی ایک مسلسل بدنظمی کی حالت میں ہوتے ہیں، وہ مرض اور صحت کے درمیان معلّق رہتی ہے اور ایک ادنیٰ سی وجہ اس کو بیماری کی سرحد میں پہنچا سکتی ہے۔ ڈاکٹر فشر کا بیان ہے کہ ایک تندرست عورت بھی حمل کے زمانے میں سخت نفسی اضطراب میں مبتلا رہتی ہے۔ اس میں تلوّن پیدا ہو جاتا ہے، خیالات پریشان رہتے

ہیں۔ ذہن پراگندہ ہوتا ہے، شعور اور غور وفکر اور سمجھ بوجھ کی صلاحیت بہت کم ہوجاتی ہے۔ ہیولاک ایلیس اور البرٹ مول اور بعض دوسرے ماہرین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ زمانۂ حمل کا آخری ایک مہینہ تو ہرگز اس قابل نہیں ہوتا کہ اس میں عورت سے کوئی جسمانی یا دماغی محنت لی جائے۔

وضعِ حمل کے بعد متعدّد بیماریوں کے رُونما ہونے اور ترقی کرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ زچگی کے زخم زہریلے اثرات قبول کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔ قبلِ حمل کی حالت پر واپس جانے کے لیے اعضاء میں ایک حرکت شروع ہوتی ہے جو سارے نظامِ جسمانی کو درہم برہم کردیتی ہے۔ اگر کوئی خطرہ نہ بھی پیش آئے تب بھی اس کو اپنی اصلی حالت پر آنے میں کئی ہفتے لگ جاتے ہیں۔ اِس طرح استقرارِ حمل کے بعد سے پورے ایک سال تک عورت درحقیقت بیمار یا کم از کم نیم بیمار ہوتی ہے اور اس کی قوتِ کارکردگی عام حالت کی بہ نسبت آدھی بلکہ اس سے بھی کم رہ جاتی ہے۔

پھر رضاعت کا زمانہ ایسا ہوتا ہے جس میں درحقیقت وہ اپنے لیے نہیں جیتی بلکہ اُس امانت کے لیے جیتی ہے جو فطرت نے اس کے سپرد کی ہے۔ اس کے جسم کا جوہر جو اس کے بچّے کے لیے دودھ بنتا ہے۔ جو کچھ غذا وہ کھاتی ہے اس میں صرف اسی قدر حصّہ اُس کے جسم کو ملتا ہے جس قدر اسے زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ باقی سب کا سب دودھ کی پیدائش میں صرف ہوتا ہے۔

اس کے بعد ایک مدّت دراز تک بچّے کی پرورش، نگہداشت اور تربیت پر اُس کو تمام تر اپنی توجہ صرف کرنی پڑتی ہے۔

موجودہ زمانے میں مسئلۂ رضاعت کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ بچّوں کو خارجی غذاؤں پر رکھا جائے لیکن یہ کوئی صحیح حل نہیں ہے۔ اِس لیے کہ فطرت نے بچّے کی پرورش کا جو سامان ماں کے سینے میں رکھ دیا ہے، اُس کا صحیح بدل اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ بچّے کو اس سے محروم کرنا ظلم اور خودغرضی کے سوا کچھ نہیں۔ تمام ماہرینِ فن اِس بات پر متفق ہیں کہ بچّے کے صحیح نشو ونما کے لیے ماں کے دودھ سے بہتر کوئی غذا نہیں۔

اِسی طرح تربیتِ اطفال کے لیے بھی نرسنگ ہوم اور تربیت گاہِ اطفال کی تجویزیں نکالی گئی ہیں تاکہ مائیں اپنے بچّوں سے بے فکر ہوکر بیرونِ خانہ کے مشاغل میں منہمک ہوسکیں، لیکن

کسی نرسنگ ہوم اور کسی تربیت گاہ میں شفقتِ مادری فراہم نہیں کی جاسکتی۔ طفولیت کا ابتدائی زمانہ جس محبت اور دردمندی و خیر سگالی کا محتاج ہے وہ کرایہ کی پالنے پوسنے والیوں کے سینے میں کہاں سے آسکتی ہے۔ تربیتِ اطفال کے یہ جدید طریقے ابھی تک آزمودہ نہیں ہیں۔ ابھی تک اُن کی سیرت، اُن کے اخلاق، ان کے کارنامے دنیا کے سامنے نہیں آئے ہیں کہ اس تجربہ کی کامیابی و ناکامی کے متعلق کوئی رائے قائم کی جاسکے۔ لہٰذا اس طریقے کے متعلق یہ دعویٰ کرنا قبل از وقت ہے کہ دنیا نے ماں کی آغوش کا صحیح بدل پالیا ہے۔ کم از کم اس وقت تک تو یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ بچّہ کی فطری تربیت گاہ اس کی ماں کی آغوش ہی ہے۔

اب یہ بات ایک معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر عورت اور مرد دونوں کی جسمانی اور دماغی قوت واستعداد بالکل مساوی بھی ہے، تب بھی فطرت نے دونوں پر مساوی بار نہیں ڈالا ہے۔ بقائے نوع کی خدمت میں تخم ریزی کے سوا اور کوئی کام مرد کے سپرد نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد وہ بالکل آزاد ہے، زندگی کے جس شعبہ میں چاہے کام کرے۔ بخلاف اس کے اس خدمت کا پورا بار عورت پر ڈال دیا گیا ہے۔ اسی بار کے سنبھالنے کے لیے اس وقت سے مستعد کیا جاتا ہے جب کہ وہ ماں کے پیٹ میں محض ایک مضغۂ گوشت ہوتی ہے۔ اسی کے لیے اس کے جسم کی ساری مشین موزوں کی جاتی ہے۔ اسی کے لیے اس پر جوانی کے پورے زمانے میں ایامِ ماہواری کے دَورے آتے ہیں جو ہر مہینے میں تین سے لے کر سات یا دس دن تک اُس کو کسی بڑی ذمّے داری کا بار سنبھالنے اور کوئی اہم جسمانی یا دماغی محنت کرنے کے قابل نہیں رکھتے۔ اسی کے لیے اس پر حمل اور مابعد حمل کا پورا ایک سال سختیاں جھیلتے گزرتا ہے جس میں وہ درحقیقت نیم جان ہوتی ہے۔ اسی کے لیے اس پر رضاعت کے پورے دو سال اس طرح گزرتے ہیں کہ وہ اپنے خون سے انسانیت کی کھیتی کو سینچتی ہے اور اُسے اپنے سینے کی نہروں سے سیراب کرتی ہے۔ اسی کے لیے اس پر بچّے کی ابتدائی پرورش کے کئی سال اِس محنت ومشقّت میں گزرتے ہیں کہ اس پر رات کی نیند اور دن کی آسائش حرام ہوتی ہے اور وہ اپنی راحت، اپنے لُطف، اپنی خواہشات، غرض ہر چیز کو آنے والی نسل پر قربان کردیتی ہے۔

جب حال یہ ہے تو غور کیجیے کہ عدل کا تقاضا کیا ہے؟ کیا عدل یہی ہے کہ عورت سے ان فطری ذمے داریوں کی بجا آوری کا بھی مطالبہ کیا جائے جن میں مرد اس کا شریک نہیں ہے

اور پھر اُن تمدّنی ذمّے داریوں کا بوجھ بھی اس پر مرد کے برابر ڈال دیا جائے جن کو سنبھالنے کے لیے مرد فطرت کی تمام ذمّے داریوں سے آزاد رکھا گیا ہے، اس سے کہا جائے کہ تو وہ ساری مصیبتیں بھی برداشت کر جو فطرت نے تیرے اوپر ڈالی ہیں اور پھر ہمارے ساتھ آکر روزی کمانے کی مشقّتیں بھی اُٹھا، سیاست اور عدالت اور صنعت وحرفت اور تجارت وزراعت اور قیامِ امن اور مدافعتِ وطن کی خدمتوں میں بھی برابر کا حصّہ لے، ہماری سوسائٹی میں آکر ہمارا دل بھی بہلا اور ہمارے لیے عیش ومسرّت اور لطف ولذّت کے سامان بھی فراہم کر؟ یہ عدل نہیں، ظلم ہے۔ مساوات نہیں صریح نامساوات ہے۔ عدل کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیے کہ جس پر فطرت نے بہت زیادہ بار ڈالا ہے اس کو تمدّن کے ہلکے اور سبک کام سپرد کیے جائیں اور جس پر فطرت نے کوئی بار نہیں ڈالا اس پر تمدّن کی اہم اور زیادہ محنت طلب ذمّے داریوں کا بار ڈالا جائے، اور اسی کے سپرد یہ خدمت بھی کی جائے کہ وہ خاندان کی پرورش اور اس کی حفاظت کرے۔

صرف یہی نہیں کہ عورت پر بیرونِ خانہ کی ذمے داریاں ڈالنا ظلم ہے، بلکہ درحقیقت وہ ان مردانہ خدمات کو انجام دینے کی پوری طرح اہل بھی نہیں ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اِن کاموں کے لیے وہی کارکن موزوں ہو سکتے ہیں، جن کی قوتِ کارکردگی پائدار ہو، جو مسلسل اور علی الدوام اپنے فرائض کو یکساں اہلیت کے ساتھ انجام دے سکتے ہوں، اور جن کی دماغی وجسمانی قوتوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہو، لیکن جن کارکنوں پر ہمیشہ ہر مہینہ ایک کافی مدّت کے لیے عدمِ اہلیت یا کمیِ اہلیت کے دَورے پڑتے ہوں، اور جن کی قوّتِ کارکردگی بار بار معیارِ مطلوب سے گھٹ جایا کرتی ہو، وہ کس طرح ان ذمّے داریوں کا بار اٹھا سکتے ہیں؟ اس فوج یا اس بحری بیڑے کی حالت کا اندازہ کیجیے جو عورتوں پر مشتمل ہو اور جس میں عین موقع کارزار پر کئی فیصدی تو ایّامِ ماہواری کی وجہ سے نیم بیکار ہو رہی ہوں، ایک اچھی خاصی تعداد زچگی کی حالت میں بستروں پر پڑی ہو، اور ایک معتد بہ جماعت حاملہ ہونے کی وجہ سے ناقابلِ کار ہو رہی ہو۔ فوج کی مثال کو آپ کہہ دیں گے کہ یہ زیادہ سخت قسم کے فرائض سے تعلق رکھتی ہے، مگر پولس، عدالت، انتظامی محکمے، سفارتی خدمات، ریلوے، صنعت وحرفت اور تجارت کے کام، ان میں سے کس کی ذمّے داریاں ایسی ہیں جو مسلسل قابلِ اعتماد کارکردگی کی اہلیت نہ چاہتی ہوں؟ پس جو لوگ عورتوں سے مردانہ کام لینا چاہتے ہیں اُن کا مطلب شاید یہ ہے کہ یا تو سب عورتوں کو ناعورت بنا کر نسلِ انسانی کا خاتمہ کر دیا

جائے یا یہ کہ ان میں سے چند فی صدی لازماً ناعورت بننے کی سزا کے لیے منتخب کی جاتی رہیں، یا یہ کہ تمام معاملاتِ تمدّن کے لیے اہلیت کا معیار بالعموم گھٹا دیا جائے۔

مگر خواہ آپ ان میں سے کوئی صورت بھی اختیار کریں، عورت کو مردانہ کاموں کے لیے تیار کرنا عین اقتضائے فطرت اور وضعِ فطرت کے خلاف ہے، اور یہ چیز نہ انسانیت کے لیے مفید ہے نہ خود عورت کے لیے چونکہ علم الحیات کی رُو سے عورت کو بچّہ کی پیدائش اور پرورش ہی کے لیے بنایا گیا ہے، اس لیے نفسیات کے دائرے میں بھی اس کے اندر وہی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں جو اس کے فطری وظیفہ کے لیے موزوں ہیں۔ یعنی محبت، ہمدردی، رحم و شفقت، رقّتِ قلب، ذکاوتِ حس اور لطافتِ جذبات اور چوں کہ صنفی زندگی میں مرد کو فعل کا اور عورت کو انفعال کا مقام دیا گیا ہے اس لیے عورت کے اندر تمام وہی صفات پیدا کی گئی ہیں جو اُسے زندگی کے صرف منفعلانہ پہلو میں کام کرنے کے لیے تیار کرتی ہیں۔ اس کے اندر سختی اور شدّت کے بجائے نرمی اور نزاکت اور لچک ہے۔ اس میں اثر اندازی کے بجائے اثر پذیری ہے۔ فعل کے بجائے انفعال ہے۔ جمنے اور ٹھیرنے کے بجائے جھکنے اور ڈھل جانے کی صلاحیت ہے، بے باکی اور جسارت کے بجائے منع و فرار اور رکاوٹ ہے۔ کیا اِن خصوصیات کو لے کر وہ کبھی ان کاموں کے لیے موزوں ہو سکتی ہے اور اُن دوائرِ حیات میں کامیاب ہو سکتی ہے جو شدّت، تحکّم، مزاحمت اور سرد مزاجی چاہتے ہیں، جن میں نرم جذبات کی بجائے مضبوط ارادے اور بے لاگ رائے کی ضرورت ہے؟ تمدّن کے ان شعبوں میں عورت کو گھسیٹ لانا خود اس کو بھی ضائع کرنا ہے اور ان شعبوں کو بھی۔

اس میں عورت کے لیے ارتقا نہیں، بلکہ انحطاط ہے، ارتقا اس کو نہیں کہتے کہ کسی کی قدرتی صلاحیتوں کو دبایا اور مٹایا جائے اور اس میں مصنوعی طور پر وہ صلاحیتیں پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جو فطری طور پر اس کے اندر نہ ہوں۔ بلکہ ارتقا اس کا نام ہے کہ قدرتی صلاحیتوں کو نشو و نما دیا جائے، اُن کو نکھارا اور چمکایا جائے اور اُن کے لیے بہتر سے بہتر عمل کے مواقع پیدا کیے جائیں۔

اس میں عورت کے لیے کامیابی نہیں بلکہ ناکامی ہے۔ زندگی کے ایک پہلو میں عورتیں کمزور ہیں اور مرد بڑھے ہوئے ہیں۔ دوسرے پہلو میں مرد کمزور ہیں اور عورتیں بڑھی ہوئی ہیں۔

تم غریب عورتوں کو اس پہلو میں مرد کے مقابلے پر لاتے ہو جس میں وہ کمزور ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ عورتیں ہمیشہ مردوں سے کمتر رہیں گی۔ تم خواہ کتنی ہی تدبیریں کرلو، ممکن نہیں ہے کہ عورتوں کی صنف سے ارسطو، ابن سینا، کانٹ، ہیگل، خیام، شیکسپیئر، سکندر، نپولین، صلاح الدین، نظام الملک طوسی اور بسمارک کی ٹکر کا ایک فرد بھی پیدا ہو سکے، البتہ تمام دنیا کے مرد چاہے کتنا ہی سر مار لیں، وہ اپنی پوری صنف میں سے ایک معمولی درجہ کی ماں بھی پیدا نہیں کر سکتے۔

اس میں خود تمدّن کا بھی فائدہ نہیں، بلکہ نقصان ہے۔ انسانی زندگی اور تہذیب کو جتنی ضرورت غلظت، شدّت اور صلابت کی ہے اتنی ہی ضرورت رقّت، نرمی اور لچک کی بھی ہے۔ جتنی ضرورت اچھے سپہ سالاروں، اچھے مدبّروں اور اچھے منتظمین کی ہے، اتنی ہی ضرورت اچھی ماؤں، اچھی بیویوں اور اچھی خانہ داروں کی بھی ہے۔ دونوں عنصروں میں جس کو بھی ساقط کیا جائے گا تمدّن بہر حال نقصان اٹھائے گا۔

یہ وہ تقسیمِ عمل ہے جو خود فطرت نے انسان کی دونوں صنفوں کے درمیان کر دی ہے۔ حیاتیات، عضویات، نفسیات اور عمرانیات کے تمام علوم اس تقسیم کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ بچّہ جننے اور پالنے کی خدمت کا عورت کے سپرد ہونا ایک ایسی فیصلہ کن حقیقت ہے جو خود بہ خود انسانی تمدّن میں اُس کے لیے ایک دائرۂ عمل مخصوص کر دیتی ہے، اور کسی مصنوعی تدبیر میں یہ طاقت نہیں ہے کہ فطرت کے اس فیصلہ کو بدل سکے۔ ایک صالح تمدّن وہی ہو سکتا ہے جو اوّلاً اس فیصلہ کو جوں کا توں قبول کرے، پھر عورت کو اس کے صحیح مقام پر رکھ کر اُسے معاشرت میں عزّت کا مرتبہ دے، اس کے جائز تمدّنی و معاشی حقوق تسلیم کرے، اُس پر صرف گھر کی ذمّے داریوں کا بار ڈالے اور بیرونِ خانہ کی ذمّے داریاں اور خاندان کی قوامیت مرد کے سپرد کر دے۔ جو تمدّن اس تقسیم کو مٹانے کی کوشش کرے گا وہ عارضی طور پر مادّی حیثیت سے ترقی اور شان و شوکت کے کچھ مظاہر پیش کر سکتا ہے، لیکن بالآخر ایسے تمدن کی بربادی یقینی ہے۔ کیوں کہ جب عورت پر مرد کے برابر معاشی و تمدنی ذمے داریوں کا بوجھ ڈالا جائے گا تو وہ اپنے اوپر سے فطری ذمے داریوں کا بوجھ اُتار پھینکے گی اور اس کا نتیجہ نہ صرف تمدّن بلکہ خود انسانیت کی بربادی ہوگا۔ عورت اپنی افتادِ طبع اور اپنی فطری ساخت کے خلاف اگر کوشش کرے تو کسی نہ کسی حد تک مرد کے سب کاموں کا بوجھ سنبھال لے جائے گی، لیکن مرد کسی طرح بھی اپنے آپ کو بچّے جننے اور پالنے کے قابل نہیں بنا سکتا۔

فطرت کی اس تقسیمِ عمل کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاندان کی جو تنظیم اور معاشرت میں مرد و عورت کے وظائف کی جو تعیین کی جائے گی اس کے ضروری ارکان لامحالہ حسب ذیل ہوں گے:

(۱) خاندان کے لیے روزی کمانا، اس کی حمایت و حفاظت کرنا اور تمدن کی محنت طلب خدمات انجام دینا مرد کا کام ہو اور اس کی تعلیم و تربیت ایسی ہو کہ وہ ان اغراض کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بن سکے۔

(۲) بچّوں کی پرورش، خانہ داری کے فرائض اور گھر کی زندگی کو سکون و راحت کی جنت بنانا عورت کا کام ہو اور اس کو بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت دے کر انہی اغراض کے لیے تیار کیا جائے۔

(۳) خاندان کے نظم کو برقرار رکھنے اور اس کو طوائف الملوکی سے بچانے کے لیے ایک فرد کو قانونی حدود کے اندر ضروری حاکمانہ اختیارات حاصل ہوں تاکہ خاندان ایک بن سری فوج بن کر نہ رہ جائے۔ ایسا فرد صرف مرد ہی ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ جس رکنِ خاندان کی دماغی اور قلبی حالت بار بار ایامِ ماہواری اور حمل کے زمانے میں بگڑتی ہو وہ بہرحال ان اختیارات کو استعمال کرنے کے قابل نہیں ہوسکتا۔

(۴) تمدّن کے نظام میں اس تقسیم اور تربیت و تنظیم کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تحفظات رکھے جائیں تاکہ بے عقل افراد اپنی حماقت سے مردوں اور عورتوں کے حلقہ ہائے عمل مخلوط کر کے اِس صالح تمدنی نظام کو درہم برہم نہ کرسکیں۔

باب۸:

انسانی کوتاہیاں

گزشتہ صفحات میں خالص علمی تحقیق اور سائنٹیفک مشاہدات و تجربات کی مدد سے ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر انسانی فطرت کے مقتضیات اور انسان کی ذہنی افتاد اور جسمانی ساخت کی تمام دلالتوں کا لحاظ کر کے تمدّن کا ایک صحیح نظام مرتّب کیا جائے تو صنفی معاملات کی حد تک اس کے ضروری اصول وارکان کیا ہونے چاہئیں۔ اس بحث میں کوئی چیز ایسی بیان نہیں کی گئی ہے جو متشابہات میں سے ہو، یا جس میں کسی کلام کی گنجایش ہو۔ جو کچھ کہا گیا ہے وہ علم وحکمت کے مُحکمات میں سے ہے اور عموماً سب ہی اہلِ علم و عقل اس سے واقف ہیں لیکن انسانی عجز کا کمال دیکھیے کہ جتنے نظامِ تمدّن خود انسان نے وضع کیے ہیں ان میں سے ایک میں بھی فطرت کی ان معلوم و معروف ہدایات کو بہ تمام وکمال اور بحُسنِ تناسب ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان خود اپنی فطرت کے مقتضیات سے ناواقف نہیں ہے۔ اس سے خود اپنی ذہنی کیفیات اور جسمانی خصوصیات چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ آج تک وہ کوئی ایسا معتدل نظامِ تمدّن وضع کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا جس کے اصول و مناہج میں پورے توازن کے ساتھ اِن سب مقتضیات و خصوصیات اور سب مصالح و مقاصد کی رعایت کی گئی ہو۔

نارسائی کی حقیقی علّت

اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم اس کتاب کی ابتدا میں اشارہ کر چکے ہیں۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ اس کی نظر کسی معاملہ کے تمام پہلوؤں پر من حیث الکل حاوی نہیں

ہوسکتی۔ ہمیشہ کوئی ایک پہلو اُسے زیادہ اپیل کرتا ہے اور اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ پھر جب وہ ایک طرف مائل ہو جاتا ہے تو دوسرے اطراف یا تو اس کی نظر سے بالکل ہی او جھل ہو جاتے ہیں یا وہ قصداً اُن کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ زندگی کے جزئی اور انفرادی معاملات تک میں انسان کی یہ کمزوری نمایاں نظر آتی ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ تمدّن وتہذیب کے وسیع تر مسائل، جن میں سے ہر ایک اپنے اندر بے شمار جلی وخفی گوشے رکھتا ہے۔ اس کمزوری کے اثر سے محفوظ رہ جائیں، علم اور عقل کی دولت سے انسان کو سرفراز تو ضرور کیا گیا ہے، مگر عموماً زندگی کے معاملات میں خالص عقلیّت اس کی رہنما نہیں ہوتی۔ جذبات اور رجحانات پہلے اس کو ایک رُخ پر موڑ دیتے ہیں۔ پھر جب وہ اس خاص رخ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تب عقل سے استدلال کرتا ہے اور علم سے مدد لیتا ہے۔ اس حالت میں اگر خود اس کا علم اس کو معاملے کے دوسرے رُخ دکھائے اور اس کی اپنی عقل اس کی یک رُخی پر متنبّہ کرے تب بھی وہ اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا بلکہ علم وعقل کو مجبور کرتا ہے کہ اس کے رجحان کی تائید میں دلائل اور تاویلات فراہم کریں۔

چند نمایاں مثالیں

معاشرت کے جس مسئلے سے اس وقت ہم بحث کر رہے ہیں، اس میں انسان کی یہی یک رُخی اپنی افراط وتفریط کی پوری شان کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے۔

ایک گروہ اخلاق اور روحانیت کے پہلو کی طرف جھکا اور اس میں یہاں تک غلو کر گیا کہ عورت اور مرد کے صنفی تعلق ہی کو سرے سے ایک قابلِ نفرت چیز قرار دے بیٹھا۔ یہ بے اعتدالی ہم کو بدھ مت، مسیحیت اور بعض ہندو مذاہب میں نظر آتی ہے۔ اور اسی کا اثر ہے کہ اب تک دنیا کے ایک بڑے حصّہ میں صنفی تعلّق کو بجائے خود ایک بدی سمجھا جاتا ہے، عام اس سے کہ وہ ازدواج کے دائرے میں ہو یا اس سے باہر۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ کہ رہبانیت کی غیر فطری اور غیر متمدِّن زندگی کو اخلاق اور طہارتِ نفس کا نصب العین سمجھا گیا۔ نوعِ انسانی کے بہت سے افراد تھے جس میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی، اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو فطرت سے انحراف بلکہ جنگ میں ضائع کر دیا اور جو لوگ فطرت کے اقتضا سے باہم ملے بھی تو اس طرح جیسے کوئی شخص مجبوراً اپنی کسی گندی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا تعلق نہ تو زوجین کے درمیان

محبت اور تعاون کا تعلق بن سکتا ہے اور نہ اس سے کوئی صالح اور ترقی پذیر تمدّن وجود میں آسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ نظامِ معاشرت میں عورت کے مرتبے کو گرانے کی ذمے داری بھی بڑی حد تک اسی نام نہاد اخلاقی تصوّر پر ہے۔ رہبانیت کے پرستاروں نے صنفی کشش کو شیطانی وسوسہ، اور اس کشش کی محرک، یعنی عورت کو شیطان کا ایجنٹ قرار دیا ہے، اور اس کو ایسا ناپاک وجود ٹھیرایا جس سے نفرت کرنا ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو طہارتِ نفس چاہتا ہو۔ مسیحی، بودھ اور ہندو لٹریچر میں عورت کا یہی تصوّر غالب ہے اور جو نظامِ معاشرت اس تصوّر کے ماتحت مرتب کیا گیا ہو اس میں عورت کا مرتبہ جیسا کچھ ہوسکتا ہے اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

اس کے برعکس دوسرے گروہ نے انسان کے داعیاتِ جسمانی کی رعایت کی تو اس میں اتنا غلو کیا کہ فطرتِ انسانی تو درکنار، فطرتِ حیوانی کے مقتضیات کو بھی نظر انداز کر دیا۔ مغربی تمدّن میں یہ کیفیت اس قدر نمایاں ہو چکی ہے کہ اب چھپائے نہیں چھپ سکتی۔ اس کے قانون میں زنا کوئی جرم ہی نہیں ہے۔ جرم اگر ہے تو جبر و اکراہ ہے، یا کسی دوسرے قانونی حق میں مداخلت۔ ان دونوں میں سے کسی جرم کی مشارکت نہ ہو تو زنا (صنفی تعلقات کا انتشار) بجائے خود کوئی قابلِ تعزیر جرم، حتّٰی کہ کوئی قابلِ شرم اخلاقی عیب بھی نہیں ہے۔ یہاں تک تو وہ کم از کم حیوانی فطرت کی حد میں تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ اس سے بھی آگے بڑھا۔ اس نے صنفی تعلق کے حیوانی مقصد یعنی تناسل اور بقائے نوع کو بھی نظر انداز کر دیا اور اُسے محض جسمانی لطف و لذّت کا ذریعہ بنا لیا۔ یہاں پہنچ کر وہی انسان جو احسنِ تقویم پر پیدا کیا گیا تھا، اسفلِ سافلین میں پہنچ جاتا ہے۔ پہلے وہ اپنی انسانی فطرت سے انحراف کر کے حیوانات کا سا منتشر صنفی تعلق اختیار کرتا ہے جو کسی تمدّن کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ پھر وہ اپنی حیوانی فطرت سے بھی انحراف کرتا ہے اور اس تعلق کے فطری نتیجے یعنی اولاد کی پیدائش کو بھی روک دیتا ہے تاکہ دنیا میں اس کی نوع کو باقی رکھنے والی نسلیں وجود میں ہی نہ آنے پائیں۔

ایک جماعت نے خاندان کی اہمیت کو محسوس کیا تو اس کی تنظیم اس قدر بندشوں کے ساتھ کی کہ ایک فرد کو جکڑ کر رکھ دیا اور حقوق و فرائض میں کوئی توازن ہی باقی نہ رکھا۔ اس کی ایک نمایاں مثال ہندوؤں کا خاندانی نظام ہے۔ اس میں عورت کے لیے ارادے اور عمل کی کوئی آزادی نہیں۔ تمدّن اور معیشت میں اس کا کوئی حق نہیں۔ وہ لڑکی ہے تو لونڈی ہے۔ بیوی ہے تو

لونڈی ہے، ماں ہے تو لونڈی ہے، بیوہ ہے تو لونڈی سے بھی بدتر، زندہ در گور ہے۔ اس کے حصّہ میں صرف فرائض ہی فرائض ہیں، حقوق کے خانہ میں ایک عظیم الشان صفر کے سوا کچھ نہیں۔ اس نظامِ معاشرت میں عورت کو ابتدا ہی سے ایک بے زبان جانور بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تا کہ اس میں سرے سے اپنی خودی کا کوئی شعور پیدا ہی نہ ہو۔ بلاشبہ اس طریقے سے خاندان کی بنیادوں کو بہت مضبوط کر دیا گیا اور عورت کی بغاوت کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ لیکن جماعت کے پورے نصف حصّے کو ذلیل اور پست کر کے اس نظامِ معاشرت نے درحقیقت اپنی تعمیر میں خرابی کی صورت اور بڑی خطرناک صورت پیدا کر دی جس کے نتائج کو اب خود ہندو بھی محسوس کر رہے ہیں۔

ایک دوسری جماعت نے عورت کے مرتبے کو بلند کرنے کی کوشش کی اور اس کو ارادہ و عمل کی آزادی بخشی تو اس میں اتنا غلو کیا کہ خاندان کا شیرازہ ہی درہم برہم کر دیا۔ بیوی ہے تو آزاد، بیٹی ہے تو آزاد، بیٹا ہے تو آزاد، خاندان کا درحقیقت کوئی سر دھرا نہیں ہے، کسی کو کسی پر اقتدار نہیں، بیوی سے شوہر نہیں پوچھ سکتا کہ تو نے رات کہاں بسر کی۔ بیٹی سے باپ نہیں پوچھ سکتا کہ تو کس سے ملتی ہے اور کہاں جاتی ہے۔ زوجین درحقیقت دو برابر کے دوست ہیں جو مساوی شرائط کے ساتھ مل کر ایک گھر بناتے ہیں اور اولاد کی حیثیت اس ایسوسی ایشن میں محض چھوٹے ارکان کی سی ہے۔ مزاج اور طبائع کی ایک ادنیٰ ناموافقت اِس بنے ہوئے گھر کو ہر وقت بگاڑ سکتی ہے، کیوں کہ اطاعت کا ضروری عنصر، جو ہر نظم کو برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر ہے، اس جماعت میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ یہ مغربی معاشرت ہے۔ وہی مغربی معاشرت جس کے علمبرداروں کو اصولِ تمدّن و عمران میں پیغمبری کا دعویٰ ہے۔ ان کی پیغمبری کا صحیح حال آپ کو دیکھنا ہو تو یورپ اور امریکہ کی کسی عدالتِ نکاح و طلاق یا کسی عدالتِ جرائم اطفال (Juvenile Court) کی رُوداد اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ ابھی حال میں انگلستان کے ہوم آفس سے جرائم کے جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سِن لڑکوں اور لڑکیوں میں جرائم کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے، اور اس کی خاص وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ خاندان کا ڈسپلن بہت کمزور ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو: Blue Book of Crime Statistic 1934

انسان اور خصوصاً عورت کی فطرت میں شرم و حیا کا جو مادّہ رکھا گیا ہے، اس کو ٹھیک

ٹھیک سمجھنے اور عملاً لباس اور طرزِ معاشرت کے اندر اس کی صحیح ترجمانی کرنے میں تو کسی انسانی تمدّن کو کامیابی نہیں ہوئی۔ شرم وحیا کو انسان اور خاص کر عورت کی بہترین صفات میں شمار کیا گیا ہے۔ مگر لباس ومعاشرت میں اس کا ظہور کسی عقلی طریقے اور کسی ہموار ضابطے کی صورت میں نہیں ہوا۔ سترِ عورت کے صحیح حدود متعین کرنے اور یکسانی کے ساتھ اُن کو ملحوظ رکھنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ مردوں اور عورتوں کے لباس اور اُن کے آداب واطوار میں حیاداری کی صورتیں کسی اصول کے تحت مقرر نہیں کی گئیں۔ معاشرت میں مرد اور مرد، عورت اور عورت، مرد اور عورت کے درمیان کشف وحجاب کی مناسب اور معقول حد بندی کی ہی نہیں گئی۔ تہذیب وشائستگی اور اخلاقِ عامّہ کے نقطۂ نظر سے یہ معاملہ جتنا اہم تھا، اتنا ہی اس کے ساتھ تغافل برتا گیا۔ اس کو کچھ تو رسم ورواج پر چھوڑ دیا گیا، حالاں کہ رسم ورواج اجتماعی حالات کے ساتھ بدل جانے والی چیز ہے، اور کچھ افراد کے ذاتی رجحان وانتخاب پر منحصر کر دیا گیا، حالاں کہ نہ جذبۂ شرم وحیا کے اعتبار سے تمام اشخاص یکساں ہیں اور نہ ہر شخص اتنی سلامتِ ذوق اور صحیح قوتِ انتخاب رکھتا ہے کہ اپنے اس جذبہ کے لحاظ سے خود کوئی مناسب طریقہ اختیار کر سکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مختلف جماعتوں کے لباس اور معاشرت میں حیاداری اور بے حیائی کی عجیب آمیزش نظر آتی ہے، جس میں کوئی عقلی مناسبت، کوئی یکسانی، کوئی ہمواری، کسی اصول کی پابندی نہیں پائی جاتی۔ مشرقی ممالک میں تو یہ چیز صرف بے ڈھنگے پن ہی تک محدود رہی، لیکن مغربی قوموں کے لباس اور معاشرت میں جب بے حیائی کا عنصر حد سے زیادہ بڑھا تو انھوں نے سرے سے ''شرم وحیا کی جڑ ہی کاٹ دی۔ اُن کا جدید نظریہ یہ ہے کہ شرم وحیا دراصل کوئی فطری جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ محض لباس پہننے کی عادت نے اس کو پیدا کر دیا ہے۔ سترِ عورت اور حیاداری کا کوئی تعلق اخلاق وشائستگی سے نہیں بلکہ وہ تو درحقیقت انسان کے داعیاتِ صنفی کو تحریک دینے والے اسباب میں سے ایک سبب[1] ہے۔'' اسی فلسفۂ بے حیائی کی عملی تفسیریں ہیں وہ نیم عریاں لباس، وہ جسمانی حُسن کے مقابلے، وہ برہنہ ناچ، وہ ننگی تصویریں، وہ اسٹیج پر فاحشانہ مظاہرے، وہ برہنگی (Nudism) کی روز افزوں تحریک، وہ حیوانیتِ محضہ کی طرف انسان کی واپسی۔

---

(۱) یہ لفظ بہ لفظ وہی خیال ہے جو ویسٹر مارک (Wester Marck) نے اپنی کتاب The History of Human Marriage میں ظاہر کیا ہے۔

یہی بے اعتدالی اس مسئلہ کے دوسرے اطراف میں بھی نظر آتی ہے۔
جن لوگوں نے اخلاق اور عصمت کو اہمیت دی انہوں نے عورت کی حفاظت ایک جاندار، ذی عقل، ذی روح وجود کی حیثیت سے نہیں کی بلکہ ایک بے جان زیور، ایک قیمتی پتھر کی طرح کی، اور اس کی تعلیم وتربیت کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ حالاں کہ تہذیب وتمدّن کی بہتری کے لیے یہ سوال عورت کے حق میں بھی اتنا ہی اہم تھا جتنا مرد کے لیے تھا۔ بخلاف اس کے جنہوں نے تعلیم وتربیت کی اہمیت کو محسوس کیا انہوں نے اخلاق اور عصمت کی اہمیت کو نظر انداز کر کے ایک دوسری حیثیت سے تمدّن وتہذیب کی تباہی کا سامان مہیّا کر دیا۔
جن لوگوں نے فطرت کی تقسیمِ عمل کا لحاظ کیا انہوں نے تمدّن ومعاشرت کی خدمات میں سے صرف خانہ داری اور تربیتِ اطفال کی ذمے داریاں عورت پر عاید کیں اور مرد پر رزق مہیّا کرنے کا بار ڈالا۔ لیکن اس قسم میں وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ انہوں نے عورت سے تمام معاشی حقوق سلب کر لیے، وراثت میں اس کو کسی قسم کا حق نہ دیا، ملکیت کے تمام حقوق مرد کی طرف منتقل کر دیے، اور اس طرح معاشی حیثیت سے عورت کو بالکل بے دست وپا کر کے عورت اور مرد کے درمیان درحقیقت لونڈی اور آقا کا تعلق قائم کر دیا۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا گروہ اٹھا، جس نے بے انصافی کی تلافی کرنی چاہی اور عورت کو اس کے معاشی وتمدّنی حقوق دلانے کا ارادہ کیا مگر یہ لوگ ایک دوسری غلطی کے مرتکب ہو گئے۔ اُن کے دماغوں پر مادّیت کا غلبہ تھا، اس لیے انہوں نے عورت کو معاشی وتمدّنی غلامی سے نجات دلانے کے معنیٰ یہ سمجھے کہ اس کو بھی مرد کی طرح خاندان کا کمانے والا فرد بنا دیا جائے اور تمدّن کی ساری ذمے داریوں کو سنبھالنے میں مرد کے ساتھ برابر شریک کیا جائے۔ مادیت کے نقطہ نظر سے اس طریقہ میں بڑی جاذبیت تھی، کیوں کہ اس سے نہ صرف مرد کا بار ہلکا ہو گیا بلکہ کسبِ معیشت میں عورت کے شریک ہو جانے سے دولت کے حصول اور اسبابِ عیش کی فراہمی میں قریب قریب دو چند کا اضافہ بھی ہو گیا۔ مزید برآں قوم کی معاشی اور عمرانی مشین کو چلانے کے لیے پہلے کے مقابلے میں دو گنے ہاتھ اور دو گنے دماغ مہیّا ہو گئے، جس سے یکایک تمدّن کے ارتقا کی رفتار تیز ہو گئی۔ لیکن مادّی اور معاشی پہلو کی طرف اس قدر حد سے زیادہ مائل ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے پہلو جو درحقیقت اپنی اہمیت میں اس ایک پہلو سے کچھ کم نہ تھے، اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور بہت سے پہلوؤں کو انہوں

نے جانتے بوجھتے نظر انداز کر دیا۔ انہوں نے قانونِ فطرت کو جاننے کے باوجود قصداً اس کی خلاف ورزی کی، جس پر خود ان کی اپنی سائنٹیفک تحقیقات شہادت دے رہی ہیں، انہوں نے عورت کے ساتھ انصاف کرنے کا دعویٰ کیا، مگر درحقیقت بے انصافی کے مرتکب ہوئے، جس پر خود ان کے اپنے مشاہدات اور تجربات گواہ ہیں۔ انہوں نے عورت کو مساوات دینے کا ارادہ کیا مگر درحقیقت نامساوات قائم کر بیٹھے، جس کا ثبوت خود اُن کے اپنے علوم وفنون فراہم کر رہے ہیں۔ انہوں نے تمدّن وتہذیب کی اصلاح کرنی چاہی۔ مگر درحقیقت اس کی تخریب کے نہایت خوفناک اسباب پیدا کر دیے جن کی تفصیلات خود ان ہی کے بیان کردہ واقعات اور خود اُن کے اپنے فراہم کردہ اعداد وشمار سے ہم کو معلوم ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ان حقائق سے بے خبر نہیں ہیں، مگر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کے لیے قانون بنانے میں تمام مصلحتوں کی معتدل اور متناسب رعایت ملحوظ نہیں رکھ سکتا۔ ہوائے نفس اس کو افراط کے کسی ایک رُخ پر بہالے جاتی ہے اور جب وہ بہہ جاتا ہے تو بہت سی مصلحتیں اس کی نظر سے چھپ جاتی ہیں اور بہت سی مصلحتوں اور حقیقتوں کو دیکھنے اور جاننے کے باوجود وہ ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اس قصدی وارادی اندھے پن کا ثبوت ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتے کہ خود ایک ایسے اندھے ہی کی شہادت پیش کر دیں۔ روس کا ایک ممتاز سائنسداں انتون نیم لاف (Anton Nimlov) جو سَو فیصدی کمیونسٹ ہے اپنی کتاب[1] The Biological Tragedy of Woman میں سائنس کے تجربات اور مشاہدات سے خود ہی عورت اور مرد کی فطری نامساوات ثابت کرنے پر تقریباً دوسو صفحے سیاہ کرتا ہے، مگر پھر خود ہی اس تمام سائنٹیفک تحقیق کے بعد لکھتا ہے:

> ”آج کل اگر یہ کہا جائے کہ عورت کو نظامِ تمدن میں محدود حقوق دیے جائیں تو کم سے کم آدمی اس کی تائید کریں گے۔ ہم خود اِس تجویز کے سخت مخالف ہیں، مگر ہمیں اپنے نفس کو یہ دھوکا نہ دینا چاہیے کہ مساواتِ مرد وزن کو عملی زندگی میں قائم کرنا کوئی سادہ اور آسان کام ہے، دنیا میں کہیں بھی عورت اور مرد کو برابر کر دینے کی اتنی کوشش نہیں کی گئی جتنی سوویت روس میں کی گئی ہے، کسی جگہ اس باب میں اس قدر غیر متعصّبانہ اور

(۱) اس کتاب کا انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۹۳۲ میں شائع ہوا۔

فیاضانہ قوانین نہیں بنائے گئے، مگر اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ عورت کی پوزیشن خاندان میں بہت کم بدل سکی ہے۔'' (ص:۷۶)

نہ صرف خاندان میں بلکہ سوسائٹی میں بھی۔

''اب تک عورت اور مرد کی نامساوات کا تخیل، نہایت گہرا تخیل، نہ صرف اُن طبقوں میں جو ذہنی حیثیت سے ادنیٰ درجہ کے ہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ سوویت طبقوں میں بھی جما ہوا ہے، اور خود عورتوں میں اس تخیل کا اتنا گہرا اثر ہے کہ اگر ان کے ساتھ ٹھیٹھ مساوات کا سلوک کیا جائے تو وہ اس کو مرد کے مرتبہ سے گرا ہوا سمجھیں گی، بلکہ اُسے مرد کی کمزوری اور نامردی پر محمول کریں گی۔ اگر ہم اس معاملے میں کسی سائنٹسٹ، کسی مصنّف، کسی طالب علم، کسی تاجر، یا کسی سو فیصدی کیمونسٹ کے خیالات کا تجسس کریں تو بہت جلد ہی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ عورت کو وہ اپنے برابر کا نہیں سمجھتا۔ اگر ہم زمانۂ حال کے کسی ناول کو پڑھیں، خواہ وہ کیسے ہی آزاد خیال مصنّف کا لکھا ہوا ہو، یقیناً اس میں ہم کو کہیں نہ کہیں ایسی عبارتیں ملیں گی جو عورت کے متعلق اس تخیّل کی چغلی کھا جائیں گی۔'' (ص:۹۵-۱۹۴)

اس کی وجہ؟

''اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں انقلابی اصول ایک نہایت اہم صورتِ واقعی سے ٹکرا جاتے ہیں، یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں ہے اور دونوں پر مساوی بار نہیں ڈالا گیا ہے۔'' (ص:۷۷)

ایک اقتباس اور دیکھ لیجیے، پھر نتیجہ آپ خود نکال لیں گے:

''سچی بات تو یہ ہے کہ تمام عمّال (Workers) میں صنفی انتشار (Sexual Anarchy) کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔ یہ ایک نہایت پُرخطر حالت ہے جو سوشلسٹ نظام کو تباہ کرنے کی دھمکی دے رہی ہے، ہر ممکن طریقہ سے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے، کیوں کہ اس محاذ پر جنگ کرنے میں بڑی مشکلات ہیں۔ میں ہزارہا ایسے واقعات کا حوالہ دے سکتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہوانی بے قیدی (Sexual Licentiousness) نہ صرف ناواقف لوگوں میں بلکہ طبقۂ عمّال کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عقلی حیثیت سے ترقی یافتہ افراد میں بھی پھیل گئی ہے۔'' (ص:۳-۲۰۲)

ان عبارتوں کی شہادت کیسی کھلی ہوئی شہادت ہے۔ ایک طرف یہ اعتراف ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان فطرت نے خود ہی مساوات نہیں رکھی، عملی زندگی میں بھی مساوات قائم کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں، اور جس حد تک فطرت سے لڑ کر اس قسم کی مساوات قائم کی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فواحش کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا جس سے سوسائٹی کا سارا نظام خطرہ میں پڑ گیا۔ دوسری طرف یہ دعویٰ ہے کہ نظامِ اجتماعی میں عورت کے حقوق پر کسی قسم کی حد بندیاں نہ ہونی چاہئیں اور اگر ایسا کیا جائے گا تو ہم اس کی مخالفت کریں گے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت اس امر کا ہوگا کہ انسان ـــــ جاہل نہیں بلکہ عالم، عاقل، نہایت باخبر انسان بھی ـــــ اپنے نفس کے رجحانات کا کیسا غلام ہوتا ہے، کہ خود اپنی تحقیق کو جھٹلاتا ہے، اپنے مشاہدات کی نفی کرتا ہے، اور سب طرف سے آنکھیں بند کر کے ہوائے نفس کے پیچھے ایک ہی رخ پر انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ خواہ اس افراط کے خلاف اس کے اپنے علوم کتنی ہی محکم دلیلیں پیش کریں، اُس کے کان کتنے ہی واقعات سُن لیں، اور اس کی آنکھیں کتنے ہی بُرے نتائج کا مشاہدہ کر لیں۔

اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (الجاثیۃ: ۲۳)

قانونِ اسلام کی شانِ اعتدال

بے اعتدالی اور افراط و تفریط کی اس دنیا میں صرف ایک نظامِ تمدّن ایسا ہے جس میں غایت درجہ کا اعتدال و توازن پایا جاتا ہے جس میں فطرتِ انسانی کے ایک ایک پہلو، حتیٰ کہ نہایت خفی پہلو کی بھی رعایت کی گئی ہے۔ انسان کی جسمانی ساخت اور اس کی حیوانی جبلّت اور اس کی انسانی سرشت، اور اس کی نفسی خصوصیات، اور اس کے فطری داعیات کے متعلق نہایت مکمل اور تفصیلی علم سے کام لیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک ایک چیز کی تخلیق سے فطرت کا جو مقصد ہے اس کو بہ تمام و کمال اس طریقہ سے پورا کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے مقصد حتیٰ کہ چھوٹے سے چھوٹے مقصد کو بھی نقصان نہیں پہنچتا، اور بالآخر یہ سب مقاصد مل کر اُس بڑے مقصد کی تکمیل میں مددگار ہوتے ہیں جو خود انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ یہ اعتدال، یہ توازن، یہ تناسب اتنا مکمل ہے کہ

کوئی خود اپنی عقل اور کوشش سے اس کو پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ انسان کا وضع کیا ہوا قانون ہو اور اس میں کسی جگہ بھی یک رُخی ظاہر نہ ہو، ناممکن! قطعی ناممکن!! خود وضع کرنا تو درکنار، حقیقت یہ ہے کہ معمولی انسان تو اس معتدل و متوازن اور انتہائی حکیمانہ قانون کی حکمتوں کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتا جب تک وہ غیر معمولی سلامتِ طبع نہ رکھتا ہو اور اس پر سالہا سال تک علوم اور تجربات کا اکتساب نہ کرلے اور پھر برسوں غور وخوض نہ کرتا رہے۔ میں اس قانون کی تعریف اس لیے نہیں کرتا ہوں کہ میں اسلام پر ایمان لایا ہوں، بلکہ دراصل میں اسلام پر ایمان لایا ہی اس لیے ہوں کہ مجھے اس میں کمال درجہ کا توازن و تناسب اور قوانینِ فطرت کے ساتھ تطابق نظر آتا ہے، جسے دیکھ کر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یقیناً اس قانون کا واضع وہی ہے جو زمین و آسمان کا فاطر اور غیب و شہادت کا عالم ہے اور حق یہ ہے کہ مختلف سمتوں میں بھٹک جانے والے بنی آدم کو عدل و توسّط کا محکم طریقہ وہی بتا سکتا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○

(الزمر: ۴۶)

باب ۹ :

اسلامی نظامِ معاشرت

(۱) اساسی نظریات

یہ بات اسلام کی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ اپنے قانون کی حکمت پر بھی خود ہی روشنی ڈالتا ہے۔ معاشرت میں عورت اور مرد کے تعلقات کو منضبط کرنے کے لیے جو قانون اسلام میں پایا جاتا ہے اس کے متعلق خود اسلام ہی نے ہم کو بتادیا ہے کہ اس قانون کی بنیاد کن اصولِ حکمت اور کن حقائقِ فطرت پر ہے۔

زوجیت کا اساسی مفہوم

اس سلسلہ میں سب سے پہلی حقیقت جس کی پردہ کشائی کی گئی ہے، یہ ہے:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (الذّٰریٰت: ۴۹)

اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے ہیں۔

اس آیت میں قانون زوجی (Law of Sex) کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کارگاہِ عالم کا انجینئر خود اپنی انجینئری کا یہ راز کھول رہا ہے کہ اس نے کائنات کی یہ ساری مشین قاعدۂ زوجیت پر بنائی ہے یعنی اس مشین کے تمام کل پرزے جوڑوں (Pairs) کی شکل میں بنائے گئے ہیں۔ اور جہانِ خلق میں جتنی کاریگری تم دیکھتے ہو، وہ سب ان ہی جوڑوں کی تزویج کا کرشمہ ہے۔

اب اس پر غور کیجیے کہ زوجیت کیا شے ہے، زوجیت میں اصل یہ ہے کہ ایک شے میں

فعل ہو اور دوسری شے میں قبول وانفعال۔ ایک شے میں تاثیر ہو اور دوسری شے میں تأثّر۔ ایک شے میں عاقدیّت ہو اور دوسری شے میں منعقدیّت، یہی عقد وانعقاد، اور فعل وانفعال، اور تاثیر و تأثّر اور فاعلیت و قابلیت کا تعلق دو چیزوں کے درمیان زوجیت کا تعلق ہے۔ اسی تعلق سے تمام ترکیبات واقع ہوتی ہیں۔ اور ان ہی ترکیبات سے عالمِ خلق کا سارا کارخانہ چلتا ہے۔

کائنات میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب اپنے اپنے طبقہ میں زوج زوج اور جوڑ جوڑ پیدا ہوئی ہیں، اور ہر دو زوجین کے درمیان اصلی واساسی حیثیت سے زوجیت کا یہی تعلّق پایا جاتا ہے کہ ایک فاعل ہے اور دوسرا قابل ومنفعل، اگرچہ مخلوقات کے ہر طبقے میں اس تعلق کی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً ایک تزویج وہ ہے جو بسائط اور عناصر میں ہوتی ہے۔ ایک وہ جو مرکباتِ غیرنامیہ میں ہوتی ہے۔ ایک وہ جو اجسامِ نامیہ میں ہوتی ہے۔ ایک وہ جو انواعِ حیوانی میں ہوتی ہے۔ یہ سب تزویجیں اپنی نوعیت اور کیفیت اور فطری مقاصد کے لحاظ سے مختلف ہیں، لیکن اصلِ زوجیّت اِن سب میں وہی ایک ہے۔ ہر نوع میں، خواہ وہ کسی طبقہ کی ہو۔ فطرت کے اصل مقصد یعنی وقوعِ ترکیب اور حصولِ ہیئت ترکیبی کے لیے ناگزیر ہے کہ زوجین میں سے ایک میں قوتِ فعل ہو اور دوسرے میں قوتِ انفعال۔

آیتِ مذکورۂ بالا کا یہ مفہوم متعیّن ہو جانے کے بعد اس سے قانونِ زوجیت کے تین ابتدائی اصول مستنبط ہوتے ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ نے جس فارمولے پر تمام کائنات کی تخلیق کی ہے اور جس طریقے کو اپنے کارخانے کے چلنے کا ذریعہ بنایا ہے وہ ہرگز ناپاک اور ذلیل نہیں ہوسکتا، بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ پاک اور محترم ہی ہے اور ہونا چاہیے۔ کارخانہ کے مخالف اس کو گندہ اور قابلِ نفرت قرار دے کر اس سے اجتناب کر سکتے ہیں، مگر خود کارخانہ کا صانع اور مالک تو یہ کبھی نہ چاہے گا کہ اس کا کارخانہ بند ہو جائے۔ اس کا منشا تو یہی ہے کہ اس کی مشین کے تمام پرزے چلتے رہیں اور اپنے اپنے حصّے کا کام پورا کریں۔

۲- فعل اور انفعال دونوں اس کارخانے کو چلانے کے لیے یکساں ضروری ہیں۔ فاعل اور منفعل دونوں کا وجود اس کی کارگاہ میں یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ نہ فاعل کی حیثیتِ فعلی

میں کوئی عزت ہے اور نہ منفعل کی حیثیت انفعالی میں کوئی ذلّت ۔ فاعل کا کمال یہی ہے کہ اس میں قوتِ فعل اور کیفیاتِ فاعلیہ پائی جائیں تا کہ وہ زوجیت کے فعلی پہلو کا کام بخوبی ادا کر سکے اور منفعل کا کمال یہی ہے کہ اس میں انفعال اور کیفیات انفعالیہ بدرجۂ اتم موجود ہوں تا کہ وہ زوجیت کے انفعالی اور قبولی پہلو کی خدمات باَحسنِ وجوہ بجالا سکے۔ ایک معمولی مشین کے پرزے کو بھی اگر کوئی شخص اس کے اصلی مقام سے ہٹا دے اور اس سے وہ کام لینا چاہے جس کے لیے وہ دراصل بنایا ہی نہیں گیا ہے تو وہ احمق اور اناڑی سمجھا جائے گا۔ اور اوّل تو اپنی اس کوشش میں اُسے کامیابی ہی نہ ہوگی۔ اور اگر وہ بہت زور لگائے گا تو بس اتنا کر سکے گا کہ مشین کو توڑ دے۔ ایسا ہی حال اس کائنات کی عظیم الشان مشین کا بھی ہے جو احمق اور اناڑی ہیں وہ اس کے زوجِ فاعل کو زوجِ منفعل کی جگہ یا منفعل کو زوجِ فاعل کی جگہ رکھنے کا خیال کر سکتے ہیں، اور اس کی کوشش کر کے اور اس میں کامیابی کی امید رکھ کر مزید حماقت کا ثبوت بھی دے سکتے ہیں۔ مگر اس مشین کا صانع تو ہرگز ایسا نہ کرے گا۔ وہ تو فاعل پرزے کو فعل ہی کی جگہ رکھے گا اور اسی حیثیت سے اس کی تربیت کرے گا اور منفعل پرزے کو انفعال ہی کی جگہ رکھے گا اور اس میں انفعالی استعداد ہی پرورش کرنے کا انتظام کرے گا۔

۳۔ فعل اپنی ذات میں قبول اور انفعال پر بہر حال ایک طرح کی فضیلت رکھتا ہے۔ یہ فضیلت اس معنی میں نہیں ہے کہ فعل میں عزت ہو اور انفعال اُس کے مقابلے میں ذلیل ہو۔ بلکہ فضیلت دراصل غلبہ اور قوت اور اثر کے معنی میں ہے۔ جو شے کسی دوسری شے پر فعل کرتی ہے وہ اسی وجہ سے تو کرتی ہے کہ وہ اس پر غالب ہے، اس کے مقابلے میں طاقتور ہے اور اس پر اثر کرنے کی قوت رکھتی ہے اور جو شے اس کے فعل کو قبول کرتی ہے اور اس سے منفعل ہوتی ہے اس کے قبول و انفعال کی وجہ یہی تو ہے کہ وہ مغلوب ہے، اسکے مقابلے میں کمزور ہے اور متاثر ہونے کی استعداد رکھتی ہے۔ جس طرح وقوعِ فعل کے لیے فاعل اور منفعل دونوں کا وجود یکساں ضروری ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ فاعل میں غلبہ اور قوتِ تاثیر ہو اور منفعل میں مغلوبیّت اور قبولِ اثر

کی استعداد۔ کیوں کہ اگر دونوں قوت میں یکساں ہوں اور کسی کو کسی پر غلبہ حاصل نہ ہو تو اس میں سے کوئی کسی کا اثر قبول نہ کرے گا۔ اور سرے سے فعل واقع ہی نہ ہوگا۔ اگر کپڑے میں بھی وہی سختی ہو جو سوئی میں ہے تو سینے کا فعل پورا نہیں ہوسکتا۔ اگر زمین میں وہ نرمی نہ ہو جس کی وجہ سے کدال اور ہل کا غلبہ قبول کرتی ہے، تو زراعت اور تعمیر ناممکن ہو جائے۔ غرض دنیا میں جتنے افعال واقع ہوتے ہیں اُن میں سے کوئی بھی واقع نہیں ہوسکتا اگر ایک فاعل کے مقابلے میں ایک منفعل نہ ہو۔ اور منفعل میں فاعل کے اثر سے مغلوب ہونے کی صلاحیت نہ ہو۔ پس زوجین میں سے زوجِ فاعل کی طبیعت کا اقتضا یہی ہے کہ اس میں غلبہ اور شدّت اور تحکّم ہو جس کو مردانگی اور رجولیت سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیوں کہ فعلی پرزے کی حیثیت سے اپنی خدمت بجالانے کے لیے اس کا ایسا ہی ہونا ضروری ہے۔ اس کے برعکس زوجِ منفعل کی فطرتِ انفعالیہ کا یہی تقاضا ہے کہ اس میں نرمی اور نزاکت اور لطافت اور تأثر ہو جسے انوثت یا نسائیت کہا جاتا ہے، کیوں کہ زوجیت کے انفعالی پہلو میں یہی صفات اس کو کامیاب بناسکتی ہیں۔ جو لوگ اس راز کو نہیں جانتے وہ یا تو فاعل کی ذاتی فضیلت کو عزّت کا ہم معنی سمجھ کر منفعل کو بالذات ذلیل قرار دے بیٹھتے ہیں۔ یا پھر سرے سے اس فضیلت کا انکار کرکے منفعل میں بھی وہی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو فاعل میں ہونی چاہییں۔ لیکن جس انجینئر نے ان دونوں پرزوں کو بنایا ہے وہ ان کو مشین میں اس طور پر نصب کرتا ہے کہ عزت میں دونوں یکساں، اور تربیت وعنایت میں دونوں برابر، مگر فعل وانفعال کی طبیعت جس غالبیت اور مغلوبیت کی مقتضی ہے، وہی اُن میں پیدا ہوتا کہ وہ تزویج کے منشا کو پورا کرسکیں۔ نہ یہ کہ دونوں ایسے پتھر بن جائیں جو ٹکرا تو سکتے ہیں مگر آپس میں کوئی امتزاج اور کوئی ترکیب قبول نہیں کرسکتے۔

یہ وہ اصول ہیں جو زوجیت کے ابتدائی مفہوم سے حاصل ہوتے ہیں۔ محض ایک مادّی وجود ہونے کی حیثیت سے عورت اور مرد کا زوج زوج ہونا ہی اس کا مقتضی ہے کہ اُن کے تعلقات میں یہ اصول مرعی رکھے جائیں۔ چنانچہ آگے چل کر آپ کو معلوم ہوگا کہ فاطر السّموات والارض نے جو قانونِ معاشرت بنایا ہے اس میں ان تینوں کی پوری رعایت کی گئی ہے۔

انسان کی حیوانی فطرت اور اس کے مقتضیات

اب ایک قدم آگے بڑھیے۔ عورت اور مرد کا وجود محض ایک مادّی وجود ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک حیوانی وجود بھی ہے۔ اس حیثیت سے ان کا زوج ہونا کس چیز کا مقتضی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ مِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ۭ (الشوریٰ: ۱۱)

''اللہ نے تمہارے لیے خود تمہیں میں سے جوڑے بنائے اور جانوروں میں سے بھی جوڑے بنائے اس طریقہ سے وہ تم کو روئے زمین پر پھیلاتا ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ (البقرۃ: ۲۲۳)

''تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔

پہلی آیت میں انسان کو عام حیوانات سے الگ کر کے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انواعِ حیوانات میں سے اس خاص نوع کے زوجین میں کھیتی اور کسان کا سا تعلق ہے۔ یہ ایک حیاتی حقیقت (Biological Fact) ہے۔ حیاتیات کے نقطۂ نظر سے بہترین تشبیہ جو عورت اور مرد کو دی جا سکتی ہے، وہ یہی ہے۔

ان دونوں آیتوں سے تین مزید اصول حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات کی طرح انسان کے جوڑے بھی اس مقصد کے لیے بنائے ہیں کہ اس کے صنفی تعلق سے انسانی نسل جاری ہو۔ یہ انسان کی حیوانی فطرت کا مقتضا ہے جس کی رعایت ضروری ہے۔ خدا نے نوعِ انسانی کو اس لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ اس کے چند افراد زمین پر اپنے نفس کی پرورش کریں۔ اور بس ختم ہو جائیں۔ بلکہ اس کا ارادہ اجلِ معیّن تک اس نوع کو باقی رکھنے کا ہے۔ اور اس نے انسان کی حیوانی فطرت میں صنفی میلان اسی لیے رکھا ہے کہ اس کے زوجین باہم ملیں اور خدا کی زمین کو آباد رکھنے کے لیے اپنی نسل جاری کریں۔ پس جو قانون خدا کی طرف سے ہوگا وہ کبھی صنفی میلان کو کچلنے والا اور فنا کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ اس سے نفرت اور کلی اجتناب کی تعلیم

دینے والا نہیں ہوسکتا، بلکہ اس میں لازماً ایسی گنجایش رکھی جائے گی کہ انسان اپنی فطرت کے اس اقتضا کو پورا کر سکے۔

۲- عورت اور مرد کو کھیتی اور کسان سے تشبیہہ دے کر بتایا گیا ہے کہ انسانی زوجین کا تعلق دوسرے حیوانات کے زوجین سے مختلف ہے۔ انسانی حیثیت سے قطعِ نظر، حیوانی اعتبار سے بھی ان دونوں کی ترکیبِ جسمانی اس طور پر رکھی گئی ہے کہ اُن کے تعلق میں وہ پائیداری ہونی چاہیے جو کسان اور اس کے کھیت میں ہوتی ہے۔ جس طرح کھیتی میں کسان کا کام محض بیج پھینک دینا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس کو پانی دے، کھاد مہیّا کرے اور اس کی حفاظت کرتا رہے اسی طرح عورت بھی وہ زمین نہیں ہے جس میں ایک جانور چلتے پھرتے کوئی بیج پھینک جائے اور وہ ایک خود رُو درخت اگا دے، بلکہ جب وہ بار آور ہوتی ہے تو درحقیقت اِس کی محتاج ہوتی ہے کہ اُس کا کسان اُس کی پرورش اور اُس کی رکھوالی کا پورا بار سنبھالے۔

۳- انسان کے زوجین میں جو صنفی کشش ہے وہ حیاتی حیثیت (Biologically) سے اسی نوعیت کی ہے جو دوسری انواعِ حیوانی میں پائی جاتی ہے۔ ایک صنف کا ہر فرد صنفِ مقابل کے ہر فرد کی طرف حیوانی میلان رکھتا ہے اور تناسل کا زبردست داعیہ، جو اُن کی سرشت میں رکھا گیا ہے، دونوں صنفوں کے ان تمام افراد کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے جن میں تناسل کی صلاحیت بالفعل موجود ہو۔ پس فاطرِ کائنات کا بنایا ہوا قانون انسان کی حیوانی فطرت کے اس کمزور پہلو سے بے پرواہ نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ اس میں صنفی انتشار (Sexual Anarchy) کی طرف ایسا شدید میلان چھپا ہوا ہے جو تحفّظ کی خاص تدابیر کے بغیر قابو میں نہیں رکھا جاسکتا۔ اور ایک مرتبہ اگر وہ بے قابو ہوجائے تو انسان کو پورا حیوان، بلکہ حیوانات میں بھی سب سے ارذل بن جانے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۝
(التین: ۴،۵)

فطرتِ انسانی اوراس کے مقتضیات

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں طبیعت حیوانیہ، خلقتِ انسانی کی تہ میں زمین اور بنیاد کے طور پر ہے اوراسی زمین پر انسانیت کی عمارت قائم کی گئی ہے۔ انسان کے انفرادی وجوداوراس کی نوعی ہستی، دونوں کو باقی رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے اُن میں سے ہر ایک کی خواہش اور ہر ایک کے حصول کی استعداداللہ تعالیٰ نے اس کی حیوانی سرشت میں رکھ دی ہے اور فطرتِ الٰہی کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان خواہشات میں سے کسی خواہش کو پورا نہ ہونے دیا جائے یا استعدادات میں سے کسی استعداد کو فنا کر دیا جائے، کیوں کہ یہ سب چیزیں بھی بہر حال ضروری ہیں اوران کے بغیر انسان اوراس کی نوع زندہ نہیں رہ سکتی۔ البتہ فطرتِ حق یہ چاہتی ہے کہ انسان اپنی ان خواہشات کو پورا کرنے اور ان استعدادات سے کام لینے میں نرا حیوانی طریقہ اختیار نہ کرے، بلکہ اس کی انسانی سرشت جن امور کی مقتضی ہے اوراس میں جن فوق الحیوانی امور کی طلب رکھی گئی ہے، ان کے لحاظ سے اس کا طریقہ انسانی ہونا چاہیے۔ اسی غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے حدودِ شرعی مقرر فرمائی ہیں، تا کہ انسان کے افعال کو ایک ضابطہ کا پابند بنایا جائے اوراس کے ساتھ تنبیہ بھی کر دی گئی ہے کہ اگر افراط یا تفریط کا طریقہ اختیار کر کے ان حدود سے تجاوز کرو گے تو اپنے آپ کو خود تباہ کر لو گے۔

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ط (الطلاق: ۱)

اب دیکھیے کہ صنفی معاملات میں قرآنِ مجید انسانی فطرت کی کن خصوصیات اور کن مقتضیات کی طرف اشارہ کرتا ہے:

۱۔ دونوں صنفوں کے درمیان جس قسم کا تعلق انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اس کی تشریح یہ ہے:

خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ط (الروم: ۲۱)

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے خود تمہیں میں سے جوڑے بنائے ہیں تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو، اوراس نے تمہارے درمیان مودّت اور رحمت رکھ دی ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ط (البقرة:۱۸۷)

وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم اُن کے لیے لباس ہو۔

اس سے پہلے جس آیت میں انسان اور حیوان دونوں کے لیے جوڑے بنانے کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا وہاں تخلیقِ زوجین کا مقصد صرف بقائے نسل بتایا گیا ہے۔ اب حیوان سے الگ کر کے انسان کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ اس میں زوجیت کا ایک بالاتر مقصد بھی ہے اور وہ یہ کہ ان کا تعلق محض شہوانی نہ ہو بلکہ محبت اور انس کا تعلق ہو، دل کے لگاؤ اور روحوں کے اتصال کا تعلق ہو، وہ ایک دوسرے کے رازدار اور شریکِ رنج و راحت ہوں، اُن کے درمیان ایسی معیت اور دائمی وابستگی ہو جیسے لباس اور جسم میں ہوتی ہے۔ دونوں صنفوں کا یہی تعلق انسانی تمدّن کی عمارت کا سنگِ بنیاد ہے جیسا کہ ہم بہ تفصیل بیان کر چکے ہیں۔ اس کے ساتھ "لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا" سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ عورت کی ذات میں مرد کے لیے سرمایۂ سکون و راحت ہے اور عورت کی فطری خدمت یہی ہے کہ وہ اس جدوجہد اور ہنگامۂ عمل کی مشقتوں بھری دنیا میں سکون و راحت کا ایک گوشہ مہیّا کرے۔ یہ انسان کی خانگی زندگی ہے، جس کی اہمیت کو مادی منفعتوں کی خاطر اہلِ مغرب نے نظر انداز کر دیا ہے۔ حالاں کہ تمدّن و عمران کے شعبوں میں جو اہمیت دوسرے شعبوں کی ہے وہی اس شعبے کی بھی ہے اور تمدنی زندگی کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنے دوسرے شعبے ضروری ہیں۔

۲- یہ صنفی تعلق صرف زوجین کی باہمی محبت ہی کا مقتضی نہیں ہے بلکہ اس امر کا بھی مقتضی ہے کہ اس تعلق سے جو اولاد پیدا ہو اس کے ساتھ بھی ایک گہرا روحانی تعلّق ہو۔ فطرتِ الٰہی نے اس کے لیے انسان کی اور خصوصاً عورت کی جسمانی ساخت اور حمل و رضاعت کی طبیعی صورت ہی میں ایسا انتظام کر دیا ہے کہ اس کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں اولاد کی محبت پیوست ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کہتا ہے:

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِىْ عَامَيْنِ. (لقمٰن:۱۴)

اس کی ماں نے جھٹکے پر جھٹکے اٹھا کر پیٹ میں رکھا پھر وہ دو سال کے بعد ماں کی چھاتی سے جدا ہوا۔

حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا وَّوَضَعَتۡهُ كُرۡهًا ؕ وَحَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا ؕ (الاحقاف:۱۵)

اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا، تکلیف کے ساتھ جنا اور اس کے حمل اور دودھ چھڑائی میں تیس مہینے صرف ہوئے۔

ایسا ہی حال مرد کا ہے، اگرچہ اولاد کی محبت میں وہ عورت سے کمتر ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالۡبَنِيۡنَ. (آل عمران:۱۴)

لوگوں کے لیے خوش آئند ہے مرغوب چیزوں کی محبت، جیسے عورتیں، اولاد۔

یہی فطری محبت انسان اور انسان کے درمیان نسبی اور صہری رشتے قائم کرتی ہے۔ پھر ان رشتوں سے خاندان اور خاندانوں سے قبائل اور قومیں بنتی ہیں اور ان کے تعلقات سے تمدّن وجود میں آتا ہے:

وَهُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ مِنَ الۡمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهۡرًا ؕ (الفرقان:۵۴)

اور وہ خدا وہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا پھر اس کو نسب اور شادی بیاہ کا رشتہ بنایا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ وَّاُنۡثٰى وَجَعَلۡنٰكُمۡ شُعُوۡبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا ؕ (الحجرات:۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں اور تمہارے قبیلے بنادیے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔

پس ارحام اور انساب اور مصاہرت کے رشتے دراصل انسانی تمدّن کے ابتدائی اور طبعی مؤسّسات ہیں اور ان کے قیام کا انحصار اس پر ہے کہ اولاد اپنے معلوم و معروف ماں باپ سے ہو اور انساب محفوظ ہوں۔

۳- انسانی فطرت کا اقتضا یہ بھی ہے کہ وہ اپنی محنتوں کے نتائج اور اپنی گاڑھی کمائی میں سے اگر کچھ چھوڑے تو اپنی اولاد اور اپنے عزیزوں کے لیے چھوڑے جن کے ساتھ وہ تمام عمر خونی اور رحمی رشتوں میں بندھا رہا ہے:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ ط

(الانفال: ۷۵)

اور اللہ کے قانون میں رشتہ دار ایک دوسرے کی وراثت کے زیادہ حق دار ہیں۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَ کُمْ اَبْنَآءَ کُمْ ط (الاحزاب: ۴)

جن کو تم منہ بولا بیٹا بنا لیتے ہو، اُن کو خدا نے تمہارا بیٹا نہیں بنایا ہے۔

پس تقسیمِ میراث کے لیے بھی تحفّظِ انساب کی ضرورت ہے۔

۴- انسان کی فطرت میں حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اس کے جسم کے بعض حصّے ایسے ہیں جن کو چھپانے کی خواہش خدا نے اس کی جبلت میں پیدا کی ہے۔ یہی جبلّی خواہش ہے جس نے ابتدا سے انسان کو کسی نہ کسی نوع کا لباس اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اس باب میں قرآن قطعیت کے ساتھ جدید نظریہ کی تردید کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ انسانی جسم کے جن حصّوں میں مرد اور عورت کے لیے صنفی جاذبیت ہے، اُن کے اظہار میں شرم کرنا اور اُن کو چھپانے کی کوشش کرنا انسانی فطرت کا اقتضا ہے۔ البتہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ ان کو کھول دے:

فَوَسْوَسَ لَھُمَا الشَّیْطٰنُ لِیُبْدِیَ لَھُمَا مَاوٗرِیَ عَنْھُمَا مِنْ سَوْاٰتِھِما... فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَۃَ بَدَتْ لَھُمَا سَوْاٰتُھُمَا وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْھِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّۃِ ط (الاعراف: ۲۰-۲۲)

پھر شیطان نے آدم اور ان کی بیوی کو بہکایا تا کہ ان کے جسم میں سے جو کچھ ان سے چھپایا گیا تھا اُس کو اُن پر ظاہر کر دے... پس جب انہوں اس شجر کا مزا چکھا تو اُن پر اُن کے جسم کے پوشیدہ حصّے کھل گئے اور وہ اُن کو جنت کے پتّوں سے ڈھانکنے لگے۔

پھر قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے لباس اسی لیے اتارا ہے کہ وہ تمہارے لیے ستر پوشی کا ذریعہ بھی ہو اور زینت کا ذریعہ بھی، مگر محض ستر چھپا لینا کافی نہیں، اس کے ساتھ ضروری ہے کہ تمہارے دلوں میں تقویٰ بھی ہو۔

قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَ رِیْشًا ط وَّ لِبَاسُ التَّقْوٰی لا ذٰلِکَ خَیْرٌ ط (الاعراف: ۲۶)

یہ اسلامی نظامِ معاشرت کے اساسی تصورات ہیں۔ ان تصورات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب اس نظامِ معاشرت کی تفصیلی صورت ملاحظہ کیجیے جو ان تصوّرات کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ کے دوران میں آپ کو گہری نظر سے اس امر کا تجسس کرنا چاہیے کہ اسلام جن نظریات کو اپنے قانون کی اساس قرار دیتا ہے اُن کو عملی جزئیات وتفصیلات میں نافذ کرتے ہوئے کہاں تک یکسانی وہمواری اور منطقی ربط ومطابقت قائم رکھتا ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے جتنے قوانین ہم نے دیکھے ہیں ان سب کی یہ مشترک اور نمایاں کمزوری ہے کہ اُن کے اساسی نظریات اور عملی تفصیلات کے درمیان پورا منطقی ربط قائم نہیں رہتا۔ اصول اور فروع میں صریح تناقض پایا جاتا ہے۔ کلیات جو بیان کیے جاتے ہیں اُن کا مزاج کچھ اور ہوتا ہے اور عملدرآمد کے لیے جو جزئیات مقرر کیے جاتے ہیں اُن کا مزاج کوئی اور صورت اختیار کر لیتا ہے۔ فکر و تعقّل کے آسمانوں پر چڑھ کر ایک نظریہ پیش کر دیا جاتا ہے مگر جب عالمِ بالا سے اتر کر واقعات اور عمل کی دنیا میں آدمی اپنے نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے تو یہاں عملی مسائل میں وہ کچھ ایسا کھویا جاتا ہے کہ اُسے خود اپنا نظریہ یاد نہیں رہتا۔ انسانی ساخت کے قوانین میں سے کوئی ایک قانون بھی اس کمزوری سے خالی نہیں پایا گیا۔ اب آپ، دیکھیں اور خوردبین لگا کر انتہائی نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھیں کہ یہ قانون جو ریگستانِ عرب کے ایک اَن پڑھ چرواہے نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے جس کے مرتب کرنے میں اس نے کسی مجلسِ قانون ساز اور کسی سلکٹ کمیٹی سے مشورہ تک نہیں لیا اس میں بھی کہیں کوئی منطقی بے ربطی اور کسی تناقض کی جھلک پائی جاتی ہے۔

باب ۱۰ :

اسلامی نظامِ معاشرت

(۲) اصول و ارکان

تنظیمِ معاشرت کے سلسلہ میں سب سے اہم سوال، جیسا کہ ہم کسی دوسرے موقع پر بیان کر چکے ہیں، صنفی میلان کو انتشارِ عمل سے روک کر ایک ضابطہ میں لانے کا ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر تمدّن کی شیرازہ بندی ہی نہیں ہو سکتی، اور اگر ہو بھی جائے تو شیرازہ کو بکھرنے اور انسان کو شدید اخلاقی و ذہنی انحطاط سے بچانے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس غرض کے لیے اسلام نے عورت اور مرد کے تعلقات کو مختلف حدود کا پابند کر کے ایک مرکز پر سمیٹ دیا ہے۔

محرّمات

سب سے پہلے اسلامی قانون ان تمام مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کے لیے حرام کرتا ہے جو باہم مل کر رہنے یا نہایت قریبی تعلقات رکھنے پر مجبور ہیں۔ مثلاً: ماں اور بیٹا، باپ اور بیٹی، بھائی اور بہن، پھوپھی اور بھتیجا، چچا اور بھتیجی، ماموں، خالہ اور بھانجا اور بھانجی، سوتیلا باپ اور بیٹی، سوتیلی ماں اور بیٹا، ساس اور داماد، خسر اور بہو، سالی اور بہنوئی (بہن کی زندگی میں) اور رضاعی رشتہ دار (سورۂ نساء رکوع ۱۴۶) ان تعلقات کی حرمت قائم کر کے ان کو صنفی میلان سے اس قدر پاک کر دیا گیا ہے کہ ان رشتوں کے مرد اور عورت یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ایک دوسرے کی جانب کوئی صنفی کشش رکھتے ہیں (بجز ایسے خبیث طینت بہائم کے جن کی بہیمیت کسی اخلاقی ضابطہ کی حد میں رہنا قبول نہیں کرتی)۔

حرمتِ زنا

اس حد بندی کی دوسری قید یہ لگائی گئی کہ ایسی تمام عورتیں بھی حرام ہیں جو بالفعل کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ... (النساء: ۲۴)

ان کے بعد جو عورتیں باقی بچتی ہیں ان کے ساتھ ہر قسم کے بے ضابطہ صنفی تعلق کو حرام قرار دیا گیا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۳۲)

زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو کیوں کہ وہ بے حیائی ہے اور بہت بُرا راستہ ہے۔

نکاح

اس طرح حدود و قیود لگا کر صنفی انتشار کے تمام راستے بند کر دیے گئے مگر انسان کی حیوانی سرشت کے اقتضاء اور کارخانۂ قدرت کے مقررہ طریقے کو جاری رکھنے کے لیے ایک دروازہ کھولنا بھی ضرور تھا، سو وہ دروازہ نکاح کی صورت میں کھولا گیا ہے اور کہہ دیا گیا کہ اس ضرورت کو تم پورا کرو، مگر منتشر اور بے ضابطے تعلقات میں نہیں، چوری چھپے بھی نہیں، کھلے بندوں، بے حیائی کے طریقہ پر بھی نہیں، بلکہ باقاعدہ اعلان و اظہار کے ساتھ، تاکہ تمہاری سوسائٹی میں یہ بات معلوم اور مسلّم ہو جائے کہ فلاں مرد اور عورت ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں:

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ (النسآء: ۲۴)

ان عورتوں کے سوا جو عورتیں ہیں، تمہارے لیے حلال کیا گیا کہ تم اپنے اموال کے بدلہ میں (مہر دے کر) ان سے احصان (نکاح) کا باضابطہ تعلق قائم کرو نہ کہ آزاد شہوت رانی۔

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ... مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ (النسآء: ۲۵)

پس ان عورتوں کے متعلقین کی رضامندی سے ان کے ساتھ نکاح کرو...اس طرح کہ وہ قیدِ نکاح میں ہوں نہ یہ کہ کھلے بندوں یا چوری چھپے آشنائی کرنے والیاں۔

یہاں اسلام کی شانِ اعتدال دیکھیے کہ جو صنفی تعلق دائرۂ ازدواج کے باہر حرام اور قابلِ نفرت تھا وہی دائرۂ ازدواج کے اندر نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے، کارِثواب ہے، اس کو اختیار کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس سے اجتناب کرنے کو ناپسند کیا جاتا ہے اور زوجین کا ایک ایسا تعلق ایک عبادت بن جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر عورت اپنے شوہر کی جائز خواہش سے بچنے کے لیے نفل روزہ رکھ لے یا نماز و تلاوت میں مشغول ہو جائے تو وہ الٹی گنہگار ہوگی۔ اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند حکیمانہ اقوال ملاحظہ ہوں:

عَلَیۡکُمۡ بِالۡبَاءَ ةِ فَانّه اَغضُّ لِلبَصَرِ وَاَحۡصَنُ لِلۡفَرۡجِ فَمَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ مِنۡکُمُ البَاءَ ةَ فَعَلَیۡهِ بِالصَّوۡمِ فَاِنَّ الصَّوم لَهٗ وِجَاءٌ.

(الترمذی ابواب النکاح فی هذا المعنی حدیث فی کتاب النکاح للبخاری)

تم کو نکاح کرنا چاہیے کیوں کہ وہ آنکھوں کو بدنظری سے روکنے اور شرم گاہ کی حفاظت کرنے کی بہترین تدبیر ہے۔ اور جو شخص تم میں سے نکاح کی قدرت نہ رکھتا ہو وہ روزہ رکھے کیوں کہ روزہ شہوت کو دبانے والا ہے۔

واللّٰه انی لاخشاکم للّٰه و اَتۡقَاکُمۡ لَهٗ لٰکنّی اَصُوۡم و افطرو اصلی و ارقد و اتزوّج النّساء فمن رَغِبَ عن سُنّتی فلیس مِنِّی. (بخاری، کتاب النکاح)

بہ خدا میں خدا سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے میں تم سب سے بڑھ کر ہوں۔ مگر مجھے دیکھو کہ روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں نماز بھی پڑھتا ہوں اور راتوں کو سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ یہ میرا طریقہ ہے اور جو میرے طریقہ سے اجتناب کرے اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔

لا تَصُوۡمُ الۡمَرۡاَةُ و بَعۡلُهَا شاهدٌ اِلاّ باذنِهٖ.

(بخاری، باب صوم المرأة باذن زوجها)

عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کے اِذن کے بغیر نفل روزہ نہ رکھے۔

اذا باتت المرأة مهاجرة فراش زوجها لعنتها الملائکة حتی ترجع. (بخاری، کتاب النکاح)

جو عورت اپنے شوہر سے اجتناب کر کے اس سے الگ رات گزارے اس پر ملائکہ لعنت بھیجتے ہیں جب تک وہ رجوع نہ کرے۔

اذا رأی احدکم امرأۃ فاعجبتہ فلیأت اھلہ فان معھا مثل الذی معھا. (ترمذی، باب ماجاء الرجل یری المرأۃ فتعجبہٗ)

جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو دیکھ لے اور اس کے حسن سے متاثر ہو تو اپنی بیوی کے پاس چلا جائے کیوں کہ اس کے پاس بھی وہی ہے جو اس کے پاس تھا۔

ان تمام احکامات و ہدایات سے شریعت کا منشا یہ ہے کہ صنفی انتشار کے تمام دروازے مسدود کیے جائیں، زوجی تعلقات کو دائرۂ ازدواج کے اندر محدود کیا جائے۔ اس دائرے کے باہر جس حد تک ممکن ہو کسی قسم کی صنفی تحریکات نہ ہوں۔ اور جو تحریکات خود طبیعت کے اقتضا یا اتفاقی حوادث سے پیدا ہوں اُن کی تسکین کے لیے ایک مرکز بنا دیا جائے۔ عورت کے لیے اس کا شوہر اور مرد کے لیے اس کی بیوی۔ تا کہ انسان تمام غیر طبعی اور خود ساختہ ہیجانات اور انتشارِ عمل سے بچ کر اپنی مجتمع قوت (Conservated Energy) کے ساتھ نظامِ تمدّن کی خدمت کرے، اور وہ صنفی محبت اور کشش کا مادّہ جو اللہ تعالیٰ نے اس کارخانہ کو چلانے کے لیے ہر مرد و عورت میں پیدا کیا ہے، تمام تر ایک خاندان کی تخلیق اور اس کے استحکام میں صرف ہو۔ ازدواج ہر حیثیت سے پسندیدہ ہے، کیوں کہ وہ فطرتِ انسانی اور فطرتِ حیوانی دونوں کے منشا اور قانونِ الٰہی کے مقصد کو پورا کرتا ہے اور ترک ازدواج ہر حیثیت سے ناپسندیدہ، کیوں کہ وہ دو برائیوں میں سے ایک برائی کا حامل ضرور ہو گا یا تو انسان قانونِ فطرت کے منشا کو پورا ہی نہ کرے گا اور اپنی قوتوں کو فطرت سے لڑنے میں ضائع کر دے گا، یا پھر وہ اقتضائے طبیعت سے مجبور ہو کر غلط اور ناجائز طریقوں سے اپنی خواہشات کو پورا کرے گا۔

خاندان کی تنظیم

صنفی میلان کو خاندان کی تخلیق اور اس کے استحکام کا ذریعہ بنانے کے بعد اسلام خاندان کی تنظیم کرتا ہے، اور یہاں بھی وہ پورے توازن کے ساتھ قانونِ فطرت کے ان تمام پہلوؤں کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے جن کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ عورت اور مرد کے حقوق

متعین کرنے میں جس درجہ عدل وانصاف اس نے ملحوظ رکھا ہے، اس کی تفصیلات میں نے ایک الگ کتاب میں بیان کی ہیں جو ''حقوق الزوجین'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے، اس کی طرف مراجعت کرنے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دونوں صنفوں میں جس حد تک مساوات قائم کی جاسکتی تھی وہ اسلام نے قائم کر دی ہے۔ لیکن اسلام اس مساوات کا قائل نہیں ہے جو قانونِ فطرت کے خلاف ہو۔ انسان ہونے کی حیثیت سے جیسے حقوق مرد کے ہیں ویسے ہی عورت کے ہیں ''لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ'' لیکن زوجِ فاعل ہونے کی حیثیت سے ذاتی فضیلت (بہ معنی عزت نہیں بلکہ بہ معنی غلبہ وتقدم) مرد کو حاصل ہے، وہ اس نے پورے انصاف کے ساتھ مرد کو عطا کی ہے وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ:۲۲۸) اس طرح عورت اور مرد میں فاضل اور مفضول کا فطری تعلق تسلیم کر کے اسلام نے خاندان کی تنظیم حسب ذیل قواعد پر کی ہے:

مرد کی قوّامیّت

خاندان میں مرد کی حیثیت قوّام کی ہے، یعنی وہ خاندان کا حاکم ہے، محافظ ہے، اخلاق اور معاملات کا نگراں ہے، اس کی بیوی بچّوں پر اس کی اطاعت فرض ہے (بشرطیکہ وہ اللہ اور رسول کی نافرمانی کا حکم نہ دے) اور اس پر خاندان کے لیے روزی کمانے اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی ذمے داری ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ط (النسآء:۳۴)

مرد عورتوں پر قوّام ہیں، اس فضیلت کی بنا پر جو اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر عطا کی ہے، اور اس بنا پر کہ وہ ان پر (مہر ونفقہ کی صورت میں) اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

اَلرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰی اَهْلِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ (بخاری، باب قوا انفسکم واہلیکم ناراً کتاب النکاح)

مرد اپنے بیوی بچّوں پر حکمراں ہے، اور اپنی رعیت میں اپنے عمل پر وہ خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ط (النسآء:۳۴)

صالح بیویاں شوہروں کی اطاعت گزار اور اللہ کی توفیق سے شوہروں کی غیر موجودگی میں ان کے ناموس کی محافظ ہیں۔

قال النّبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا خرجت المرأة مِن بيتها و زوجها كاره لعنها كل ملك فى السّماء و كل شيءٍ مرت عليه غير الجن والانس حتّى ترجع. (کشف الغمه)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب عورت اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف گھر سے نکلتی ہے تو آسمان کا ہر فرشتہ اس پر لعنت بھیجتا ہے اور جن وانس کے سوا ہر وہ چیز جس پر سے وہ گزرتی ہے پھٹکار بھیجتی ہے تاوقتیکہ وہ واپس نہ ہو۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ج فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ط (النسآء: ۳۴)

اور جن بیویوں سے تم کو سرکشی و نافرمانی کا خوف ہو ان کو نصیحت کرو، (نہ مانیں تو) خواب گاہوں میں ان سے ترکِ تعلق کرو (پھر بھی باز نہ آئیں تو) مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان پر زیادتی کرنے کے لیے کوئی بہانہ نہ ڈھونڈو۔

وقال النّبی صلی اللہ علیہ وسلم لاطاعة لمن لم يطع الله (رواہ احمد من حدیث) **ولا طاعة فى معصية اللّٰهِ** (رواہ احمد من حدیث عمران بن حصین) **انما الطاعة فى المعروف.** (بخاری۔ کتاب الاحکام)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص خدا کی اطاعت نہ کرے اس کی اطاعت نہ کی جائے۔ اللہ کی نافرمانی میں کسی شخص کی فرماں برداری نہیں کی جا سکتی۔ فرماں برداری صرف معروف میں ہے۔ (یعنی ایسے حکم میں جو جائز اور معقول ہو)۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ط وَاِنْ جٰهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ط (العنکبوت: ۸)

اور ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ ادب سے پیش آئے لیکن اگر وہ تجھ کو حکم دیں کہ تو میرے ساتھ کوئی شریک ٹھیرائے جس کے لیے تیرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اس معاملے میں اُن کی اطاعت نہ کر۔

اس خاندان کی تنظیم اس طور پر کی گئی ہے کہ اس کا ایک سر دھرا اور صاحبِ امر ہو۔ جو شخص اس نظم میں خلل ڈالنے کی کوشش کرے اس کے حق میں نبی علیہ کی یہ وعید ہے کہ:

من افسد أمراة علیٰ زوجها فلیس منّا. (کشف الغمه)

جو کوئی کسی عورت کے تعلقات اس کے شوہر سے خراب کرنے کی کوشش کرے اس کا کچھ تعلق ہم سے نہیں۔

عورت کا دائرۂ عمل

اس تنظیم میں عورت کو گھر کی ملکہ بنایا گیا ہے۔ کسب مال کی ذمے داری اس کے شوہر پر ہے، اور اس مال سے گھر کا انتظام کرنا اس کا کام ہے:

المرأة راعية علیٰ بیت زوجها و هی مَسْئُولَةٌ.

(بخاری باب قوا انفسکم و اهلیکم ناراً)

عورت اپنے شوہر کے گھر کی حکمراں ہے اور وہی اپنی حکومت کے دائرہ میں اپنے عمل کے لیے جوابدہ ہے۔

اس کو ایسے تمام فرائض سے سبکدوش کیا گیا ہے جو بیرونِ خانہ کے امور سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ مثلاً:

- اس پر نماز جمعہ واجب نہیں۔ (ابو دائود۔ باب الجمعة للمملوك والمرأة)
- اس پر جہاد بھی فرض نہیں، اگر چہ بوقتِ ضرورت وہ مجاہدین کی خدمت کے لیے جا سکتی ہیں جیسا کہ آگے چل کر بہ تحقیق بیان ہوگا۔
- اس کے لیے جنازوں کی شرکت بھی ضروری نہیں، بلکہ اس سے روکا گیا ہے۔

(بخاری باب اتباع النساء الجنائز)

- اس پر نماز با جماعت اور مسجدوں کی حاضری بھی لازم نہیں کی گئی۔ اگر چہ چند پابندیوں کے ساتھ مسجدوں میں آنے کی اجازت ضرور دی گئی ہے۔ لیکن اس کو پسند نہیں کیا گیا۔
- اس کو محرم کے بغیر سفر کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔

(ترمذی، باب ماجاء فی کراهة ان تسافر المرأة وحدها۔ ابو دائود، باب فی المرأة تحج بغیر محرم)

غرض ہر طریقہ سے عورت کے گھر سے نکلنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور اس کے لیے قانونِ اسلامی میں پسندیدہ صورت یہی ہے کہ وہ گھر میں رہے جیسا کہ آیت ''وَقَرۡنَ فِی بُیُوۡتِکُنَّ''(۱) کا صاف منشا ہے۔ لیکن اس باب میں زیادہ سختی اس لیے نہیں کی گئی کہ بعض حالات میں عورتوں کے لیے گھر سے نکلنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ ایک عورت کا کوئی سر دھرا نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ محافظِ خاندان کی مفلسی،

---

(۱) بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکم نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے لیے خاص ہے کیوں کہ آیت کی ابتدا یَانِسَآءَ النَّبِیِّ سے کی گئی ہے لیکن اس پوری آیت میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان میں سے کون سی ہدایت ایسی ہے جو امّہاتِ مومنین کے ساتھ خاص ہو؟ فرمایا گیا ہے کہ اگر تم پرہیز گار ہو تو دبی زبان سے لگاوٹ کے انداز میں کسی سے بات نہ کرو تا کہ جس شخص کے دل میں کھوٹ ہو وہ تمہارے متعلق کچھ امیدیں اپنے دل میں نہ پال لے۔ جو بات کرو سیدھے سادے انداز میں کرو۔ اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو۔ جاہلیت کے بناؤ سنگھار نہ کرتی پھرو۔ نماز پڑھو، زکوٰۃ دو، اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، اللہ چاہتا ہے کہ گندگی کو تم سے دور کردے۔'' ان ہدایات پر غور کیجیے۔ ان میں سے کون سی چیز ہے جو عام مسلمان عورتوں کے لیے نہیں ہے؟ کیا مسلمان عورتیں پرہیز گار نہ بنیں؟ کیا وہ غیر مردوں سے لگاوٹ کی باتیں کیا کریں؟ کیا وہ جاہلیت کے بناؤ سنگھار کرتی پھریں؟ کیا وہ نماز وزکوٰۃ اور اطاعتِ خدا اور رسول سے انحراف کریں؟ کیا اللہ تعالیٰ ان کو گندگی میں رکھنا چاہتا ہے؟ اگر یہ سب ہدایات سب مسلمان عورتوں کے لیے عام ہیں تو صرف ''وَقَرۡنَ فِی بُیُوۡتِکُن'' ہی کو ازواجِ نبی کے ساتھ خاص کرنے کی کیا وجہ ہے۔

دراصل غلط فہمی اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ آیت کی ابتدا میں لوگوں کو یہ الفاظ نظر آئے کہ ''اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔'' لیکن یہ انداز بیان بالکل اس طرح کا ہے کہ جیسے کسی شریف بچہ سے کہا جائے کہ ''تم کوئی عام بچّوں کی طرح تو ہو نہیں کہ بازاروں میں پھرو اور بیہودہ حرکات کرو۔ تمہیں تمیز سے رہنا چاہیے۔'' ایسا کہنے سے یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ دوسرے بچّوں کے لیے بازاری پن اور بیہودہ حرکات پسندیدہ ہیں اور خوش تمیزی ان کے حق میں مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ اس سے حُسنِ اخلاق کا ایک معیار قائم کرنا مقصود ہوتا ہے تا کہ ہر وہ بچہ جو شریف بچّوں کی طرح رہنا چاہتا ہو اس معیار پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ قرآن میں عورتوں کے لیے نصیحت کا یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ عرب جاہلیت کی عورتوں میں ویسی ہی آزادی تھی جیسی اس وقت یورپ میں ہے۔ نبی ﷺ کے ذریعہ سے بتدریج ان کو اسلامی تہذیب کا خوگر بنایا جارہا تھا۔ اور ان کے لیے اخلاقی حدود اور ضابطۂ معاشرت کی قیود مقرر کی جارہی تھیں۔ اس حالت میں امّہات المومنین کی زندگی کو خاص طور پر منضبط کیا گیا تا کہ وہ دوسری عورتوں کے لیے نمونہ بن جائیں اور عام مسلمانوں کے گھروں میں ان کے طریقوں کی تقلید کی جائے، ٹھیک یہی رائے علاّمہ ابوبکر جصاص نے اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں، یہ حکم اگرچہ نبی ﷺ اور آپ کی بیویوں کے حق میں نازل ہوا ہے مگر اس کی مراد عام ہے جس میں آپ اور دوسرے سب مسلمان شریک ہیں کیوں کہ ہم آپ کی پیروی پر مامور ہیں اور سب احکام جو آپ کے لیے نازل ہوئے ہیں ہمارے لیے بھی ہیں بجز ان امور کے جن کے متعلق تصریح ہے کہ وہ آپ کے لیے خاص ہیں۔ (ج: سوم، ص: ۵۵)

قلتِ معاش، بیماری، معذوری یا اور ایسے ہی وجوہ سے عورت باہر کام کرنے پر مجبور ہو جائے۔ ایسی تمام صورتوں کے لیے قانون میں کافی گنجایش رکھی گئی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

قد اذن اللّٰہ لکن ان تخرجن لِحوائجکن۔(۱)

اللہ تعالیٰ نے تم کو اجازت دی ہے کہ تم اپنی ضروریات کے لیے گھر سے نکل سکتی ہو۔

مگر اس قسم کی اجازت جو محض حالات اور ضروریات کی رعایت سے دی گئی ہے، اسلامی نظامِ معاشرت کے اس قاعدے میں ترمیم نہیں کرتی کہ عورت کا دائرۂ عمل اس کا گھر ہے یہ تو محض وسعت اور رخصت ہے، اور اس کو اسی حیثیت میں رہنا چاہیے۔

ضروری پابندیاں

بالغ عورت کو اپنے ذاتی معاملات میں کافی آزادی بخشی گئی ہے۔ مگر اس کو اس حد تک خوداختیاری عطا نہیں کی گئی جس حد تک بالغ مرد کو عطا کی گئی ہے۔ مثلاً:

مرد اپنے اختیار سے جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ لیکن عورت خواہ کنواری ہو یا شادی شدہ یا بیوہ، ہر حال میں ضرورت ہے کہ سفر میں اس کے ساتھ ایک محرم ہو:

لایحل لامرأة تؤمن باللّٰہ و الیوم الأخر ان تسافر سفراً یکون ثلاثة ایام فصاعداً الا ومعها ابوها او اخوها اوزوجها او ابنها او ذومحرمٍ منها.

کسی عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو یہ حلال نہیں ہے کہ وہ تین دن یا اس سے زیادہ کا سفر کرے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ اس کا باپ یا بھائی یا شوہر یا بیٹا یا کوئی محرم مرد ہو۔

وعن ابی هریرة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه قال لا تسافر المرأة مسیرة یوم ولیلة الاومعها محرم، والعمل علیٰ هذا عند اهل العلم. (ترمذی باب ماجاء فی کراهة ان تسافر المرأة وحدها)

(۱) بخاری باب خروج النساء لحوائجهن و فی هذا المغنی، حدیث فی المسلم، باب اباحة الخروج للنساء لقضاء حاجة الانسان

اور ابو ہریرہؓ کی روایت نبی ﷺ سے یہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: عورت ایک دن رات کا سفر نہ کرے جب تک کہ اس کے ساتھ کوئی محرم مرد نہ ہو۔

و عن ابی هریرة ایضا ان النبی ﷺ قال لایحل لامرأة مسلمة تسافر مسیرة لیلة الاومعها رجل ذوحرمة منها.

(ابو دائود، باب فی المرأة تحج بغیر محرم)

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: کسی مسلمان عورت کے لیے حلال نہیں ہے کہ ایک رات کا سفر کرے تاوقتیکہ اس کے ساتھ ایک محرم مرد نہ ہو۔

ان روایات میں جو اختلاف مقدارِ سفر کی تعین میں ہے وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ دراصل ایک دن یا دو دن کا سوال اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ اہمیت صرف اس امر کی ہے کہ عورت کو تنہا نقل وحرکت کرنے کی ایسی آزادی نہ دی جائے جو موجبِ فتنہ ہو۔ اسی لیے حضورؐ نے مقدار سفر متعیّن کرنے میں زیادہ اہتمام نہ فرمایا، اور مختلف حالات میں وقت اور موقع کی رعایت سے مختلف مقداریں ارشاد فرمائیں۔

مرد کو اپنے نکاح کے معاملہ میں پوری آزادی حاصل ہے۔ مسلمان یا کتابیہ عورتوں میں سے جس کے ساتھ چاہے وہ نکاح کرسکتا ہے اور لونڈی بھی رکھ سکتا ہے، لیکن عورت اس معاملہ میں کلیتہً خودمختار نہیں ہے۔ وہ کسی غیر مسلم سے نکاح نہیں کرسکتی:

لاَ هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلاَ هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ط (الممتحنة: ۱۰)

نہ یہ اُن کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ ان کے لیے حلال۔

وہ اپنے غلام سے بھی تمتع نہیں کرسکتی۔ قرآن میں جس طرح مرد کو لونڈی سے تمتع کی اجازت دی گئی ہے اس طرح عورت کو نہیں دی گئی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک عورت نے ''مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ'' کی غلط تاویل کرکے اپنے غلام سے تمتع کیا تھا۔ آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے یہ معاملہ صحابہ کی مجلسِ شوریٰ میں پیش کیا اور سب نے بالاتفاق فتویٰ دیا کہ ''قَبَّحَهَا الله تاولت کتاب الله غیر تاویله'' (اس نے کتاب اللہ کو غلط معنی پہنائے) ایک اور عورت نے حضرت عمرؓ سے ایسے ہی فعل کی اجازت مانگی، تو آپ نے اس کو سخت سزا دی اور فرمایا

لن تزال العرب بخير مامنعت نساؤ ھا۔ یعنی عرب کی بھلائی اسی وقت تک ہے جب تک اس کی عورتیں محفوظ ہیں۔(کشف الغمه للشعرانی)

غلام اور کافر کو چھوڑ کر آزاد مسلمان مردوں میں سے عورت اپنے لیے شوہر کا انتخاب کرسکتی ہے، لیکن اس معاملہ میں بھی اس کے لیے اپنے باپ دادا، بھائی اور دوسرے اولیاء کی رائے کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ اولیاء کو یہ حق نہیں کہ عورت کی مرضی کے خلاف کسی سے ان کا نکاح کردیں۔ کیوں کہ ارشادِ نبوی ہے کہ الایم احق بنفسھا من ولیھا[1] اور لاتنکح البکر حتی تستاذن[2]۔ مگر عورت کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اپنے خاندان کے ذمے دار مردوں کی رائے کے خلاف جس کے ساتھ چاہے نکاح کرلے۔ اسی لیے قرآن مجید میں جہاں مرد کے نکاح کا ذکر ہے وہاں نَکَحَ یَنْکِحُ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی خود نکاح کرلینے کے ہیں، مثلاً: ''وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ'' مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو''فَانْكِحوُ هُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ'''' ان سے ان کے گھروالوں کی اجازت لے کر نکاح کرلو۔'' مگر جہاں عورت کے نکاح کا ذکر آیا ہے وہاں عموماً باب افعال سے اِنْکَاح کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے معنی نکاح کردینے کے ہیں۔ مثلاً، ''وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ'' (النور:۳۲) ''اپنی بے شوہر عورتوں کے نکاح کرو۔'' وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا (بقرہ:۲۲۱) ''اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔''

اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح شادی شدہ عورت اپنے شوہر کی تابع ہے اسی طرح غیر شادی شدہ عورت اپنے خاندان کے ذمے دار مردوں کی تابع ہے۔ مگر یہ تابعیت اس معنی میں نہیں ہے کہ اس کے لیے ارادہ وعمل کی کوئی آزادی نہیں۔ یا اُسے اپنے معاملہ میں کوئی اختیار نہیں۔ بلکہ اس معنی میں ہے کہ نظامِ معاشرت کو اختلال و برہمی سے محفوظ رکھنے اور خاندان کے اخلاق و معاملات کو اندرونی و بیرونی فتنوں سے بچانے کی ذمے داری مرد پر ہے اور اس نظم کی خاطر عورت پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ جو شخص اس نظم کا ذمے دار ہو اس کی اطاعت کرے خواہ وہ اس کا شوہر ہو، یا باپ یا بھائی۔

---

(۱) لڑکی اپنے معاملہ میں فیصلہ کرنے کا حق اپنے ولی سے زیادہ رکھتی ہے۔

(۲) باکرہ لڑکی کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس سے اجازت نہ لے لی جائے۔

عورت کے حقوق

اس طرح اسلام نے ''بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ '' کو ایک فطری حقیقت تسلیم کرنے کے ساتھ ہی ''لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ '' کی بھی ٹھیک ٹھیک تعین کر دی ہے۔ عورت اور مرد میں حیاتیات اور نفسیات کے اعتبار سے جو فرق ہے اس کو بعینہ قبول کرتا ہے، جتنا فرق ہے اُسے جوں کا توں برقرار رکھتا ہے، اور جیسا فرق ہے اس کے لحاظ سے ان کے مراتب اور وظائف مقرر کرتا ہے۔

اس کے بعد ایک اہم سوال عورت کے حقوق کا ہے۔ ان حقوق کی تعین میں اسلام نے تین باتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔

ایک یہ کہ مرد کو جو حاکمانہ اختیارات محض خاندان کے نظم کی خاطر دیے گئے ہیں اُن سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ ظلم نہ کر سکے، اور ایسا نہ ہو کہ تابع متبوع کا تعلق عملاً لونڈی اور آقا کا تعلق بن جائے۔

دوسرے یہ کہ عورت کو ایسے تمام مواقع بہم پہنچائے جائیں جن سے فائدہ اٹھا کر وہ نظامِ معاشرت کے حدود میں اپنی فطری صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے اور تعمیرِ تمدّن میں اپنے حصے کا کام بہتر سے بہتر انجام دے سکے۔

تیسرے یہ کہ عورت کے لیے ترقی اور کامیابی کے بلند درجوں تک پہنچنا ممکن ہو، مگر اس کی ترقی اور کامیابی جو کچھ بھی ہو عورت ہونے کی حیثیت سے ہو۔ مرد بننا نہ تو اس کا حق ہے، نہ مردانہ زندگی کے لیے اس کو تیار کرنا، اس کے لیے اور تمدّن کے لیے مفید ہے، اور نہ مردانہ زندگی میں وہ کامیاب ہو سکتی ہے۔

مذکورہ بالا تینوں امور کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھ کر اسلام نے عورت کو جیسے وسیع تمدّنی و معاشی حقوق دیے ہیں اور عزّت و شرف کے جو بلند مراتب عطا کیے ہیں اور ان حقوق و مراتب کی حفاظت کے لیے اپنی اخلاقی اور قانونی ہدایات میں جیسی پائدار ضمانتیں مہیّا کی ہیں، اُن کی نظیر دنیا کے کسی قدیم و جدید نظامِ معاشرت میں نہیں ملتی۔

معاشی حقوق

سب سے اہم اور ضروری چیز جس کی بدولت تمدّن میں انسان کی منزلت قائم ہوتی ہے اور جس کے ذریعے سے وہ اپنی منزلت کو برقرار رکھتا ہے۔ وہ اس کی معاشی حیثیت کی مضبوطی ہے۔ اسلام کے سوا تمام قوانین نے عورت کو معاشی حیثیت سے کمزور کیا ہے۔ اور یہی معاشی بے بسی معاشرت میں عورت کی غلامی کا سب سے بڑا سبب بنی ہے۔ یورپ نے اس حالت کو بدلنا چاہا، مگر اس طرح کہ عورت کو ایک کمانے والا فرد بنا دیا ہے۔ یہ ایک دوسری عظیم تر خرابی کا باعث بن گیا۔ اسلام بیچ کا راستہ اختیار کرتا ہے، وہ عورت کو وراثت کے نہایت وسیع حقوق دیتا ہے، باپ سے، شوہر سے، اولاد سے اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے اس کو وراثت(۱) ملتی ہے۔ نیز شوہر سے اس کو مہر بھی ملتا ہے اور ان تمام ذرائع سے جو کچھ مال اس کو پہنچتا ہے اس میں ملکیت اور قبض وتصرف کے پورے حقوق اسے دیے گئے ہیں۔ جس میں مداخلت کرنے کا اختیار نہ اس کے باپ کو حاصل ہے، نہ شوہر کو، نہ کسی اور کو۔ مزید برآں اگر وہ کسی تجارت میں روپیہ لگا کر، یا خود محنت کر کے کچھ کمائے تو اس کی مالک بھی کلیتہً وہی ہے، اور ان سب کے باوجود اس کا نفقہ ہر حال میں اس کے شوہر پر واجب ہے۔ بیوی خواہ کتنی ہی مالدار ہو، اس کا شوہر اس کے نفقہ سے بریٔ الذّمہ نہیں ہوسکتا۔ اس طرح اسلام میں عورت کی معاشی حیثیت اتنی مستحکم ہوگئی ہے کہ بسا اوقات وہ مرد سے زیادہ بہتر حالت میں ہوتی ہے۔

تمدّنی حقوق

۱- عورت کو شوہر کے انتخاب کا پورا حق دیا گیا ہے۔ اُس کی مرضی کے خلاف یا اُس کی رضامندی کے بغیر کوئی شخص اس کا نکاح نہیں کرسکتا۔ اور اگر وہ خود اپنی مرضی سے کسی مسلم کے ساتھ نکاح کر لے تو کوئی اُسے روک نہیں سکتا۔ البتہ اگر اس کی نظرِ انتخاب کسی ایسے

---

(۱) وراثت میں عورت کا حصّہ مرد کے مقابلے میں نصف رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت کو نفقہ اور مہر کے حقوق حاصل ہیں جن سے مرد محروم ہے۔ عورت کا نفقہ صرف اس کے شوہر ہی پر واجب نہیں ہے، بلکہ شوہر نہ ہونے کی صورت میں باپ، بھائی، بیٹے یا دوسرے اولیاء پر اس کی کفالت واجب ہوتی ہے پس جب عورت پر وہ ذمے داریاں نہیں ہیں جو مرد پر ہیں، تو وراثت میں اس کا حصّہ بھی وہ نہ ہونا چاہیے جو مرد کا ہے۔

شخص پر پڑے جو اس کے خاندان کے مرتبے سے گرا ہوا ہو تو اس صورت میں اس کے اولیا کو اعتراض کا حق حاصل ہے۔

۲- ایک ناپسندیدہ یا ظالم یا ناکارہ شوہر کے مقابلے میں عورت کو خلع اور فسخ و تفریق کے وسیع حقوق دیے گئے ہیں۔

۳- شوہر کو بیوی پر جو اختیارات اسلام نے عطا کیے ہیں ان کے استعمال میں حسنِ سلوک اور فیاضانہ برتاؤ کی ہدایت کی گئی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے ''وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ'' (عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو) وَلَا تَنْسَوُا الفَضْلَ بَيْنَكُمْ (آپس کے تعلقات میں فیاضی کو نہ بھول جاؤ) نبی ﷺ کا ارشاد ہے ''خیر کم خیر کم لنسائه والطفهم باهله'' (تم میں اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ اچھے ہیں اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ لطف و مہربانی کا سلوک کرنے والے ہیں) یہ محض اخلاقی ہدایات ہی نہیں ہیں۔ اگر شوہر اپنے اختیارات کے استعمال میں ظلم سے کام لے تو عورت کو قانون سے مدد لینے کا حق بھی حاصل ہے۔

۴- بیوہ اور مطلّقہ عورتوں اور ایسی تمام عورتوں کو جن کے نکاح از روئے قانون فسخ کیے گئے ہوں، یا جن کو حکمِ تفریق کے ذریعے سے شوہر سے جدا کیا گیا ہو۔ نکاحِ ثانی کا غیر مشروط حق دیا گیا ہے، اور اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے کہ ان پر شوہر سابق یا اُس کے کسی رشتہ دار کا کوئی حق باقی نہیں۔ یہ وہ حق ہے جو آج تک یورپ اور امریکہ کے بیشتر ممالک میں بھی عورت کو نہیں ملا ہے۔

۵- دیوانی اور فوجداری کے قوانین میں عورت اور مرد کے درمیان کامل مساوات قائم کی گئی ہے۔ جان و مال اور عزّت کے تحفّظ میں اسلامی قانون عورت اور مرد کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں رکھتا۔

عورتوں کی تعلیم

عورتوں کو دینی اور دنیوی علوم سیکھنے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے بلکہ اُن کی تعلیم و تربیت کو اسی قدر ضروری قرار دیا گیا ہے جس قدر مردوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ نبی ﷺ سے دین و اخلاق کی تعلیم جس طرح مرد حاصل کرتے تھے اسی طرح عورتیں بھی کرتی تھیں۔ آپ

نے ان کے لیے اوقات متعیّن فرما دیے تھے جن میں وہ آپ سے علم حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتی تھیں۔ آپ کی ازواجِ مطہرات اور خصوصاً حضرت عائشہ صدّیقہؓ نہ صرف عورتوں کی بلکہ مردوں کی بھی معلّمہ تھیں اور بڑے بڑے صحابہ وتابعین ان سے حدیث، تفسیر اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اشراف تو درکنار، نبی ﷺ نے لونڈیوں تک کو علم اور ادب سکھانے کا حکم دیا تھا چنانچہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ:

ایما رجل کانت عنده ولیدة فعلّمها فاحسن تعلیمها و ادّبها فاحسن تادیبها ثم اعتقها و تزوجها فله اجران.

(بخاری کتاب النکاح)

جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اس کو خوب تعلیم دے اور عمدہ تہذیب وشائستگی سکھائے پھر اس کو آزاد کر کے اس سے شادی کرے اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔

پس جہاں تک نفسِ تعلیم وتربیت کا تعلق ہے، اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے۔ البتہ نوعیت میں فرق ضروری ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کی صحیح تعلیم و تربیت وہ ہے جو اس کو ایک بہترین بیوی، بہترین ماں اور بہترین گھر والی بنائے۔ اس کا دائرۂ عمل گھر ہے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ اُن علوم کی تعلیم دی جانی چاہیے جو اُس دائرہ میں اُسے زیادہ مفید بنا سکتے ہیں۔ مزید برآں وہ علوم بھی اس کے لیے ضروری ہیں جو انسان کو انسان بنانے والے اور اس کے اخلاق کو سنوارنے والے اور اس کی نظر کو وسیع کرنے والے ہیں۔ ایسے علوم اور ایسی تربیت سے آراستہ ہونا ہر مسلمان عورت کے لیے لازم ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی عورت غیر معمولی عقلی و ذہنی استعداد رکھتی ہو، اور ان علوم کے علاوہ دوسرے علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرنا چاہے تو اسلام اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ ان حدود سے تجاوز نہ کرے جو شریعت نے عورتوں کے لیے مقرر کیے ہیں۔

عورت کا اصلی اُٹھان (EMANCIPATION)

یہ تو صرف حقوق کا ذکر ہے مگر اس سے اس احسانِ عظیم کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو اسلام نے عورت پر کیا ہے۔ انسانی تمدّن کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ عورت کا وجود دنیا میں ذلّت،

شرم اور گناہ کا وجود تھا۔ بیٹی کی پیدائش باپ کے لیے سخت عیب اور موجبِ ننگ و عار تھی، سسرالی رشتے ذلیل سمجھے جاتے تھے، حتیٰ کہ سسرے اور سالے کے الفاظ اسی جاہلی تخیّل کے تحت آج تک گالی کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ بہت سی قوموں میں اسی ذلت سے بچنے کے لیے لڑکیوں کو قتل کر دینے کا رواج ہو گیا تھا۔[1] جہلاء تو درکنار علما اور پیشوایانِ مذہب تک میں مدتوں تک یہ سوال زیرِ بحث رہا کہ آیا عورت انسان بھی ہے یا نہیں؟ اور خدا نے اس کو روح بخشی ہے یا نہیں؟ ہندو مذہب میں ویدوں کی تعلیم کا دروازہ عورت کے لیے بند تھا۔ بودھ مت میں عورت سے تعلق رکھنے والے کے لیے نروان کی کوئی صورت نہ تھی۔ مسیحیت اور یہودیت کی نگاہ میں عورت ہی انسانی گناہ کی بانی مبانی اور ذمے دار تھی۔ یونان میں گھر والیوں کے لیے نہ علم تھا، نہ تہذیب و ثقافت تھی اور نہ حقوقِ مدنیت۔ یہ چیزیں جس عورت کو ملتی تھیں وہ رنڈی ہوتی تھی۔ روم اور ایران اور چین اور مصر اور تہذیبِ انسانی کے دوسرے مرکزوں کا حال بھی قریب قریب ایسا ہی تھا۔ صدیوں کی مظلومی اور محکومی اور عالم گیر حقارت کے برتاؤ نے خود عورت کے ذہن سے بھی عزتِ نفس کا احساس مٹا دیا تھا۔ وہ خود بھی اس امر کو بھول گئی تھی کہ دنیا میں وہ کوئی حق لے کر پیدا ہوئی ہے یا اس کے لیے بھی عزّت کا کوئی مقام ہے۔ مرد اس پر ظلم و ستم کرنا اپنا حق سمجھتا تھا اور وہ اس کے ظلم کو سہنا اپنا فرض جانتی تھی۔ غلامانہ ذہنیت اس حد تک اس میں پیدا کر دی گئی تھی کہ وہ فخر کے ساتھ اپنے آپ کو شوہر کی ''داسی'' کہتی تھی۔ ''پتی ورتا'' اس کا دھرم تھا، اور پتی ورتا کے معنی یہ تھے کہ شوہر اس کا معبود اور دیوتا ہے۔

اس ماحول میں جس نے نہ صرف قانونی اور عملی حیثیت سے بلکہ ذہنی حیثیت سے بھی ایک عظیم انقلاب برپا کیا، وہ اسلام ہے۔ اسلام نے ہی عورت اور مرد دونوں کی ذہنیتوں کو بدلا ہے۔ عورت کی عزّت اور اس کے حق کا تخیّل ہی انسان کے دماغ میں اسلام کا پیدا کیا ہوا ہے۔

---

(۱) قرآن اس جاہلی ذہنیت کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کرتا ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ (النحل: ۵۸،۵۹)

اور جب اُن میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اُس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ زہر کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اس خبر سے جو شرم کا داغ اس کو لگ گیا ہے اس کے باعث لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ آیا ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہوں یا مٹی میں دبا دوں۔

آج حقوقِ نسواں اور تعلیمِ نسواں اور بیداریِ اناث کے جو الفاظ آپ سُن رہے ہیں، یہ سب اسی انقلاب انگیز صدا کی بازگشت ہیں جو محمد ﷺ کی زبان سے بلند ہوئی تھی اور جس نے افکارِ انسانی کا رخ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ وہ محمد ﷺ ہی ہیں جنہوں نے دنیا کو بتایا کہ عورت بھی ویسی ہی انسان ہے جیسا مرد ہے:

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (النسآء: ۱)

اللہ نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا۔

خدا کی نگاہ میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ (النسآء: ۳۲)

مرد جیسا عمل کریں ان کا پھل وہ پائیں گے اور عورتیں جیسے عمل کریں ان کا پھل وہ پائیں گی۔

ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ روحانی ترقی کے جو درجات مرد کو مل سکتے ہیں وہی عورت کے لیے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ مرد اگر ابراہیم بن ادھم بن سکتا ہے تو عورت کو بھی رابعہ بصریہ بننے سے کوئی شے نہیں روک سکتی:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ (آل عمران: ۱۹۵)

ان کے رب نے ان کی دعا کے جواب میں فرمایا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہ کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کی جنس سے ہو۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۝ (النسآء: ۱۲۴)

اور جو کوئی بھی نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، مگر ہو ایماندار، تو ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر رتی برابر ظلم نہ ہوگا۔

پھر وہ محمد ﷺ ہی ہیں جنہوں نے مرد کو بھی خبر دار کیا اور عورت میں بھی یہ احساس پیدا کیا کہ جیسے حقوق عورت پر مرد کے ہیں ویسے ہی مرد پر عورت کے ہیں:

لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ. (البقرة:۲۲۸)

عورت پر جیسے فرائض ہیں ویسے ہی اس کے حقوق بھی ہیں۔

پھر وہ محمد ﷺ ہی کی ذات ہے جس نے ذلّت اور عار کے مقام سے اٹھا کر عورت کو عزّت کے مقام پر پہنچایا۔ وہ حضورؐ ہی ہیں جنہوں نے باپ کو بتایا کہ بیٹی کا وجود تیرے لیے ننگ و عار نہیں ہے، بلکہ اس کی پرورش اور اس کی حق رسانی تجھے جنت کا مستحق بناتی ہے:

من عال جاریتین حتی تبلغا جاء یوم القیٰمة انا وهو وضمّ اصابعه. (مسلم، کتاب البر والصلة والادب)

جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ بلوغ کو پہنچ گئیں تو قیامت کے روز، میں اور وہ اس طرح آئیں گے جیسے میرے ہاتھ کی دو انگلیاں ساتھ ساتھ ہیں۔

من ابتلیٰ من البنات بشیءٍ فاحسن الیهن هُنَّ له سترا من النار. (مسلم، کتاب مذکور)

جس کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوں اور وہ اچھی طرح ان کی پرورش کرے تو یہی لڑکیاں اس کے لیے دوزخ سے آڑ بن جائیں گی۔

حضورؐ ہی نے شوہر کو بتایا کہ نیک بیوی تیرے لیے دنیا میں سب سے بڑی نعمت ہے:

خیر متاع الدنیا المرأة الصالحة. (نسائی، کتاب عشرة النساء)

دنیا کی نعمتوں میں بہترین نعمت نیک بیوی ہے۔

حبب الّی من الدنیا النساء والطیب وجعل قرة عینی فی الصلوة. (نسائی، کتاب عشرة النساء)

دنیا کی چیزوں میں مجھ کو سب سے زیادہ محبوب عورت اور خوشبو ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

لیس من متاع الدنیا شئ افضل من المرأة الصالحةِ.

(ابن ماجه، کتاب النکاح)

دنیا کی نعمتوں میں کوئی چیز نیک بیوی سے بہتر نہیں ہے۔

حضوؐر ہی نے بیٹے کو بتایا کہ خدا اور رسول کے بعد سب سے زیادہ عزت اور قدر و منزلت اور حسنِ سلوک کی مستحق تیری ماں ہے۔

سأل رجل یا رسول اللّٰہ من احق بحسن صحابتی قال امک، قال ثم من؟ قال امک، قال ثم من؟ قال امک، قال ثم من؟ قال ابوک. (بخاری، کتاب الادب)

ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ! مجھ پر حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟ فرمایا، تیری ماں کا۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا، تیری ماں کا۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا، تیری ماں کا۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا، تیرا باپ۔

ان اللّٰہ حرم علیکم عقوق الامھات. (بخاری، کتاب الادب)

اللہ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور حق تلفی حرام کردی ہے۔

حضوؐر ہی نے انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ جذبات کی فراوانی اور حسیّات کی نزاکت اور انتہا پسندی کی جانب میل و انعطاف عورت کی فطرت میں ہے۔ اسی فطرت پر اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے اور یہ انوثت کے لیے عیب نہیں، اس کا حسن ہے۔ تم اس سے جو کچھ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہو اس فطرت پر قائم رکھ کر ہی اٹھا سکتے ہو۔ اگر اس کو مردوں کی طرح سیدھا اور سخت بنانے کی کوشش کرو گے تو اسے توڑ دو گے۔ ''المرأۃ کالضلع ان اقمتھا کسرتھا و ان استمتعت بھا استمتعت بھا و فیھا عوج'' (بخاری، باب مداراتِ النساء)۔

اس طرح محمد ﷺ وہ پہلے اور درحقیقت آخری شخص ہیں جنہوں نے عورت کی نسبت نہ صرف مرد کی، بلکہ خود عورت کی اپنی ذہنیت کو بھی بدل دیا اور جاہلی ذہنیت کی جگہ ایک نہایت صحیح ذہنیت پیدا کی جس کی بنیاد جذبات پر نہیں، بلکہ خالص عقل اور علم پر تھی۔ پھر آپ نے باطنی اصلاح پر ہی اکتفا نہ فرمائی بلکہ قانون کے ذریعے سے عورتوں کے حقوق کی حفاظت اور مردوں کے ظلم کی روک تھام کا بھی انتظام کیا اور عورتوں میں اتنی بیداری پیدا کی کہ وہ اپنے جائز حقوق کو سمجھیں اور ان کی حفاظت کے لیے قانون سے مدد لیں۔

سرکار رسالت مآبؐ کی ذات میں عورتوں کو ایک ایسا رحیم و شفیق حامی اور ایسا زبردست محافظ مل گیا تھا کہ اگر ان پر ذرا سی بھی زیادتی ہوتی تو وہ شکایت لے کر بے تکلّف حضورؐ کے پاس دوڑ جاتی تھیں، اور مرد اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں ان کی بیویوں کو آنحضرتؐ تک شکایت لے جانے کا موقع نہ مل جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ جب تک حضورؐ زندہ رہے، ہم اپنی عورتوں سے بات کرنے میں احتیاط کرتے تھے کہ مبادا ہمارے حق میں کوئی حکم نازل نہ ہو جائے۔ جب حضورؐ نے وفات پائی تب ہم نے کھل کر بات کرنی شروع کی۔

(بخاری، باب الوصاۃ بالنساء)

ابن ماجہ میں ہے کہ حضورؐ نے بیویوں پر دست درازی کرنے کی عام ممانعت فرما دی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے شکایت کی کہ عورتیں بہت شوخ ہوگئی ہیں۔ ان کو مطیع کرنے کے لیے مارنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ آپؐ نے اجازت دے دی۔ لوگ نہ معلوم کب سے بھرے بیٹھے تھے۔ جس روز اجازت ملی، اسی روز ستّر عورتیں اپنے گھروں میں پیٹی گئیں۔ دوسرے دن نبی ﷺ کے مکان پر فریادی عورتوں کا ہجوم ہوگیا سرکارؐ نے لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور فرمایا:

لقدطاف اللیلة بآل محمد سبعون امرأة کل امرأة تشتکی زوجھا فلا تجدون اولٰئک خیارکم.

آج محمدؐ کے گھر والوں کے پاس ستر عورتوں نے چکّر لگایا ہے۔ ہر عورت اپنے شوہر کی شکایت کر رہی تھی۔ جن لوگوں نے یہ حرکت کی ہے وہ تم میں سے ہرگز اچھے لوگ نہیں ہیں۔

اسی اخلاقی اور قانونی اصلاح کا نتیجہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں عورت کو وہ بلند حیثیت حاصل ہوئی جس کی نظیر دنیا کی کسی سوسائٹی میں نہیں پائی جاتی۔ مسلمان عورت دنیا اور دین میں مادّی، عقلی اور روحانی حیثیات سے عزّت اور ترقی کے ان بلند سے بلند مدارج تک پہنچ سکتی ہے جن تک مرد پہنچ سکتا ہے اور اس کا عورت ہونا کسی مرتبہ میں بھی اس کی راہ میں حائل نہیں ہے۔ آج اس بیسویں صدی میں بھی دنیا اسلام سے بہت پیچھے ہے۔ افکارِ انسانی کا ارتقا اب بھی اس مقام تک نہیں پہنچا ہے جس پر اسلام پہنچا ہے۔ مغرب نے عورت کو جو کچھ دیا ہے عورت کی حیثیت سے

نہیں دیا ہے بلکہ مرد بنا کر دیا ہے۔ عورت درحقیقت اب بھی اس کی نگاہ میں ویسی ہی ذلیل ہے، جیسی پُرانے دورِ جاہلیت میں تھی۔ گھر کی ملکہ، شوہر کی بیوی، بچّوں کی ماں، ایک اصلی اور حقیقی عورت کے لیے اب بھی کوئی عزّت نہیں ہے۔ عزّت اگر ہے تو اس مردِ مؤنث یا زنِ مذکّر کے لیے ہے جو جسمانی حیثیت سے تو عورت ہو مگر دماغی اور ذہنی حیثیت سے مرد ہو اور تمدّن و معاشرت میں مرد ہی کے سے کام کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ انوثت کی عزّت نہیں۔ رجولیت کی عزّت ہے۔

پھر احساسِ پستی کی ذہنی الجھن (Inferiority Complex) کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ مغربی عورت مردانہ لباس فخر کے ساتھ پہنتی ہے۔ حالاں کہ کوئی مرد زنانہ لباس پہن کر برسرِ عام آنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ بیوی بننا لاکھوں مغربی عورتوں کے نزدیک موجبِ ذلّت ہے، حالاں کہ شوہر بننا کسی مرد کے نزدیک ذلّت کا موجب نہیں۔ مردانہ کام کرنے میں عورتیں عزّت محسوس کرتی ہیں، حالاں کہ خانہ داری اور پرورشِ اطفال، جیسے خالص زنانہ کاموں میں کوئی مرد عزّت محسوس نہیں کرتا۔

پس بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ مغرب نے عورت کو بحیثیت عورت ہونے کے کوئی عزّت نہیں دی ہے۔ یہ کام اسلام اور صرف اسلام نے کیا ہے کہ عورت کو تمدّن و معاشرت میں اس کے فطری مقام پر رکھ کر عزّت و شرف کا مرتبہ عطا کیا۔ اور صحیح معنوں میں انوثت کے درجہ کو بلند کر دیا۔ اسلامی تمدّن کے لیے دونوں کی اہمیت یکساں ہے۔ دونوں اپنے اپنے دائرے میں جو خدمات انجام دیتے ہیں، وہ یکساں مفید اور یکساں قدر کی مستحق ہیں۔ نہ رجولیت میں کوئی شرف ہے نہ انوثت میں کوئی ذلّت۔ جس طرح مرد کے لیے عزّت اور ترقی اور کامیابی اسی میں ہے کہ وہ مرد رہے اور مردانہ خدمات انجام دے۔ اسی طرح عورت کے لیے بھی عزّت اور ترقی اور کامیابی اسی میں ہے کہ وہ عورت رہے اور زنانہ خدمات انجام دے۔

ایک صالح تمدّن کا کام یہی ہے کہ وہ عورت کو اس کے فطری دائرۂ عمل میں رکھ کر پورے انسانی حقوق دے۔ عزّت اور شرف عطا کرے۔ تعلیم و تربیت سے اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو چمکائے اور اسی دائرہ میں اس کے لیے ترقیوں اور کامیابیوں کی راہیں کھولے۔

باب ۱۱:

اسلامی نظامِ معاشرت

(۳) تحفُّظات

یہ اسلامی نظامِ معاشرت کا پورا خاکہ تھا۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے اس خاکہ کی اہم خصوصیات کو پھر ایک نظر دیکھ لیجیے:

۱۔ اس نظام کا منشا یہ ہے کہ اجتماعی ماحول کو حتی الامکان شہوانی ہیجانات اور تحریکات سے پاک رکھا جائے، تاکہ انسان کی جسمانی و ذہنی قوتوں کو ایک پاکیزہ اور پُرسکون فضا میں نشو و ارتقا کا موقع ملے اور وہ اپنی محفوظ اور مجتمع قوت کے ساتھ تعمیرِ تمدّن میں اپنے حصّہ کا کام انجام دے سکے۔

۲۔ صنفی تعلّقات بالکل دائرۂ ازدواج میں محدود ہوں اور اس دائرے کے باہر نہ صرف انتشارِ عمل کو روکا جائے بلکہ انتشارِ خیال کا بھی امکانی حد تک سدِّ باب کر دیا جائے۔

۳۔ عورت کا دائرۂ عمل مرد کے دائرے سے الگ ہو۔ دونوں کی فطرت اور ذہنی و جسمانی استعداد کے لحاظ سے تمدّن کی الگ الگ خدمات ان کے سپرد کی جائیں، اور ان کے تعلقات کی تنظیم اس طور پر کی جائے کہ وہ جائز حدود کے اندر ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔ مگر حدود سے تجاوز کر کے کوئی کسی کے کام میں خلل انداز نہ ہو سکے۔

۴۔ خاندان کے نظم میں مرد کی حیثیت قوّام کی ہو اور گھر کے تمام افراد صاحبِ خانہ کے تابع رہیں۔

۵۔ عورت اور مرد دونوں کو پورے انسانی حقوق حاصل ہوں، اور دونوں کو ترقی کے بہتر

مواقع بہم پہنچائے جائیں، مگر دونوں میں سے کوئی بھی ان حدود سے تجاوز نہ کر سکے جو معاشرت میں اس کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں۔

اس نقشے پر جس نظامِ معاشرت کی تاسیس کی گئی ہے اس کو چند ایسے تحفّظات کی ضرورت ہے جن سے اس کا نظم اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ برقرار رہے۔ اسلام میں یہ تحفّظات تین قسم کے ہیں:

۱- اصلاحِ باطن

۲- تعزیری قوانین

۳- انسدادی تدابیر

یہ تینوں تحفّظات نظامِ معاشرت کے مزاج اور اس کے مقاصد کی ٹھیک ٹھیک مناسبت ملحوظ رکھ کر تجویز کیے گئے ہیں اور مل جل کر اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

اصلاحِ باطن کے ذریعے سے انسان کی تربیت اس طور پر کی جاتی ہے کہ وہ خود بہ خود اس نظامِ معاشرت کی اطاعت پر آمادہ ہو، عام اس سے کہ خارج میں کوئی طاقت اس کو اطاعت کرنے پر مجبور کرنے والی ہو یا نہ ہو۔

تعزیری قوانین کے ذریعے سے ایسے جرائم کا سدِّ باب کیا جاتا ہے جو اس نظام کو توڑنے اور اس کے ارکان کو منہدم کرنے والے ہیں۔

انسدادی تدابیر کے ذریعے سے اجتماعی زندگی میں ایسے طریقے رائج کیے گئے ہیں جو سوسائٹی کے ماحول کو غیر طبعی ہیجانات اور مصنوعی تحریکات سے پاک کر دیتے ہیں اور صنفی انتشار کے امکانات کو کم سے کم حد تک گھٹا دیتے ہیں۔ اخلاقی تعلیم سے جن لوگوں کی اصلاحِ باطن مکمل نہ ہوئی ہو، اور جن کو تعزیری قوانین کا خوف بھی نہ ہو، ان کی راہ میں یہ طریقے ایسی رکاوٹیں ڈال دیتے ہیں کہ صنفی انتشار کی جانب میلان رکھنے کے باوجود اُن کے لیے عملی اقدام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہی وہ طریقے ہیں جو عورت اور مرد کے دائروں کو عملاً الگ کرتے ہیں۔ خاندان کے نظم کو اس کی صحیح اسلامی صورت پر قائم کرتے ہیں اور ان حدود کی حفاظت کرتے ہیں جو عورتوں اور مردوں کی زندگی میں امتیاز قائم رکھنے کے لیے اسلام نے مقرر کی ہیں۔

اصلاحِ باطن

اسلام میں اطاعتِ امر کی بنیاد کلیتہً ایمان پر رکھی گئی ہے۔ جو شخص خدا اور اس کی کتاب اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہو وہی شریعت کے اوامر و نواہی کا اصل مخاطب ہے۔ اور اس کو اوامر کا مطیع اور نواہی سے مجتنب بنانے کے لیے صرف یہ علم ہو جانا کافی ہے کہ فلاں امر خدا کا امر ہے اور فلاں نہی خدا کی نہی ہے۔ پس جب ایک مومن کو خدا کی کتاب سے یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ فحش اور بدکاری سے منع کرتا ہے، تو اس کے ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ اس سے پرہیز کرے اور اپنے دل کو بھی اس کی طرف مائل ہونے سے پاک رکھے۔ اسی طرح جب ایک مومن عورت کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے معاشرت میں اس کے لیے کیا حیثیت مقرر کی ہے تو اس کا بھی ایمانی اقتضا یہی ہے کہ وہ برضا و رغبت اس حیثیت کو قبول کرے اور اپنی حد سے تجاوز نہ کرے۔ اس لحاظ سے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اخلاق اور معاشرت کے دائرے میں بھی اسلام کے صحیح اور کامل اتباع کا مدار ایمان پر ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اخلاق اور معاشرت کے متعلق ہدایات دینے سے پہلے ایمان کی طرف دعوت دی گئی ہے اور دلوں میں اس کو راسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ تو اصلاحِ باطن کا وہ اساسی ذریعہ ہے جس کا تعلق صرف اخلاقیات ہی سے نہیں بلکہ پورے نظامِ اسلامی سے ہے۔ اس کے بعد خاص کر اخلاق کے دائرے میں اسلام نے تعلیم و تربیت کا ایک نہایت حکیمانہ طریقہ اختیار کیا ہے، جس کو مختصراً ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

حیا

پہلے اشارۃً یہ کہا جا چکا ہے کہ زنا اور چوری اور جھوٹ اور تمام دوسرے معاصی جن کا ارتکاب فطرتِ حیوانی کے غلبہ سے انسان کرتا ہے، سب کے سب فطرتِ انسانی کے خلاف ہیں۔ قرآن ایسے تمام افعال کو منکر کے جامع لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ منکر کا لفظی ترجمہ "مجہول" یا "غیر معروف" ہے۔ ان افعال کو منکر کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایسے افعال ہیں جن سے فطرتِ انسانی آشنا نہیں ہے۔ اب یہ ظاہر ہے مگر جب انسان کی فطرت ان سے نا آشنا ہے، اور حیوانی طبیعت اس پر

زبردستی ہجوم کرکے اس کو ان افعال کے ارتکاب پر مجبور کرتی ہے، تو خود انسان ہی کی فطرت میں کوئی ایسی چیز بھی ہونی چاہیے جو تمام منکرات سے نفرت کرنے والی ہو۔ شارع حکیم نے اس چیز کی نشاندہی کر دی ہے۔ وہ اس کو ''حیا'' سے تعبیر کرتا ہے۔

حیا کے معنی شرم کے ہیں۔ اسلام کی مخصوص اصطلاح میں حیا سے مراد وہ ''شرم'' ہے جو کسی امرِ منکر کی طرف مائل ہونے والا انسان خود اپنی فطرت کے سامنے اور اپنے خدا کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ یہی حیا وہ قوت ہے جو انسان کو فحشاء اور منکر کا اقدام کرنے سے روکتی ہے۔ اور اگر وہ جبلّتِ حیوانی کے غلبہ سے کوئی برا فعل کر گزرتا ہے، تو یہی چیز اس کے دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم و تربیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ حیا کے اسی چھپے ہوئے مادّے کو فطرتِ انسانی کی گہرائیوں سے نکال کر علم و فہم اور شعور کی غذا سے اس کی پرورش کرتی ہے اور ایک مضبوط حاسّۂ اخلاقی بنا کر اس کو نفسِ انسانی میں ایک کوتوال کی حیثیت سے متعیّن کر دیتی ہے۔ یہ ٹھیک ٹھیک اسی حدیثِ نبوی کی تفسیر ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ لکل دین خُلقٌ و خُلقُ الاسلام الحیاء ''ہر دین کا ایک اخلاق ہوتا ہے اور اسلام کا اخلاق حیاء ہے۔'' اور وہ حدیث بھی اسی مضمون پر روشنی ڈالتی ہے جس میں سرکارِ رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ اذا لم تستحی فاصنع ماشئت ''جب تجھ میں حیاء نہیں تو جو تیرا جی چاہے کر۔'' کیوں کہ جب حیاء نہ ہوگی تو خواہش جس کا مبدا جبلّتِ حیوانی ہے، تجھ پر غالب آ جائے گی، اور کوئی منکر تیرے لیے منکر ہی نہ رہے گا۔

انسان کی فطری حیاء ایک ایسے اَن گھڑ مادّے کی حیثیت رکھتی ہے جس نے ابھی کوئی صورت اختیار نہ کی ہو۔ وہ تمام منکرات سے بالطبع نفرت تو کرتی ہے مگر اس میں سمجھ بوجھ نہیں ہے۔ اس وجہ سے وہ نہیں جانتی کہ کسی خاص فعلِ منکر سے اس کو کس لیے نفرت ہے۔ یہی نادانستگی رفتہ رفتہ اس کے احساسِ نفرت کو کمزور کر دیتی ہے، حتیٰ کہ حیوانیت کے غلبہ سے انسان منکرات کا ارتکاب کرنے لگتا ہے اور اس ارتکاب کی پیہم تکرار آخرکار حیاء کے احساس کو بالکل باطل کر دیتی ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم کا مقصد اسی نادانی کو دور کرنا ہے۔ وہ اس کو نہ صرف کھلے ہوئے منکرات سے روشناس کراتی ہے، بلکہ نفس کے چور خانوں تک میں نیتوں اور ارادوں اور خواہشوں

کی جو برائیاں چھپی ہوئی ہیں اُن کو بھی اس کے سامنے نمایاں کر دیتی ہے، اور ایک ایک چیز کے مفسدوں سے اس کو خبردار کرتی ہے، تاکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس سے نفرت کرے، پھر اخلاقی تربیت اس تعلیم یافتہ شرم وحیاء کو اس قدر حسّاس بنادیتی ہے کہ منکر کی جانب ادنیٰ سے ادنیٰ میلان بھی اس سے مخفی نہیں رہتا، اور نیت وخیال کی ذراسی لغزش کو بھی وہ تنبیہ کیے بغیر نہیں چھوڑتی۔

اسلامی اخلاقیات میں حیاء کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس سے چھوٹا ہوا نہیں ہے۔ چنانچہ تمدّن و معاشرت کا جو شعبہ انسان کی صنفی زندگی سے تعلّق رکھتا ہے اس میں بھی اسلام نے اصلاحِ اخلاق کے لیے اسی چیز سے کام لیا ہے۔ وہ صنفی معاملات میں نفسِ انسانی کی نازک سے نازک چوریوں کو پکڑ کر حیاء کو ان سے خبردار کرتا ہے اور ان کی نگرانی پر مامور کر دیتا ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں، اس لیے ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

دل کے چور

قانون کی نظر میں زنا کا اطلاق صرف جسمانی اتصال پر ہوتا ہے۔ مگر اخلاق کی نظر میں دائرۂ ازدواج کے باہر صنفِ مقابل کی جانب ہر میلان، ارادے اور نیت کے اعتبار سے زنا ہے۔ اجنبی کے حُسن کے آنکھ کا لطف لینا، اس کے آواز سے کانوں کا لذّت یاب ہونا، اس سے گفتگو کرنے میں زبان کا لوچ کھانا، اس کے کوچے کی خاک چھاننے کے لیے قدموں کا بار بار اٹھنا، یہ سب زنا کے مقدّمات اور خود معنوی حیثیت سے زنا ہیں۔ قانون اس زنا کو نہیں پکڑ سکتا۔ یہ دل کا چور ہے اور صرف دل ہی کا کوتوال اس کو گرفتار کرسکتا ہے۔ حدیثِ نبوی اس کی مخبری اس طرح کرتی ہے:

العینان تزنیان و زناھما النظر والیدان تزنیان و زناھما البطش والرِجلان تزنیان و زناھما المشی و زنااللسان النطق والنفس تتمنی و تشتھی و الفرج یصدق ذالک کله اَوُ یکذبه.

آنکھیں زنا کرتی ہیں اور اُن کی زنا نظر ہے اور ہاتھ زنا کرتے ہیں اور اُن کی زنا

دست درازی ہے اور پاؤں زنا کرتے ہیں اور اُن کی زنا اس راہ میں چلنا ہے، اور زبان کی زنا گفتگو ہے اور دل کی زنا تمنا اور خواہش ہے، آخر میں صنفی اعضا یا تو ان سب کی تصدیق کر دیتے ہیں یا تکذیب۔

فتنۂ نظر

نفس کا سب سے بڑا چور نگاہ ہے، اس لیے قرآن اور حدیث دونوں سب سے پہلے اس کی گرفت کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (النور: ۳۰، ۳۱)

اے نبی مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نگاہوں کو (غیر عورتوں کی دید سے) باز رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے اللہ باخبر ہے۔ اور اے نبی مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ اپنی نگاہوں کو (غیر مردوں کی دید سے) باز رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔

حدیث میں ہے:

ابن ادم لک اول نظرة وایا و الثانیة (الحصاص)

آدمی زادے! تیری پہلی نظر تو معاف ہے مگر خبردار! دوسری نظر نہ ڈالنا۔

حضرت علیؓ سے فرمایا:

یاعلی لا تتبع النظرة النظرة فان لک الاولٰی ولیس لک الأخرة. (ابو دائود، باب مایؤمربه من غض البصر)

اے علیؓ! ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالو۔ پہلی نظر تو معاف ہے مگر دوسری نہیں۔

حضرت جابرؓ نے پوچھا کہ اچانک نظر پڑ جائے تو کیاں کروں۔ فرمایا فوراً نظر پھیر لو۔

(ابو دائود، باب مذکور)

جذبۂ نمایشِ حُسن

اسی فتنۂ نظر کا ایک شاخسانہ وہ بھی ہے جو عورت کے دل میں یہ خواہش پیدا کرتا ہے کہ اُس کا حسن دیکھا جائے۔ یہ خواہش ہمیشہ جلی اور نمایاں ہی نہیں ہوتی۔ دل کے پردوں میں کہیں نہ کہیں نمایشِ حسن کا جذبہ چھپا ہوا ہوتا ہے اور وہی لباس کی زینت میں، بالوں کی آرائش میں، باریک اور شوخ کپڑوں کے انتخاب میں اور ایسے ایسے خفیف جزئیات تک میں اپنا اثر ظاہر کرتا ہے جن کا احاطہ ممکن نہیں۔ قرآن نے ان سب کے لیے ایک جامع اصطلاح ''تبرُّجِ جاہلیہ'' استعمال کی ہے۔ ہر وہ زینت اور ہر وہ آرایش جس کا مقصد شوہر کے سوا دوسروں کے لیے لذّتِ نظر بننا ہو، تبرُّجِ جاہلیت کی تعریف میں آجاتی ہے۔ اگر برقع بھی اس غرض کے لیے خوبصورت اور خوش رنگ انتخاب کیا جائے کہ نگاہیں اس سے لذّت یاب ہوں تو یہ بھی تبرُّجِ جاہلیت ہے۔ اس کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کا تعلق عورت کے اپنے ضمیر سے ہے۔ اس کو خود ہی اپنے دل کا حساب لینا چاہیے کہ کہیں یہ ناپاک جذبہ تو چھپا ہوا نہیں ہے۔ اگر ہے تو وہ اس حکمِ خداوندی کی مخاطب ہے کہ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ[1] (الاحزاب:۳۳) جو آرائش ہر بری نیت سے پاک ہو، وہ اسلام کی آرائش ہے۔ اور جس میں ذرّہ برابر بھی بری نیت شامل ہو وہ جاہلیت کی آرائش ہے۔

فتنۂ زبان

شیطانِ نفس کا ایک دوسرا ایجنٹ زبان ہے۔ کتنے ہی فتنے ہیں جو زبان کے ذریعے سے پیدا ہوتے اور پھیلتے ہیں۔ مرد اور عورت بات کر رہے ہیں، کوئی برا جذبہ نمایاں نہیں ہے۔ مگر دل کا چھپا ہوا چور آواز میں حلاوت، لہجے میں لگاوٹ، باتوں میں گھلاوٹ پیدا کیے جا رہا ہے۔ قرآن اس چور کو پکڑ لیتا ہے:

اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِىْ فِىْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًاۚ (الاحزاب: ۳۲)

---

(۱) ''اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بناؤ سنگار کی نمائش تم کرتی پھرتی تھیں، وہ اب نہ کرو۔''

اگر تمہارے دل میں خدا کا خوف ہے تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ جس شخص کے دل میں (بدنیتی) کی بیماری ہو وہ تم سے کچھ امیدیں وابستہ کرے گا۔ بات کرو تو سیدھے سادھے طریقہ سے کرو (جس طرح انسان انسان سے بات کیا کرتا ہے)۔

یہی دل کا چور ہے جو دوسروں کے جائز یا ناجائز صنفی تعلقات کا حال بیان کرنے میں بھی مزے لیتا ہے اور سننے میں بھی۔ اسی لطف کی خاطر عاشقانہ غزلیں کہی جاتی ہیں اور عشق و محبت کے افسانے جھوٹ سچ ملا کر جگہ جگہ بیان کیے جاتے ہیں اور سوسائٹی میں ان کی اشاعت اس طرح ہوتی ہے جیسے پولے پولے آنچ لگتی چلی جائے۔ قرآن اس پر بھی تنبیہہ کرتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ (النور: ۱۹)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے گروہ میں بے حیائی کی اشاعت ہو اُن کے لیے دنیا میں بھی دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی۔

فتنۂ زبان کے اور بھی بہت سے شعبے ہیں اور ہر شعبے میں دل کا ایک نہ ایک چور اپنا کام کرتا ہے۔ اسلام نے ان سب کا سراغ لگایا ہے اور ان سے خبردار کیا ہے۔ عورت کو اجازت نہیں کہ اپنے شوہر سے دوسری عورتوں کی کیفیت بیان کرے۔

لاتباشر المرأۃ حتیٰ تصفھا لزوجھا کانه ینظر الیھا.

(ترمذی، باب ماجاء فی مباشرۃ المراءۃ بالمراءۃ)

عورت عورت سے خلاملا نہ کرے، ایسا نہ ہو کہ وہ اس کی کیفیت اپنے شوہر سے اس طرح بیان کرے کہ گویا وہ خود اس کو دیکھ رہا ہے۔

عورت اور مرد دونوں کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ اپنے پوشیدہ ازدواجی معاملات کا حال دوسرے لوگوں کے سامنے بیان کریں، کیوں کہ اس سے بھی فحش کی اشاعت ہوتی ہے اور دلوں میں شوق پیدا ہوتا ہے۔ (ابو دائود، باب من ذکر الرجل مایکون من اصابة اھله)

نماز باجماعت میں اگر امام غلطی کرے، یا اس کو کسی حادثہ پر متنبہ کرنا ہو تو مردوں کو سبحان اللہ کہنے کا حکم ہے، مگر عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ صرف دستک دیں۔ زبان سے کچھ نہ بولیں۔ (ابو دائود، باب التصفیق فی الصلوۃ۔ بخاری، باب التصفیق للنساء)

فتنۂ آواز

بسا اوقات زبان خاموش رہتی ہے۔ مگر دوسری حرکات سے سامعہ کو متأثر کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق بھی نیت کی خرابی سے ہے اور اسلام اس کی ممانعت کرتا ہے:

وَلاَ یَضۡرِبۡنَ بِاَرۡجُلِهِنَّ لِیُعۡلَمَ مَایُخۡفِیۡنَ مِنۡ زِیۡنَتِهِنَّ ط (النور: ۳۱)

اور وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلیں کہ جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے (یعنی جو زیور وہ اندر پہنے ہوئے ہیں) اس کا حال معلوم ہو (یعنی جھنکار سنائی دے)۔

فتنۂ خوشبو

خوشبو بھی اُن قاصدوں میں سے ایک ہے جو ایک نفسِ شریر کا پیغام دوسرے نفسِ شریر تک پہنچاتے ہیں۔ یہ خبر رسانی کا سب سے زیادہ لطیف ذریعہ ہے جس کو دوسرے تو خفیف ہی سمجھتے ہیں، مگر اسلامی حیا اتنی حسّاس ہے کہ اس کی طبعِ نازک پر یہ لطیف تحریک بھی گراں ہے۔ وہ ایک مسلمان عورت کو اس کی اجازت نہیں دیتی کہ خوشبو میں بسے ہوئے کپڑے پہن کر راستوں سے گزرے یا محفلوں میں شرکت کرے، کیوں کہ اس کا حسن اور اس کی زینت پوشیدہ بھی رہی تو کیا فائدہ ہوا، اس کی عطریات تو فضا میں پھیل کر جذبات کو متحرک کر رہی ہیں:

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم المرأة اذا استعطرت فمرت بالمجلس فھی کذا یعنی زانیة. (باب ماجاء فی کراھة خروج المتعطق، ترمذی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو عورت عطر لگا کر لوگوں کے درمیان سے گزرتی ہے وہ آوارہ قسم کی عورت ہے۔

اذاشھدت احد اکن المساجد فلاتمسن طیبًا. (مؤطا و مسلم)

جب تم میں سے کوئی عورت مسجد میں جائے تو خوشبو نہ لگائے۔

طیب الرجال ما ظھر ریحه وخفی لونه و طیب النساء ماظھر لونه و خفی ریحهٗ.(۱)

---

(۱) ترمزی، باب ماجاء فی طیب الرجال و النساء۔ ابو دائود، مایکرہ من ذکر الرجل مایکون من اصابة اھله

مردوں کے لیے وہ عطر مناسب ہے جس کی خوشبو نمایاں اور رنگ مخفی ہو، اور عورتوں کے لیے وہ عطر مناسب ہے جس کا رنگ نمایاں اور خوشبو مخفی ہو۔

فتنۂ عُریانی

ستر کے باب میں اسلام نے انسانی شرم وحیا کی جس قدر صحیح اور مکمل نفسیاتی تعبیر کی ہے، اس کا جواب دنیا کی کسی تہذیب میں نہیں پایا جاتا۔ آج دنیا کی مہذب ترین قوموں کا بھی یہ حال ہے کہ ان کے مردوں اور ان کی عورتوں کو اپنے جسم کا کوئی حصہ کھول دینے میں باک نہیں ہے۔ ان کے ہاں لباس محض زینت کے لیے ہے، ستر کے لیے نہیں ہے۔ مگر اسلام کی نگاہ میں زینت سے زیادہ ستر کی اہمیت ہے۔ وہ عورت اور مرد دونوں کو جسم کے وہ تمام حصّے چھپانے کا حکم دیتا ہے، جن میں ایک دوسرے کے لیے صنفی کشش پائی جاتی ہے۔ عریانی ایک ایسی ناشائستگی ہے جس کو اسلامی حیا کسی حال میں بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ غیر تو غیر اسلام اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ میاں اور بیوی ایک دوسرے کے سامنے برہنہ ہوں:

اذا اتیٰ احدکم اھلہ فلیستتر و لا یتجرد العیرین.

(ابن ماجہ، باب التستر عند الجماع)

جب تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس جائے تو اس کو چاہیے کہ ستر کا لحاظ رکھے بالکل گدھوں کی طرح دونوں ننگے نہ ہو جائیں۔

قالت عائشۃ مانظرت الیٰ فرج رسول اللہ ﷺ.

(شمائل ترمذی، باب ماجاء فی حیاء رسول اللہؐ)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی برہنہ نہیں دیکھا۔

اس سے بڑھ کر شرم وحیا یہ ہے کہ تنہائی میں بھی عریاں رہنا اسلام کو گوارا نہیں اس لیے کہ اللہ احق ان یستحیی منہ۔ ''اللہ اس کا زیادہ حق والا ہے کہ اس سے حیا کی جائے۔''

(ترمذی، باب حِفظِ العورۃ)

حدیث میں آتا ہے کہ:

ایاکم والتعری فان معکم من لایفارقکم الاعند الغائط و حین یفضی الرجل اِلی اھلہ فاستحیوھم واکرموھم.

(ترمذی، باب ماجاء فی الاستتار عندالجماع)

خبردار کبھی برہنہ نہ رہو کیوں کہ تمہارے ساتھ خدا کے فرشتے لگے ہوئے ہیں جو تم سے جدا نہیں ہوتے بجز ان اوقات کے جن میں تم رفعِ حاجت کرتے ہو یا اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہو لہٰذا تم اُن سے شرم کرو اور اُن کی عزت کا لحاظ رکھو۔

اسلام کی نگاہ میں وہ لباس درحقیقت لباس ہی نہیں جس میں بدن جھلکے اور ستر نمایاں ہو:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نساء کاسیات عاریات ممیلات مائلات رؤسھن کالبخت المائلة لایدخلن الجنة ولایجدن ریحھا. (مسلم، باب النساء الکاسیات العاریات)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو عورتیں کپڑے پہن کر بھی ننگی ہی رہیں اور دوسروں کو رجھائیں اور خود دوسروں پر ریجھیں اور بختی اونٹ کی طرح ناز سے گردن ٹیڑھی کر کے چلیں وہ جنت میں ہرگز داخل نہ ہوں گی اور نہ اس کی بُو پائیں گی۔

یہاں استیعاب مقصود نہیں۔ ہم نے صرف چند مثالیں اس غرض سے پیش کی ہیں کہ ان سے اسلام کے معیارِ اخلاق اور اس کی اخلاقی اسپرٹ کا اندازہ ہو جائے۔ اسلام سوسائٹی کے ماحول اور اس کی فضا کو فحشاء ومنکر کی تمام تحریکات سے پاک کر دینا چاہتا ہے۔ ان تحریکات کا سرچشمہ انسان کے باطن میں ہے۔ فحشا ومنکر کے جراثیم وہیں پرورش پاتے ہیں، اور وہیں سے اُن چھوٹی چھوٹی تحریکات کی ابتدا ہوتی ہے۔ جو آگے چل کر فساد کی موجب بنتی ہے۔ جاہل انسان ان کو خفیف سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے، مگر حکیم کی نگاہ میں دراصل وہی اخلاق اور تمدّن ومعاشرت کو تباہ کر دینے والی خطرناک بیماریوں کی جڑ ہیں۔ لہٰذا اسلام کی تعلیمِ اخلاق باطن ہی میں حیا کا اتنا زبردست احساس پیدا کر دینا چاہتی ہے کہ انسان خود اپنے نفس کا احتساب کرتا رہے، اور برائی کی جانب ادنیٰ سے ادنیٰ میلان بھی اگر پایا جائے تو اس کو محسوس کر کے وہ آپ ہی اپنی قوتِ ارادی سے اس کا استیصال کر دے۔

تعزیری قانون

اسلام کی تعزیری قانون کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان کو سیاست کے شکنجہ میں اس وقت تک نہ کسا جائے جب تک وہ نظامِ تمدّن کو برباد کرنے والی کسی حرکت کا بالفعل مرتکب نہ ہو جائے۔ مگر جب وہ ایسا کر گزرے تو پھر اس کو خفیف سزائیں دے دے کر گناہ کرنے اور سزا بھگتنے کا خوگر بنانا درست نہیں ہے۔ ثبوتِ جرم کی شرائط بہت سخت رکھو۔[۱] لوگوں کو حدودِ قانون کی زد میں آنے سے جہاں تک ممکن ہو بچاؤ،[۲] مگر جب کوئی شخص قانون کی زد میں آ جائے تو اسے ایسی سخت سزا دو کہ نہ صرف وہ خود اس جرم کے اعادہ سے عاجز ہو جائے، بلکہ دوسرے ہزاروں انسان بھی جو اس فعل کی جانب اقدام کرنے والے ہوں اس عبرتناک سزا کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جائیں، کیوں کہ قانون کا مقصد سوسائٹی کو جرائم سے پاک کرنا ہے نہ یہ کہ لوگ بار بار جرم کریں اور بار بار سزا بھگتیں۔

نظامِ معاشرت کی حفاظت کے لیے اسلامی تعزیرات نے جن افعال کو جرمِ مستلزمِ سزا قرار دیا ہے وہ صرف دو ہیں: ایک زنا، دوسرے قذف (یعنی زنا کی تہمت لگانا)۔

حدِّ زنا

زنا کے متعلق ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اخلاقی حیثیت سے یہ فعل انسان کی انتہائی پستی کا نتیجہ ہے۔ جو شخص اس کا ارتکاب کرتا ہے وہ دراصل اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کی انسانیت حیوانیت سے مغلوب ہو چکی ہے۔ اور وہ انسانی سوسائٹی کا ایک صالح رکن بن کر نہیں رہ سکتا۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے یہ ان عظیم ترین جرائم میں سے ایک ہے جو انسانی تمدّن کی عین بنیاد پر

---

(۱) اسلامی قانونِ شہادت میں ثبوتِ جرم کی شرائط عموماً نہایت سخت ہیں۔ مگر جرمِ زنا کی ثبوت کی شرطیں سب سے زیادہ سخت رکھی گئی ہیں۔ عام طور پر تمام معاملات کے لیے اسلامی قانون صرف دو گواہوں کو کافی سمجھتا ہے مگر زنا کے لیے کم از کم چار گواہ ضروری قرار دیے گئے ہیں۔

(۲) نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ادرؤا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان له مخرج فخلوا سبیله فان الامام یخطیٔ فی العفو خیر من ان یخطیٔ فی العقوبة (ترمذی، ابواب الحدود) مسلمانوں کو سزا سے بچاؤ، جہاں تک ممکن ہو۔ اگر مجرم کے لیے براءت کی کوئی صورت ہو تو اسے چھوڑ دو۔ کیوں کہ امام کا معاف کرنے میں غلطی کرنا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کرے۔

حملہ کرتے ہیں۔ ان وجوہ سے اسلام نے اس کو بجائے خود ایک قابلِ تعزیر گناہ قرار دیا ہے، خواہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا جرم مثلاً جبر واکراہ یا کسی شخصِ غیر کی حق تلفی شریک ہو یا نہ ہو، قرآن مجید کا حکم یہ ہے کہ:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِىْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (النور: ۲)

زنا کار عورت اور زنا کار مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور قانونِ الٰہی کے معاملہ میں تم کو ان پر ہرگز رحم نہ کھانا چاہیے اگر تم اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ اور جب ان کو سزا دی جائے تو مسلمانوں میں سے ایک جماعت ان کو دیکھنے کے لیے حاضر رہے۔

اس باب میں اسلامی قانون اور مغربی قانون میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ مغربی قانون زنا کو بجائے خود کوئی جرم نہیں سمجھتا۔ اس کی نگاہ میں یہ فعل صرف اس وقت جرم ہوتا ہے جب کہ اس کا ارتکاب جبر واکراہ کے ساتھ کیا جائے یا کسی ایسی عورت کے ساتھ کیا جائے جو دوسرے شخص کے نکاح میں ہو۔ بالفاظِ دیگر اس قانون کے نزدیک زنا خود جرم نہیں ہے بلکہ جرم دراصل جبر یا حق تلفی ہے۔ بخلاف اس کے اسلامی قانون کی نظر میں یہ فعل خود ایک جرم ہے اور جبر واکراہ یا حقِ غیر میں مداخلت سے اس پر ایک اور جرم کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس بنیادی اختلاف کی وجہ سے سزا کے باب میں بھی دونوں کے طریقے مختلف ہو جاتے ہیں۔ مغربی قانون زنا بالجبر میں صرف سزائے قید پر اکتفا کرتا ہے اور منکوحہ عورت کے ساتھ زنا کرنے پر عورت کے شوہر کو صرف تاوان کا مستحق قرار دیتا ہے۔ یہ سزا جرم کو روکنے والی نہیں بلکہ لوگوں کو اور جرأت دلانے والی ہے۔ اسی لیے ان ممالک میں جہاں یہ قانون رائج ہے زنا کا ارتکاب بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی قانون زنا پر ایسی سخت سزا دیتا ہے جو سوسائٹی کو اس جرم اور ایسے مجرموں سے ایک مدّت کے لیے پاک کر دیتی ہے۔ جن ممالک میں زنا پر یہ سزا دی گئی ہے وہاں اس فعل کا ارتکاب کبھی عام نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ حدِّ شرعی جاری ہو جائے، پھر پورے ملک کی آبادی پر ایسی ہیبت چھا جاتی ہے کہ برسوں تک کوئی شخص اس کے ارتکاب کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہ مجرمانہ

میلانات رکھنے والوں کے ذہن پر ایک طرح کا نفسیاتی آپریشن ہے جس سے ان کے نفس کی خود بہ خود اصلاح ہو جاتی ہے۔

مغربی ضمیر سوکوڑوں کی سزا پر نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ انسان کو جسمانی تکلیف پہنچانا پسند نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے اخلاقی شعور کا نشوونما ابھی تک ناقص ہے۔ وہ زنا کو پہلے صرف ایک عیب سمجھتا تھا اور اب اسے محض ایک کھیل، ایک تفریح سمجھتا ہے جس سے دو انسان تھوڑی دیر کے لیے اپنا دل بہلا لیتے ہیں۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ قانون اس فعل سے رواداری برتے اور اس وقت تک کوئی باز پرس نہ کرے جب تک کہ زانی دوسرے شخص کی آزادی یا اس کے قانونی حقوق میں خلل انداز نہ ہو۔ پھر اس میں خلل اندازی کی صورت میں بھی وہ اس کو ایسا جرم سمجھتا ہے جس سے بس ایک ہی شخص کے حقوق متاثر ہوتے ہیں، اس لیے معمولی سزا یا تاوان اس کے نزدیک ایسے جرم کی کافی سزا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو شخص زنا کا یہ تصوّر رکھتا ہو وہ اس فعل پر سوکوڑوں کی سزا کو ایک ظالمانہ سزا ہی سمجھے گا۔ مگر جب اس کا اخلاقی و اجتماعی شعور ترقی کرے گا اور اس کو معلوم ہوگا کہ زنا خواہ بالرضا ہو یا بالجبر، اور خواہ بیاہی ہوئی عورت کے ساتھ ہو یا بن بیاہی کے ساتھ، بہر حال وہ ایک اجتماعی جرم ہے، اور پوری سوسائٹی پر اس کے نقصانات عائد ہوتے ہیں۔ تو سزا کے متعلق بھی اس کا نظریہ خود بہ خود بدل جائے گا۔ اُسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ سوسائٹی کو ان نقصانات سے بچانا ضروری ہے اور چوں کہ زنا کی تحریک کرنے والے اسباب انسان کی حیوانی جبلّت میں نہایت گہری جڑیں رکھتے ہیں، اور ان جڑوں کو محض قید و بند اور مالی تاوان کے زور سے نہیں اکھاڑا جا سکتا، لہٰذا اس کا سدِّ باب کرنے کے لیے شدید تدابیر استعمال کیے بغیر چارہ نہیں۔ ایک شخص یا دو شخصوں کو شدید جسمانی آزار پہنچا کر لاکھوں اشخاص کو بے شمار اخلاقی اور عمرانی مضرتوں سے بچا دینا اس سے بہتر ہے کہ مجرموں کو تکلیف سے بچا کر ان کی پوری قوم کو ایسے نقصانات میں مبتلا کیا جائے جو آنے والی بے گناہ نسلوں تک بھی متوارث ہونے والے ہوں۔

سوکوڑوں کی سزا کو ظالمانہ سزا قرار دینے کی ایک وجہ اور بھی ہے جو مغربی تہذیب کی بنیادوں پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اس

تہذیب کی ابتدا ہی جماعت کے مقابلے میں فرد کی حمایت کے جذبے سے ہوئی ہے اور اس کا سارا خمیر انفرادی حقوق کے ایک مبالغہ آمیز تصور سے تیار ہوا ہے۔ اس لیے فرد خواہ جماعت پر کتنا ہی ظلم کرے اہلِ مغرب کو کچھ زیادہ ناگوار نہیں ہوتا، بلکہ اکثر حالات میں وہ اُسے بہ خوشی گوارا کر لیتے ہیں۔ البتہ جماعتی حقوق کی حفاظت کے لیے جب فرد پر ہاتھ ڈالا جاتا ہے تو ان کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں اور ان کی ساری ہمدردیاں جماعت کے بجائے فرد کے ساتھ ہوتی ہیں۔ علاوہ بریں تمام اہلِ جاہلیت کی طرح جاہلیتِ مغرب کے پیرووں کی بھی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معقولات کے بجائے محسوسات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جو نقصان ایک فرد پر مترتّب ہوتا ہے وہ چوں کہ محدود شکل میں محسوس طور پر ان کے سامنے آتا ہے اس لیے وہ اُسے ایک امرِ عظیم سمجھتے ہیں۔ بہ خلاف اس کے وہ اس نقصان کی اہمیت کا ادراک نہیں کر سکتے جو وسیع پیمانہ پر تمام سوسائٹی اور اس کی آیندہ نسلوں کو پہنچتا ہے، کیوں کہ وہ اپنی وسعت اور دور رسی کی بنا پر محسوس نہیں ہوتا۔

حدِّ قذف

زنا کے جو نقصانات ہیں، انہی سے ملتے جلتے نقصانات تہمتِ زنا (قذف) کے بھی ہیں۔ کسی شریف عورت پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانا تنہا اسی ایک کے لیے بدنامی کا موجب نہیں بلکہ اس سے خاندانوں میں دشمنی پھیلتی ہے، انساب مشتبہ ہو جاتے ہیں، ازدواجی تعلقات میں خرابی واقع ہوتی ہے اور ایک شخص محض ایک مرتبہ زبان ہلا کر بیسیوں انسانوں کو برسوں کے لیے مبتلائے عذاب کر دیتا ہے۔ قرآن نے اس جرم کے لیے بھی سخت سزا تجویز کی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ (النور: ۴)

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں پھر چار گواہ اس کے ثبوت میں پیش نہ کریں ان کو اسّی کوڑے لگاؤ اور آیندہ کبھی اُن کی گواہی قبول نہ کرو۔ ایسے لوگ خود ہی بدکار ہیں۔

انسدادی تدابیر

اس طرح اسلام کا قانونِ فوجداری اپنی سیاسی طاقت سے ایک طرف تو بدکاری کو زبردستی روک دیتا ہے، اور دوسری طرح سوسائٹی کے شریف ارکان کو بدنیت لوگوں کی بدزبانی سے محفوظ کر دیتا ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم انسان کو اندر سے درست کرتی ہے تاکہ اس میں بدی اور گناہ کی طرف رجحان ہی پیدا نہ ہو اور اس کا تعزیری قانون اس کو باہر سے درست کرتا ہے تاکہ اخلاقی تربیت کے ناقص رہ جانے سے اگر اس قسم کے رجحانات پیدا ہو جائیں اور وہ قوت سے فعل میں آنے لگیں، تو ان کو بجبر روک دیا جائے۔ ان دونوں تدبیروں کے درمیان چند مزید تدبیریں اس غرض کے لیے اختیار کی گئی ہیں کہ اصلاحِ باطن کی اخلاقی تعلیم کے لیے مددگار ہوں۔ ان تدبیروں سے نظامِ معاشرت کو اس طرح درست کیا گیا ہے کہ اخلاقی تربیت کے نقائص سے جو کمزوریاں افرادِ جماعت میں باقی رہ جائیں ان کو ترقی کرنے اور قوت سے فعل میں آنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ سوسائٹی میں ایک ایسا ماحول پیدا ہو جائے جس میں برے میلانات کو نشو و نما دینے والی آب و ہوا مفقود ہو، ہیجان انگیز تحریکات ناپید ہوں، صنفی انتشار کے اسباب انتہائی حد تک کم ہو جائیں۔ اور ایسی تمام صورتوں کا سدِّ باب ہو جائے جن سے نظامِ تمدن میں برہمی پیدا ہونے کا امکان ہو۔

اب ہم تفصیل کے ساتھ ان تدبیروں میں سے ایک ایک کو بیان کرتے ہیں۔

لباس اور ستر کے احکام

احکامِ معاشرت کے سلسلہ میں اسلام کا پہلا کام یہ ہے کہ اس نے برہنگی کا استیصال کیا اور مردوں اور عورتوں کے لیے ستر کے حدود مقرر کر دیے۔ اس معاملے میں عربِ جاہلیت کا جو حال تھا، آج کل کی مہذب ترین قوموں کا حال اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے بے تکلّف ننگے ہو جاتے تھے۔(۱) غسل اور قضاء حاجت میں پردہ کرنا ان کے

(۱) حدیث میں آیا ہے کہ حضرت مسور بن مخرمہؓ ایک پتھر اٹھائے ہوئے لا رہے تھے۔ راستہ میں تہ بند کھل کر گر پڑا اور وہ اسی حال میں پتھر اٹھائے چلے آئے۔ آنحضرتؐ نے دیکھا تو فرمایا کہ جاؤ پہلے اپنا جسم ڈھانکو اور ننگے نہ پھرا کرو۔

(مسلم باب الاعتناء بحفظ العورۃ)

نزدیک غیر ضروری تھا۔ کعبہ کا طواف بالکل برہنہ ہو کر کیا جاتا تھا اور اسے ایک اچھی عبادت سمجھا جاتا تھا۔(۱) عورتیں تک طواف کے وقت برہنہ ہو جاتی تھیں۔(۲) ان کی عورتوں کا لباس ایسا تھا جس میں سینے کا کچھ حصہ کھلا رہتا تھا اور بازو، کمر اور پنڈلیوں کے بھی بعض حصّے کھل جاتے تھے۔(۳) بالکل یہی کیفیت آج یورپ، امریکہ اور جاپان کی بھی ہے اور مشرقی ممالک میں بھی کوئی دوسرا نظامِ معاشرت ایسا نہیں ہے جس میں کشف وستر کے حدود باقاعدہ مقرر کیے گئے ہوں۔

اسلام نے اس باب میں انسان کو پہلا سبق سکھایا۔ اس نے بتایا کہ:

يٰبَنِيٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا

(الاعراف: ۲۶)

اے اولادِ آدم اللہ نے تم پر لباس اسی لیے اتارا ہے کہ تمہارے جسموں کو ڈھانکے اور تمہارے لیے موجبِ زینت ہو۔

اس آیت کی رُو سے جسم ڈھانکنے کو ہر مرد و عورت کے لیے فرض کر دیا گیا۔ نبی ﷺ نے سخت احکام دیے کہ کوئی شخص کسی کے سامنے برہنہ نہ ہو:

ملعون من نظر الی سوأة اخيه. (احکام القرآن للجصاص)

ملعون ہے وہ جو اپنے بھائی کی ستر پر نظر ڈالے۔

لاينظر الرجل الى عورة الرجل ولا المرأة الى عورة المرأة. (مسلم، باب تحريم النظر الى العورات)

کوئی مرد کسی مرد کو اور کوئی عورت کسی عورت کو برہنہ نہ دیکھے۔

لان اخرّ من السماء فانقطع نصفين احب الى من ان انظر الیٰ عورة احد اوينظر اِلی عورتی. (المبسوط، كتاب الاستحسان)

خدا کی قسم! میں آسمان سے پھینکا جاؤں اور میرے دو ٹکڑے ہو جائیں یہ میرے لیے

---

(۱) ابن عباس، مجاہد، طاؤس اور زہری کی متفقہ روایت ہے کہ کعبہ کا طواف برہنگی کی حالت میں کیا جاتا تھا۔

(۲) مسلم کتاب التفسیر میں عرب کی یہ رسم بیان کی گئی ہے کہ ایک عورت برہنہ ہو کر طواف کرتی، پھر حاضرین سے کہتی کہ "کون مجھے کپڑا دیتا ہے کہ میں اس سے اپنا بدن ڈھانکوں۔" اس طرح مانگنے والی کو کپڑا دینا ایک ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا۔

(۳) تفسیر کبیر۔ آیہ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ۔

زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ میں کسی کے پوشیدہ مقام کو دیکھوں یا کوئی میرے پوشیدہ مقام کو دیکھے۔

ایّاکم والتعری فان معکم من لا یفارقکم الا عند الغائط وحین یفضی الرجل الی اھلہ. (ترمذی، باب ماجاء فی الاستتار)

خبردار کبھی، برہنہ نہ ہو۔ کیوں کہ تمہارے ساتھ وہ ہے جو تم سے کبھی جدا نہیں ہوتا۔ سوائے قضائے حاجت اور مباشرت کے وقت کے۔

اذا اتی احدکم اھلہ فلیستتر ولا یتجرد تجرد العیرین.

(ابن ماجہ، باب التستر عندالجماع)

جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جائے تو اس وقت بھی ستر ڈھانکے اور بالکل گدھوں کی طرح ننگا نہ ہو جائے۔

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ زکوٰۃ کے اونٹوں کے چراگاہ میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ان کا چرواہا جنگل میں ننگا لیٹا ہے۔ آپؐ نے اسی وقت اسے معزول کردیا اور فرمایا لا یعمل لنا من لا حیاء لہ ”جو شخص بے شرم ہے وہ ہمارے کسی کام کا نہیں۔“

مردوں کے لیے ستر کے حدود

ان احکام کے ساتھ عورتوں اور مردوں کے لیے جسم ڈھانکنے کے حدود بھی الگ الگ مقرر کیے گئے۔ اصطلاحِ شرعی میں جسم کے اس حصّے کو ستر کہتے ہیں جس کا ڈھانکنا فرض ہے۔ مردوں کے لیے ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصہ ”ستر“ قرار دیا گیا کہ اس کو نہ کسی کے سامنے کھولیں اور نہ کسی دوسرے شخص کے اس حصّہ پر نظر ڈالیں:

عن ابی ایوب الانصاری عن النبی ﷺ مافوق الرکبتین من العورۃ و اسفل من السرّۃ من العورۃ. (دارقطنی)

جو کچھ گھٹنے کے اوپر ہے وہ چھپانے کے لائق ہے اور جو کچھ ناف سے نیچے ہے وہ چھپانے کے لائق ہے۔

عورۃ الرجل مابین سرّتہٖ الی رکبتیہ. (مبسوط)

مرد کے لیے ناف سے گھٹنے تک کا حصّہ چھپانے کے لائق ہے۔

عن علیّ بن ابی طالب عنِ النبی ﷺ لاتبرز فخذک ولا تنظر الی فخذحی ولامیت. (تفسیر کبیر آیۃ قل للمومنین یغضوامن ابصارھم)

اپنی ران کوکسی کے سامنے نہ کھول اور نہ کسی زندہ شخص یا مردہ شخص کی ران پر نظر ڈال۔

یہ حکم عام ہے جس سے بیویوں کے سوااور کوئی مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

احفظ عورتک الا من زوجتک او ماملک یمینک.

(احکام القرآن للجصاص ج۳، ص:۳۷)

اپنے ستر کی حفاظت کرو بجز اپنی بیویوں کے اور ان لونڈیوں کے جو تمہارے تصرّف میں ہوں۔

عورتوں کے لیے ستر کے حدود

عورتوں کے لیے ستر کے حدود اس سے زیادہ وسیع رکھے گئے ہیں۔ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کے سوا تمام جسم کو تمام لوگوں سے چھپائیں۔ اس حکم میں باپ، بھائی اور تمام رشتہ دار مرد شامل ہیں اور شوہر کے سوا کوئی مرد اس سے مستثنیٰ نہیں ہے:

لایحل لا مرأۃ تؤمن باللّٰہ والیوم الاٰخر ان تخرج یدیھا الا الیٰ ھٰھنا و قبض نصف الذراع. (ابن جریر)

نبی ﷺ نے فرمایا کہ کسی عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہو، جائز نہیں کہ وہ اپنا ہاتھ اس سے زیادہ کھولے، یہ کہہ کر آپ نے اپنی کلائی کے نصف حصّہ پر ہاتھ رکھا۔

الجاریۃ اذا حاضت لم یصلح ان یریٰ منھا الاوجھھا ویدھا اِلی المفصل. (ابوداؤد)

جب عورت بالغ ہوجائے تو اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہ آنا چاہیے سوائے چہرے اور کلائی کے جوڑ تک ہاتھ کے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اپنے بھتیجے عبداللہ بن الطفیل کے سامنے زینت کے ساتھ آئی تو نبی ﷺ نے اس کو ناپسند کیا۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ یہ تو میرا بھتیجہ ہے۔ حضوؐر نے فرمایا:

اذا عرقت المرأة لم يحل لها ان تظهر اِلا وجهها والامادون هٰذا وقبض علے ذراع نفسه فترک بين قبضة و بين الكف مثل قبضة اخرىٰ. (ابن جرير)

جب عورت بالغ ہوجائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اپنے جسم میں سے کچھ ظاہر کرے سوائے چہرے کے اور سوائے اس کے۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنی کلائی پر اس طرح ہاتھ رکھا کہ آپ کی گرفت کے مقام اور ہتھیلی کے درمیان صرف ایک مٹھی بھر جگہ باقی تھی۔

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ جو آنحضرت ﷺ کی سالی تھیں، ایک مرتبہ آپ کے سامنے باریک لباس پہن کر حاضر ہوئیں، اس حال میں کہ جسم اندر سے جھلک رہا تھا۔ حضورؐ نے فوراً نظر پھیر لی اور فرمایا:

يااسماء ان المرأة اِذا بلغت المحيض لم يصلح ان يرىٰ منها الاهٰذا و هٰذا واشار الى وجههٖ و كفّهٖ. (تكمله فتح القدير)

اے اسماء جب عورت سنِ بلوغ کو پہنچ جائے تو درست نہیں کہ اس کے جسم میں سے کچھ دیکھا جائے بجز اس کے۔ اور اس کے۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنے چہرے اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ فرمایا۔

حفصہؓ بنت عبدالرحمٰن حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور وہ باریک دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھیں۔ حضرت عائشہؓ نے اس کو پھاڑ دیا اور ایک موٹی اوڑھنی ان پر ڈالی۔ (مؤطا امام مالك)

نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ لعن اللّٰه الكاسيات العاريات "اللہ کی لعنت ہے ان عورتوں پر جو لباس پہن کر بھی ننگی کی ننگی رہیں۔"

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ اپنی عورتوں کو ایسے کپڑے نہ پہناؤ جو جسم پر اس طرح چُست ہوں کہ سارے جسم کی ہیئت نمایاں ہوجائے۔ (المبسوط، كتاب الاستحسان)

ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چہرے اور ہاتھ کے سوا عورت کا پورا جسم ستر میں داخل ہے جس کو اپنے گھر میں اپنے قریب ترین عزیزوں سے بھی چھپانا اس پر واجب ہے۔ وہ شوہر کے سوا کسی کے سامنے اپنے ستر کو نہیں کھول سکتی، خواہ وہ اس کا باپ، بھائی، یا بھتیجہ ہی کیوں نہ ہو۔ حتیٰ کہ وہ ایسا باریک لباس بھی نہیں پہن سکتی جس میں ستر نمایاں ہوتا ہو۔

اس باب میں جتنے احکام ہیں وہ سب جوان عورت کے لیے ہیں۔ ستر کے احکام اس وقت سے عائد ہوتے ہیں جب سے عورت سنِ رشد کے قریب پہنچ جائے اور اس وقت تک نافذ رہتے ہیں جب تک اس میں صنفی کشش باقی رہے۔ اس عمر سے گزر جانے کے بعد ان میں تخفیف کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لاَ یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِیْنَةٍ ط وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ ط (النور: ۶۰)

اور بڑی بوڑھی عورتیں جو نکاح کی امید نہیں رکھتیں اگر اپنے دوپٹے اتار کر رکھا کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ اپنی زینت کی نمایش مقصود نہ ہو، اور اگر وہ احتیاط رکھیں تو ان کے لیے یہ بہتر ہے۔

یہاں تخفیف کی علّت صاف بیان کر دی گئی ہے۔ نکاح کی امید باقی نہ رہنے سے ایسی عمر مراد ہے جس میں صنفی خواہشات فنا ہو جاتی ہیں اور کوئی کشش بھی باقی نہیں رہتی۔ تاہم مزید احتیاط کے طور پر یہ شرط لگا دی گئی کہ زینت کی نمایش مقصود نہ ہو یعنی اگر صنفی خواہش کی ایک چنگاری بھی سینہ میں باقی ہو تو دوپٹہ وغیرہ اتار کر بیٹھنا درست نہیں۔ تخفیف صرف ان بوڑھیوں کے لیے ہے جن کی سن رسیدگی نے لباس کی قیود سے بے پروا کر دیا ہو اور جن کی طرف بجز احترام کی نظروں سے اور کسی قسم کی نظریں اٹھنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ ایسی عورتیں گھر میں بغیر دوپٹے اور اوڑھنی کے بھی رہ سکتی ہیں۔

استیذان

اس کے بعد دوسری حد یہ قائم کی گئی کہ گھر کے آدمیوں کو بلا اطلاع اچانک گھروں میں داخل ہونے سے منع کر دیا تاکہ عورتوں کو کسی ایسے حال میں نہ دیکھیں جس میں مردوں کو نہیں دیکھنا چاہیے:

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْکُمُ الْحُلُمَ فَلْیَسْتَاْذِنُوْا کَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ط (النور: ۵۹)

اور جب تمہارے لڑکے سنِ بلوغ کو پہنچ جائیں تو چاہیے کہ وہ اسی طرح اجازت لے کر گھر میں آئیں جس طرح ان کے بڑے ان سے پہلے اجازت لے کر آتے تھے۔

یہاں بھی علتِ حکم پر روشنی ڈال دی گئی ہے۔ استیذ ان کی حد اسی وقت شروع ہوتی ہے جب کہ صنفی احساس پیدا ہو جائے۔ اس سے پہلے اجازت مانگنا ضروری نہیں۔

اس کے ساتھ غیر لوگوں کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہوں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ؕ (النور:۲۷)

اے اہل ایمان! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ اہلِ خانہ سے پوچھ نہ لو اور جب داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو۔

اصل مقصد اندرونِ خانہ اور بیرونِ خانہ کے درمیان حد بندی کرنا ہے تا کہ اپنی خانگی زندگی میں عورتیں اور مرد اجنبیوں کی نظروں سے محفوظ رہیں۔ اہلِ عرب ابتدا میں اِن احکام کی علّت کو نہ سمجھ سکے، اس لیے بسا اوقات وہ گھر کے باہر سے گھروں میں جھانک لیتے تھے۔ ایک مرتبہ خود آنحضرت ﷺ کے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش آیا۔ آپؐ اپنے حجرے میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک شخص نے تابدان میں سے جھانکا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تو جھانک رہا ہے تو میں تیری آنکھ میں کوئی چیز چبھو دیتا۔ استیذ ان کا حکم تو نظروں سے بچانے ہی کے لیے دیا گیا ہے۔(۱)'' اس کے بعد آپؐ نے اعلان فرمایا: ''اگر کوئی شخص کسی کے گھر میں بلا اجازت دیکھے تو گھر والوں کو حق ہے کہ اس کی آنکھ پھوڑ دیں۔''(۲)

پھر اجنبی مردوں کو حکم دیا گیا کہ کسی دوسرے کے گھر سے کوئی چیز مانگنی ہو تو گھروں میں نہ چلے جائیں بلکہ باہر پردے کی اوٹ سے مانگیں:

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ (الاحزاب:۵۳)

اور جب تم عورتوں سے کوئی چیز مانگو تو پردے کی اوٹ سے مانگو۔ اس میں تمہارے دلوں کے لیے بھی زیادہ پاکیزگی ہے اور ان کے دلوں کے لیے بھی۔

یہاں بھی حد بندی کے مقصد پر ذَالِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ سے پوری روشنی

---

(۱) بخاری، باب الاستیذان من اجل البصر۔

(۲) مسلم، باب تحریم النظر فی بیت غیرہ۔

ڈال دی گئی ہے۔ عورتوں اور مردوں کو صنفی میلانات اور تحریکات سے بچانا ہی اصل مقصود ہے، اور یہ حد بندیاں اسی لیے کی جارہی ہیں کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان خلا ملا اور بے تکلّفی نہ ہونے پائے۔

یہ احکام صرف اجانب ہی کے لیے نہیں بلکہ گھر کے خدّام کے لیے بھی ہیں، چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ حضرت بلالؓ یا حضرت انسؓ نے سیّدہ فاطمہؓ سے آپؐ کے کسی بچّے کو مانگا تو آپ نے پردے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر دیا۔(۱) حالاں کہ یہ دونوں حضور نبی کریم ﷺ کے خدّامِ خاص تھے۔ اور آپؐ کے پاس گھر والوں کی طرح رہتے تھے۔

تخلیہ اور لمس کی ممانعت

تیسری حد بندی یہ کی گئی کہ شوہر کے سوا کوئی مرد کسی کے پاس نہ تخلیہ میں رہے اور نہ اس کے جسم کو مَس کرے، خواہ وہ قریب ترین عزیز ہی کیوں نہ ہو:

عن عقبة بن عامر ان رسول اللّٰه ﷺ قال ايّاكم والدخول على النساء فقال رجل من الانصار يا رسول اللّٰه افرأيت الحمو. قال الحمو الموت.(۲)

عقبہؓ بن عامر سے روایت ہے کہ حضوؐر نے فرمایا: خبردار عورتوں کے پاس تنہائی میں نہ جاؤ، انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا یارسولؐ اللہ! دیور اور جیٹھ کے متعلق کیا ارشاد ہے۔ فرمایا: وہ تو موت ہے۔

لاتلجوا على المغيبات فان الشيطان يجرى من احدكم مجرى الدم.(۳)

شوہروں کی غیر موجودگی میں عورتوں کے پاس نہ جاؤ، کیوں کہ شیطان تم میں سے کسی کے اندر خون کی طرح گردش کررہا ہے۔

---

(۱) فتح القدیر۔

(۲) ترمذی، باب ماجاء فی کراهة الدخول علی المغیبات، بخاری، باب لایخلون رجل بامراة الّاذومحرم۔ مسلمباب تحریم الخلوة بالاجنبیة۔

(۳) ترمذی، باب کراهیة الدخول علی المغیبات۔

عن عمرو بن عاص قال نهانا رسول اللهﷺ ان ندخل علے النساء بغير اذنِ ازواجهِن.[۱]

عمرؓو بن عاص کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ہم کو عورتوں کے پاس ان کے شوہروں کی اجازت کے بغیر جانے سے منع فرمایا۔

لايدخلن رجل بعد يومى هٰذا علٰى مغيبة الامعه رجل او اثنان. (مسلم، باب تحریم الخلوة بالاجنبية)

آج کے بعد کوئی شخص کسی عورت کے پاس اس کے شوہر کے غیاب میں نہ جائے، تاوقتیکہ اس کے ساتھ ایک دو آدمی اور نہ ہوں۔

ایسے ہی احکام لمس کے متعلق بھی ہیں:

قال النبیﷺ من مسّ كفّ امرأة ليس منها بسبيل وضع علٰى كفِهِ جمرة يوم القيٰمة. (تکملہ فتح القدیر)

حضورؐ نے فرمایا: جو شخص کسی ایسی عورت کا ہاتھ چھوئے گا جس کے ساتھ اس کا جائز تعلق نہ ہو، اس کی ہتھیلی پر قیامت کے روز انگارہ رکھا جائے گا۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ عورتوں سے صرف زبانی اقرار لے کر بیعت لیا کرتے تھے، ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہ لیتے تھے۔ آپؐ نے کبھی کسی ایسی عورت کے ہاتھ کو مَس نہیں کیا جو آپؐ کے نکاح میں نہ ہو۔[۲]

امیمہؓ بنت رقیقہ کا بیان ہے کہ میں چند عورتوں کے ساتھ حضورؐ سے بیعت کرنے حاضر ہوئی۔ آپؐ نے ہم سے اقرار لیا کہ شرک، چوری، زنا، بہتان تراشی وافترا پردازی اور نبی کی نافرمانی سے احتراز کرنا۔ جب اقرار ہو چکا تو ہم نے عرض کیا کہ تشریف لایئے تاکہ ہم آپ سے بیعت کریں۔ آپؐ نے فرمایا: میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا، صرف زبانی اقرار کافی ہے۔[۳]

یہ احکام بھی صرف جوان عورتوں کے لیے ہیں، سن رسیدہ عورتوں کے ساتھ خلوت میں

---

(۱) ترمذی، باب فی النهی عن الدخول علی النساء الّاباذن ازواجهن۔

(۲) بخاری، باب بیعة النساء۔ مسلم، باب کیفیة بیعة النساء۔

(۳) نسائی، باب بیعة النساء۔ ابن ماجه، باب بیعة النساء۔

بیٹھنا جائز ہے اور ان کو چھونا بھی ممنوع نہیں۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ کے متعلق منقول ہے کہ وہ ایک قبیلہ میں جاتے تھے جہاں انہوں نے دودھ پیا تھا۔ اور آپؓ اس قبیلہ کی بوڑھی عورتوں سے مصافحہ کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے متعلق یہ روایت ہے کہ وہ ایک بوڑھی عورت سے پاؤں اور سر دبوایا کرتے تھے۔ یہ امتیاز جو بوڑھی اور جوان عورتوں کے درمیان کیا گیا ہے، خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دراصل دونوں صنفوں کے درمیان ایسے اختلاط کو روکنا مقصود ہے جو فتنے کا سبب بن سکتا ہو۔

مَحرموں اور غیر محرموں کے درمیان فرق

یہ تو وہ احکام تھے جن میں شوہر کے سوا تمام مرد شامل ہیں، خواہ وہ محرم ہوں یا غیر محرم، عورت ان میں سے کسی کے سامنے اپنا سَتر یعنی چہرے اور ہاتھ کے سوا جسم کا کوئی حصّہ نہیں کھول سکتی۔ بالکل اسی طرح جس طرح مرد کسی کے سامنے اپنا ستر یعنی ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصّہ نہیں کھول سکتا۔ سب مردوں کو گھر میں اجازت لے کر داخل ہونا چاہیے، اور اُن میں سے کسی کا عورت کے پاس خلوت میں بیٹھنا یا اس کے جسم کو ہاتھ لگانا جائز نہیں۔(۱)

اس کے بعد محرموں اور غیر محرموں کے درمیان تفریق کی جاتی ہے۔ قرآن اور حدیث میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ آزادی اور بے تکلفی کے کون سے مدارج ایسے ہیں جو صرف محرم مردوں کے سامنے برتے جا سکتے ہیں۔ اور غیر محرم مردوں کے سامنے برتنے جائز نہیں ہیں۔ یہی چیز ہے جس کو عرف عام میں پردہ یا حجاب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

---

(۱) جسم کو ہاتھ لگانے کے معاملے میں محرموں اور غیر محرم مردوں کے درمیان کافی فرق ہے۔ بھائی اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ کر اسے سواری پر چڑھا یا اتار سکتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ بات کسی غیر مرد کے لیے نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ جب کبھی سفر سے واپس ہوتے تو حضرت فاطمہؓ کو گلے لگا کر سر کا بوسہ لیتے۔ اسی طرح حضرت ابو بکرؓ حضرت عائشہؓ کے سر کا بوسہ لیتے تھے۔

باب ۱۲ :

پردہ کے احکام

قرآن مجید کی جن آیات میں پردہ کے احکام بیان ہوئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ط ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ م بِمَا يَصْنَعُوْنَ ٥ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ص وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ص وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ط (النور: ۳۰، ۳۱)

اے نبی! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت وعفت کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزگی کا طریقہ ہے۔ یقیناً اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اور مومن عورتوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس زینت کے جو خود ظاہر ہو جائے اور وہ اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکّل مار لیا کریں۔ اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر ان لوگوں کے سامنے، شوہر، باپ، خسر، بیٹے، سوتیلے بیٹے، بھائی،

بھتیجے، بھانجے، اپنی عورتیں، اپنے غلام، وہ مرد خدمت گار جو عورتوں سے کچھ مطلب نہیں رکھتے، یا وہ لڑکے جو ابھی عورتوں کی پردہ کی باتوں سے آگاہ نہیں ہوئے ہیں (نیز ان کو حکم دو کہ) وہ چلتے وقت اپنے پاؤں زمین پر اس طرح نہ مارتی چلیں کہ جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہے (آواز کے ذریعے سے) اس کا اظہار ہو۔

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلاَ تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلاً مَّعْرُوْفًاۚ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلاَ تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی. (الاحزاب: ۳۲، ۳۳)

اے نبی کی بیبیو! تم کچھ عام عورتوں کی طرح تو ہو نہیں۔ اگر تمھیں پرہیز گاری منظور ہے تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ جس شخص کے دل میں کوئی خرابی ہے وہ تم سے کچھ توقعات وابستہ کر بیٹھے۔ بات سیدھی سادی طرح کرو اور اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو اور اگلے زمانۂ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلاَ بِیْبِهِنَّ ط ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلاَ یُؤْذَیْنَ ط (الاحزاب: ۵۹)

اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں۔ اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پہچانی جائیں گی اور ان کو ستایا نہ جائے گا۔

اِن آیات پر غور کیجیے۔ مردوں کو تو صرف اتنی تاکید کی گئی ہے کہ اپنی نگاہیں پست رکھیں اور فواحش سے اپنے اخلاق کی حفاظت کریں۔ مگر عورتوں کو مردوں کی طرح ان دونوں چیزوں کا حکم بھی دیا گیا ہے، اور پھر معاشرت اور برتاؤ کے بارے میں چند مزید ہدایتیں بھی دی گئی ہیں۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ان کے اخلاق کی حفاظت کے لیے صرف غضِ بَصر اور حفظِ فروج کی کوشش بھی کافی نہیں ہے بلکہ کچھ اور ضوابط کی بھی ضرورت ہے۔ اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ان مجمل ہدایات کو نبی ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ نے اسلامی معاشرت میں کس طرح نافذ کیا ہے، اور ان کے اقوال اور اعمال سے اِن ہدایات کی معنوی اور عملی تفصیلات پر کیا روشنی پڑتی ہے۔

غضِّ بصر

سب سے پہلا حکم جو مردوں کو اور عورتوں کو دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ غضِّ بصر کرو۔ عموماً اس لفظ کا ترجمہ ''نظریں نیچی رکھو'' یا ''نگاہیں پست رکھو'' کیا جاتا ہے۔ مگر اس سے پورا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ حکمِ الٰہی کا اصل مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگ ہر وقت نیچے ہی دیکھتے رہیں اور کبھی اوپر نظر ہی نہ اٹھائیں۔ مدّعا دراصل یہ ہے کہ اُس چیز سے پرہیز کرو جس کو حدیث میں آنکھوں کی زنا کہا گیا ہے۔ اجنبی عورتوں کے حُسن اور اُن کی زینت کی دید سے لذّت اندوز ہونا مردوں کے لیے اور اجنبی مردوں کو مطمحِ نظر بنانا عورتوں کے لیے فتنے کا موجب ہے۔ فساد کی ابتدا طبعاً و عادتاً یہیں سے ہوتی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اسی دروازے کو بند کیا گیا ہے اور یہی ''غضِّ بصر'' کی مراد ہے۔ اردو زبان میں ہم اس لفظ کا مفہوم ''نظر بچانے'' سے بخوبی ادا کر سکتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جب انسان آنکھیں کھول کر دنیا میں رہے گا تو سب ہی چیزوں پر اس کی نظر پڑے گی۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ کوئی مرد کسی عورت کو اور کوئی عورت کسی مرد کو کبھی دیکھے ہی نہیں۔ اس لیے شارع نے فرمایا کہ اچانک نظر پڑ جائے تو معاف ہے۔ البتہ جو چیز ممنوع ہے وہ یہ ہے کہ ایک نگاہ میں جہاں تم کو حسن محسوس ہو وہاں دوبارہ نظر دوڑاؤ اور اس کو گھورنے کی کوشش کرو۔

عن جریرؓ قال سألت رسول اللهﷺ عن نظر الفجاءة فقال اصرف بصرک. (ابو دائود، باب مایؤمربه من غض البصر)

حضرت جریرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہﷺ سے پوچھا کہ اچانک نظر پڑ جائے تو کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا کہ نظر پھیر لو۔

عن بریدةؓ قال قال رسول اللهﷺ لعلی یا علی لاتتبع النظرة النظرة فان لک الاولیٰ ولیس لک الأخرة. (حوالۂ مذکور)

حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: اے علی! ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالو۔ پہلی نظر تمہیں معاف ہے۔ مگر دوسری نظر کی اجازت نہیں۔

عن النبیﷺ انه قال من نظر الی محاسن امرأة اجنبیة عن شهوة صُبّ فی عینیه الأنُک یوم القیٰمة. (تکملۂ فتح القدیر)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی اجنبی عورت کے محاسن پر شہوت کی نظر ڈالے گا، قیامت کے روز اس کی آنکھوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔

مگر بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جن میں اجنبیہ کو دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے مثلاً: کوئی مریضہ کسی طبیب کے زیرِ علاج ہو، یا کوئی عورت کسی مقدمہ میں قاضی کے سامنے بحیثیت گواہ یا بحیثیت فریق پیش ہو، یا کسی آتش زدہ مقام میں کوئی عورت گھر گئی ہو، یا پانی میں ڈوب رہی ہو، یا اُس کی جان یا آبرو کسی خطرے میں مبتلا ہو، ایسی صورت میں چہرہ تو درکنار حسبِ ضرورت سَتر کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ جسم کو ہاتھ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ بلکہ ڈوبتی ہوئی یا جلتی ہوئی عورت کو گود میں اٹھا کر لانا بھی صرف جائز نہیں، فرض ہے۔ شارع کا حکم یہ ہے کہ ایسی صورتوں میں جہاں تک ممکن ہو اپنی نیت کو پاک رکھو۔ لیکن اقتضائے بشریّت سے اگر جذبات میں کوئی خفیف سی تحریک پیدا ہو جائے تب بھی کوئی گناہ نہیں۔ کیوں کہ ایسی نظر اور ایسے لمس کے لیے ضرورت داعی ہوئی ہے اور فطرت کے مقتضیات کو بالکل روک دینے پر انسان قادر نہیں ہے۔(۱)

اسی طرح اجنبی عورت کو نکاح کے لیے دیکھنا اور تفصیلی نظر کے ساتھ دیکھنا نہ صرف جائز ہے بلکہ احادیث میں اس کا حکم وارد ہوا ہے۔ اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غرض کے لیے عورت کو دیکھا ہے:

عن المغیرة ابن شعبةؓ انهٗ خطب امرأةً فقال النّبیّ صلی اللہ علیہ وسلم انظر الیها فانه احری ان یؤدم بینکما. (ترمذی، باب ماجاء فی النظر الی المخطوبة)

مغیرہؓ بن شعبہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا کہ اس کو دیکھ لو، کیوں کہ یہ تم دونوں کے درمیان محبت و اتفاق پیدا کرنے کے لیے مناسب تر ہوگا۔

عن سهل بن سعدؓ ان امرأة جاءت الی رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم فقالت یا رسول اللّٰه جئت لاهب لک نفسی، فنظر الیها رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم فصعد النظر الیها. (بخاری، باب النظر الی المرأة قبل التزویج)

---

(۱) اس مضمون کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''تفسیر امام رازی'' آیۃ: قُل لِّلمُؤمِنِینَ یَغُضُّوا مِن اَبصَارِهِم۔ احکام القرآن للجصاص، تفسیر آیۂ مذکورہ۔ تکملۂ فتح القدیر، فصل فی الوطی والنظر واللمس المبسوط، کتاب الاستحسان۔

سہلؓ بن سعد سے روایت ہے کہ ایک عورت آنحضرت ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اور بولی کہ میں اپنے آپ کو حضور کے نکاح میں دینے کے لیے آئی ہوں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے نظر اٹھائی اور اس کو دیکھا۔

عن ابی هريرة قال كنت عند النبی ﷺ فاتاه رجل فاخبره انه تزوج امرأة من الانصار فقال لهٔ رسول الله ﷺ اَنظرتَ اليها؟ قال لا، قال فاذهب فانظر اليها فان فی اعين الانصار شيئاً. (مسلم، باب ندب مَن ارادنكاح المرأة الى ان ينظر الى وجهها)

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ میں نبی ﷺ کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے انصار میں سے ایک عورت کے ساتھ نکاح کا ارادہ کیا ہے۔ حضورؐ نے پوچھا کیا تو نے اسے دیکھا ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا، جا اور اس کو دیکھ لے، کیوں کہ انصار کی آنکھوں میں عموماً کچھ عیب ہوتا ہے۔

عن جابر بن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ اذا خطب احدكم المرأة فان استطاع ان ينظر الى ما يدعوه الى نكاحها فليفعل. (ابو دائود، باب فی الرجل ينظر الى المرأة وهويريد تزويجها)

جابرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو نکاح کا پیغام دے تو حتی الامکان اُسے دیکھ لینا چاہیے، ایا اس میں کوئی ایسی چیز ہے جو اس کو اس عورت کے ساتھ رغبت دلانے والی ہو۔

اس مستثنیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شارع کا مقصد دیکھنے کو کلیتہً روک دینا نہیں ہے بلکہ دراصل فتنے کا سدِّ باب مقصود ہے، اور اس غرض کے لیے صرف ایسے دیکھنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جس کی کوئی حاجت بھی نہ ہو، جس کا کوئی تمدنی فائدہ بھی نہ ہو، اور جس میں جذباتِ شہوانی کو تحریک دینے کے اسباب بھی موجود ہوں۔

یہ حکم جس طرح مردوں کے لیے ہے، اسی طرح عورتوں کے لیے بھی ہے، چنانچہ حدیث میں حضرت امّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ وہ اور حضرت میمونہؓ[1] آنحضرت ﷺ

(۱) دوسری روایت میں حضرت عائشہؓ کا ذکر ہے۔

کے پاس بیٹھی تھیں۔ اتنے میں حضرت ابن امِّ مکتوم آئے، جو نابینا تھے۔ حضورؐ نے فرمایا، ان سے پردہ کرو۔ حضرت امّ سلمہؓ نے عرض کیا، کیا یہ نابینا نہیں ہیں؟ نہ وہ ہم کو دیکھیں گے، نہ ہمیں پہچانیں گے۔ حضورؐ نے جواب دیا، کیا تم دونوں بھی نابینا ہو؟ کیا تم انہیں نہیں دیکھتی ہو۔[1]

مگر عورت کے مردوں کو دیکھنے اور مرد کے عورتوں کو دیکھنے میں نفسیات کے اعتبار سے ایک نازک فرق ہے۔ مرد کی فطرت میں اقدام ہے، کسی چیز کو پسند کرنے کے بعد وہ اس کے حصول کی سعی میں پیش قدمی کرتا ہے، مگر عورت کی فطرت میں تمانع اور فرار ہے، جب تک کہ اس کی فطرت بالکل ہی مسخ نہ ہو جائے، وہ کبھی اس قدر دراز دست اور جری اور بیباک نہیں ہو سکتی کہ کسی کو پسند کرنے کے بعد خود اس کی طرف پیش قدمی کرے۔ شارع نے اس فرق کو ملحوظ رکھ کر عورتوں کے لیے غیر مردوں کے دیکھنے کے معاملے میں وہ سختی نہیں کی ہے جو مردوں کے لیے غیر عورتوں کو دیکھنے کے معاملے میں کی ہے۔ چنانچہ احادیث میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت مشہور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عید کے موقع پر ان کو حبشیوں کا تماشا دکھایا تھا۔[2] اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کا مردوں کو دیکھنا مطلقاً ممنوع نہیں ہے، بلکہ ایک مجلس میں مل کر بیٹھنا اور نظر جما کر دیکھنا مکروہ ہے۔ اور ایسی نظر بھی جائز نہیں جس میں فتنے کا احتمال ہو۔ وہی نابینا صحابی ابن امّ مکتومؓ جن سے نبی ﷺ نے حضرت امّ سلمہؓ کو پردہ کرنے کا حکم دیا تھا، ایک دوسرے موقع پر حضورؐ انہی کے گھر میں فاطمہؓ بنت قیس کو عدّت بسر کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ قاضی ابوبکر بن العربی نے اپنی احکام القرآن میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے کہ فاطمہؓ بنت قیس امِّ شریکؓ کے گھر میں عدّت گزارنا چاہتی تھیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس گھر میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، تم ابنؓ مکتوم کے ہاں رہو، کیوں کہ وہ ایک اندھا آدمی ہے اور اس کے ہاں تم بے پردہ رہ سکتی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ

---

(۱) ترمذی، باب ماجاء فی احتجاب النساء من الرجال۔

(۲) یہ روایت بخاری اور مسلم اور نسائی اور مسند احمد وغیرہ میں کئی طریقوں سے آئی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کی توجیہہ یہ کی ہے کہ یہ واقعہ شاید اس وقت کا ہے جب حضرت عائشہؓ کم سن تھیں اور حجاب کے احکام نازل نہ ہوئے تھے۔ مگر ابن حبان میں تصریح ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب حبش کا ایک وفد مدینے آیا تھا اور تاریخ سے ثابت ہے کہ اس وفد کی آمد ۷ ہجری میں ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے حضرت عائشہؓ کی عمر اس وقت پندرہ سولہ برس کی تھی۔ نیز بخاری کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓ کو چادر سے ڈھانکتے جاتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ احکامِ حجاب بھی اس وقت نازل ہو چکے تھے۔

اصل مقصد فتنے کے احتمالات کو کم کرنا ہے۔ جہاں فتنے کا احتمال زیادہ تھا وہاں رہنے سے منع فرما دیا۔ جہاں احتمال کم تھا وہاں اجازت رہنے کی دے دی، کیوں کہ بہر حال اس عورت کو کہیں رہنا ضرور تھا۔ لیکن جہاں کوئی حقیقی ضرورت نہ تھی وہاں خواتین کو ایک غیر مرد کے ساتھ ایک مجلس میں جمع ہونے اور روبرو اس کو دیکھنے سے روک دیا۔

یہ سب مراتب حکمت پر مبنی ہیں اور جو شخص مغزِ شریعت تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ غضِ بصر کے احکام کن مصالح پر مبنی ہیں اور ان مصالح کے لحاظ سے ان احکام میں شدّت اور تخفیف کا مدار کن امور پر ہے۔ شارع کا اصل مقصد تم کو نظر بازی سے روکنا ہے، ورنہ اسے تمہاری آنکھوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ یہ آنکھیں ابتدا میں بڑی معصوم نگاہوں سے دیکھتی ہیں، نفس کا شیطان ان کی تائید میں بڑے بڑے پرفریب دلائل پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ ذوقِ جمال ہے جو فطرت نے تم میں ودیعت کیا ہے۔ جمالِ فطرت کے دوسرے مظاہر و تجلیات کو جب تم دیکھتے ہو اور ان سے بہت ہی پاک لطف اٹھاتے ہو تو جمالِ انسانی کو بھی دیکھو اور روحانی لطف اٹھاؤ مگر اندر ہی اندر یہ شیطان لطف اندوزی کی لے کو بڑھاتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ذوقِ جمال ترقی کر کے شوقِ وصال بن جاتا ہے۔ کون ہے جو اس حقیقت سے انکار کی جرأت رکھتا ہو کہ دنیا میں جس قدر بدکاری اب تک ہوئی ہے اور اب ہو رہی ہے اس کا پہلا اور سب سے بڑا محرک یہی آنکھوں کا فتنہ ہے؟ کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اپنی صنفِ مقابل کے کسی حسین اور جوان فرد کو دیکھ کر اس میں وہی کیفیات پیدا ہوتی ہیں جو ایک خوبصورت پھول کو دیکھ کر ہوتی ہیں؟ اگر دونوں قسم کی کیفیات میں فرق ہے اور ایک کے برخلاف دوسری کیفیت کم وبیش شہوانی کیفیت ہے تو پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ ایک ذوقِ جمال کے لیے بھی وہی آزادی ہونی چاہیے جو دوسرے ذوقِ جمال کے لیے ہے؟ شارع تمہارے ذوقِ جمال کو مٹانا تو نہیں چاہتا، وہ کہتا ہے کہ تم اپنی پسند کے مطابق اپنا ایک جوڑا انتخاب کر لو اور جمال کا جتنا ذوق تم میں ہے اس کا مرکز صرف اسی ایک کو بنا لو۔ پھر جتنا چاہو اس سے لطف اٹھاؤ۔ اس مرکز سے ہٹ کر دیدہ بازی کرو گے تو فواحش میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اگر ضبطِ نفس یا دوسرے موانع کی بنا پر آوارگیِ عمل میں مبتلا نہ بھی ہوئے تو آوارگیِ خیال سے کبھی نہ بچ سکو گے۔ تمہاری بہت سی قوت آنکھوں کے رستے ضائع ہوگی۔ بہت سے ناکردہ گناہوں کی حسرت تمہارے دل کو ناپاک کرے گی۔ بار بار فریب

محبت میں گرفتار ہو گے اور بہت سی راتیں بیداری کے خواب دیکھنے میں جاگ جاگ کر ضائع کرو گے۔ بہت سے حسین ناگوں اور ناگنوں سے ڈسے جاؤ گے۔ تمہاری بہت سی قوتِ حیات دل کی دھڑکن اور خون کے ہیجان میں ضائع ہو جائے گی۔ یہ نقصان کیا کچھ کم ہے؟ اور یہ سب اپنے مرکز دید سے ہٹ کر دیکھنے ہی کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اپنی آنکھوں کو قابو میں رکھو۔ بغیر حاجت کے دیکھنا اور ایسا دیکھنا کہ جو فتنے کا سبب بن سکتا ہو، قابل حذر ہے۔ اگر دیکھنے کی حقیقی ضرورت ہو یا اس کا کوئی تمدنی فائدہ ہو تو احتمالِ فتنہ کے باوجود دیکھنا جائز ہے، اور اگر حاجت نہ ہو لیکن فتنے کا بھی احتمال نہ ہو تو عورت کے لیے مرد کو دیکھنا جائز ہے، مگر مرد کے لیے عورت کو دیکھنا جائز نہیں، الّا یہ کہ اچانک نظر پڑ جائے۔

اِظہارِ زینت کی ممانعت اور اس کے حُدود

غضِّ بصر کا حکم عورت اور مرد دونوں کے لیے تھا۔ اس کے بعد چند احکام خاص عورتوں کے لیے ہیں۔ ان میں سے پہلا حکم یہ ہے کہ ایک محدود دائرے کے باہر اپنی زینت کے اظہار سے پرہیز کرو۔

اس حکم کے مقاصد اور اس کی تفصیلات پر غور کرنے سے پہلے ان احکام کو پھر ایک مرتبہ ذہن میں تازہ کر لیجیے جو اس سے پہلے لباس اور سَتر کے باب میں بیان ہو چکے ہیں۔ چہرہ اور ہاتھوں کے سوا عورت کا پورا جسم سَتر ہے، جس کو باپ، چچا، بھائی اور بیٹے تک کے سامنے کھولنا جائز نہیں، حتیٰ کہ عورت پر بھی عورت کے سَتر کا کھلنا مکروہ ہے۔[1] اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد اظہارِ زینت کے حدود ملاحظہ کیجیے:

۱- عورت کو اجازت دی گئی ہے کہ اپنی زینت کو ان رشتہ داروں کے سامنے ظاہر کرے۔ شوہر، باپ، خسر، بیٹے، سوتیلے بیٹے، بھائی، بھتیجے اور بھانجے۔

۲- اس کو یہ بھی اجازت دی گئی ہے کہ اپنے غلاموں کے سامنے اظہارِ زینت کرے (نہ کہ دوسروں کے غلاموں کے سامنے)۔

---

(۱) عورت کے لیے عورت کے جسم کا ناف سے گھٹنے تک کا حصّہ دیکھنا اسی طرح حرام ہے جس طرح مرد کے لیے دوسرے مرد کا یہی حصّہ جسم دیکھنا حرام ہے، اس کے سوا باقی حصّہ جسم کو دیکھنا اس کے لیے مکروہ ہے، قطعی حرام نہیں ہے۔

۳- وہ ایسے مردوں کے سامنے بھی زینت کے ساتھ آسکتی ہے جو تابع یعنی زیردست اور ماتحت ہوں اور عورتوں کی طرف میلان ورغبت رکھنے والے مردوں میں سے نہ ہوں۔(۱)

(۱) اس حکم کی تفسیر کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں: اَوِ التَّابِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَۃِ مِنَ الرِّجَالِ ای الاجراء والاتباع الذین لیسوا باکفاءٍ وھم مع ذالك فی عقولھم بله ولاھم الی النساء فلا یشتھونھن یعنی مراد وہ مزدور ملازم اور تابعدار مرد ہیں جو عورتوں کے ہمسر نہ ہوں، نیز چالاک اور تیز قسم کے لوگ نہ ہوں بلکہ سیدھے سادھے لوگ ہوں جو عورتوں کی طرف شہوانی میلان نہ رکھتے ہوں۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد۳ صفحہ۲۸۵)

شہوانی میلان نہ رکھنے کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ایک یہ کہ ان میں سرے سے شہوت ہی مفقود ہو، جیسے بہت بوڑھے لوگ، ناقص العقل، ابلہ یا پیدائشی مخنث۔دوسرے یہ کہ ان میں مردانہ قوت اور عورتوں کی طرف طبعی میلان موجود تو ہو مگر اپنی ماتحتی و زیردستی کی وجہ سے وہ اس شخص کے گھر کی عورتوں کے ساتھ کسی قسم کے شہوانی جذبات وابستہ نہ کرسکتے ہوں۔جس کے ہاں مزدور یا ملازم کی حیثیت سے وہ کام کرتے ہوں، یا جس کے ہاں فقیر ومسکین کی حیثیت سے وہ خیرات طلب کرنے کے لیے جایا کرتے ہوں۔

''اَوِ التَّابِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَۃِ مِنَ الرِّجَالِ'' کا اطلاق ان دونوں قسم کے آدمیوں پر ہوگا لیکن یہ خیال رہے کہ اس طرح کے تمام وہ مرد جن کے سامنے عورتوں کو زینت کے ساتھ آنے کی اجازت دی جائے ان میں لازماً دو صفتیں موجود ہونی چاہئیں۔ایک یہ کہ وہ اس گھر کے تابع ہوں جس کی عورتیں ان کے سامنے آرہی ہیں۔دوسرے یہ کہ وہ اس گھر کی عورتوں کے ساتھ شہوانی غرض وابستہ کرنے کا تصوّر بھی نہ کرسکتے ہوں۔اور یہ دیکھنا ہر خاندان کے قوّام کا کام ہے کہ ایسے جن تابعین کو وہ گھر میں آنے کی اجازت دے رہا ہے اُن پر ''غیر اولی الاربۃ'' ہونے کا جو گمان اس نے ابتداءً کیا تھا وہ صحیح ثابت ہو رہا ہے یا نہیں۔اگر ابتدائی اجازت کے بعد آگے چل کر کسی وقت یہ شبہہ کرنے کی گنجائش نکل آئے کہ وہ ''اولی الاربۃ'' میں سے ہیں تو اجازت منسوخ کردینی چاہیے۔اس معاملے میں بہترین نظیر اس مخنث کی ہے جسے نبی ﷺ نے گھروں میں آنے کی اجازت دے رکھی تھی اور پھر ایک واقعہ کے بعد اس کو نہ صرف گھروں میں آنے سے روک دیا بلکہ مدینہ سے ہی نکال دیا۔اس کا قصہ یہ ہے کہ مدینہ میں ایک مخنث تھا جو ازواجِ مطہرات کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ایک مرتبہ وہ حضرت امّ سلمہؓ کے ہاں بیٹھا ہوا ان کے بھائی حضرت عبداللہؓ سے باتیں کررہا تھا، اتنے میں نبی ﷺ تشریف لے آئے اور مکان میں داخل ہوتے ہوئے آپؐ نے سنا۔وہ عبداللہؓ سے کہہ رہا تھا ''اگر کل طائف فتح ہوگیا تو میں بادیہ بنتِ غیلان ثقفی کو تمہیں دکھاؤں گا، جس کا حال یہ ہے کہ جب سامنے سے آتی ہے تو اس کے پیٹ میں چار بَل نظر آتے ہیں اور جب پیچھے پلٹتی ہے تو آٹھ بَل۔'' اس کے بعد ایک شرمناک فقرے میں اس نے اس عورت کے سَتر کی تعریف کی۔نبی ﷺ نے اس کی یہ باتیں سن کر فرمایا: لقد غلغلت النظر الیھا یا عدو اللہ (اے دشمنِ خدا تو نے تو اسے خوب نظریں گاڑ کر دیکھا ہے) پھر ازواجِ مطہرات سے فرمایا: میں دیکھتا ہوں کہ یہ عورتوں کے احوال سے واقف ہے۔لہٰذا اب یہ تمہارے پاس نہ آنے پائے۔پھر آپؐ نے اس پر بھی بس نہ کیا بلکہ اسے مدینہ سے نکال کر بیداء میں رہنے کا حکم دیا، کیوں کہ اس نے بنتِ غیلان کے سَتر کا جو نقشہ کھینچا تھا اس سے آپؐ نے اندازہ فرمایا کہ اس شخص کے زنانہ پن کی وجہ سے عورتیں اس کے ساتھ اتنی ہی بے تکلف ہوجاتی ہیں جتنی اپنی ہم جنس عورتوں سے ہوسکتی ہیں۔اور اس طرح یہ ان کے اندرونی احوال سے واقف ہوکر ان کی تعریفیں مردوں کے سامنے بیان کرتا ہے۔جس سے بڑے فتنے برپا ہوسکتے ہیں۔

(بذل المجھود، کتاب اللباس۔ باب ماجاء فی قولہ تعالیٰ "غیر اولی الاربتہ من الرجال")

۴- عورت ایسے بچّوں کے سامنے بھی اظہارِ زینت کرسکتی ہے جن میں ابھی صنفی احساسات پیدا نہ ہوئے ہوں۔ قرآن میں "اَوِ الطِّفلِ الَّذِینَ لَم یَظھَرُوا عَلٰی عَورٰتِ النِّسَآءِ ص" فرمایا گیا ہے، جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "ایسے بچّے جو ابھی عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے آگاہ نہ ہوئے ہوں۔"

۵- اپنے میل جول کی عورتوں کے سامنے بھی عورت کا زینت کے ساتھ آنا جائز ہے۔ قرآن میں النساء (عورتوں) کے الفاظ نہیں کہے گئے بلکہ نِسَائِھِنَّ (اپنی عورتوں) کے الفاظ کہے گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ شریف عورتیں یا اپنے کنبے یا رشتے، یا اپنے طبقے کی عورتیں مراد ہیں۔ ان کے ماسوا غیر عورتیں جن میں ہر قسم کی مجہول الحال اور مشتبہ چال چلن والیاں، اور آوارہ و بدنام سب ہی شامل ہوتی ہیں، اس اجازت سے خارج ہیں کیوں کہ وہ بھی فتنہ کا سبب بن سکتی ہیں۔ اسی بنا پر جب شام کے علاقہ میں مسلمان گئے اور ان کی خواتین وہاں کی نصرانی اور یہودی عورتوں کے ساتھ بے تکلفانہ ملنے لگیں تو حضرت عمرؓ نے امیرِ شام حضرت عبیدہؓ بن الجراح کو لکھا کہ مسلمان عورتوں کو اہلِ کتاب کی عورتوں کے ساتھ حماموں میں جانے سے منع کردو۔[۱] حضرت ابن عباسؓ نے تصریح کی ہے کہ مسلمان عورت کفار اور اہل الذمہ کی عورتوں کے سامنے اس سے زیادہ ظاہر نہیں کرسکتی جو اجنبی مردوں کے سامنے ظاہر کرسکتی ہے۔[۲] اس سے کوئی مذہبی امتیاز مقصود نہ تھا، بلکہ مسلمان عورتوں کو ایسی عورتوں کے اثرات سے بچانا مقصود تھا جن کے اخلاق اور تہذیب کا صحیح حال معلوم نہ ہو، یا جس حد تک معلوم ہو وہ اسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہو۔ رہیں وہ غیر مسلم عورتیں جو شریف اور باحیاء اور نیک خصلت ہوں تو وہ نِسَائِھِنَّ ہی میں شمار ہوں گی۔

ان حدود پر غور کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ جس زینت کے اظہار کی اجازت اس محدود حلقہ میں دی گئی ہے وہ سترِ عورت کے ماسوا ہے۔ اس سے مراد زیور پہننا، اچھے ملبوسات سے آراستہ ہونا، سُرمہ اور حنا اور بالوں کی

---

(۱) ابن جریر، تفسیر آیۂ مذکورہ۔
(۲) تفسیر کبیر۔ آیۂ مذکورہ۔

آرایش اور دوسری وہ آرائشیں ہیں جو عورتیں اپنی اُنوثت کے اقتضاء سے اپنے گھر میں کرنے کی عادی ہوتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ اس قسم کی آرایشوں کے اظہار کی اجازت یا تو ان مردوں کے سامنے دی گئی ہے جن کو ابدی حرمت نے عورتوں کے لیے حرام کر دیا ہے، یا ان لوگوں کے سامنے جن کے اندر صنفی میلانات نہیں ہیں، یا ان کے سامنے جو فتنے کا سبب نہ بن سکتے ہوں۔ چنانچہ عورتوں کے لیے نِسَآئِهِنَّ کی قید ہے۔ تابعین کے لیے غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ اور بچّوں کے لیے لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ شارع کا منشا عورتوں کے اظہارِ زینت کو ایسے حلقہ میں محدود کرنا ہے جس میں اُن کے حُسن اور ان کی آرایش سے کسی قسم کے ناجائز جذبات پیدا ہونے اور صنفی انتشار کے اسباب فراہم ہو جانے کا اندیشہ نہیں ہے۔

اس حلقے کے باہر جتنے مرد ہیں ان کے بارے میں ارشاد ہے کہ ان کے سامنے اپنی زینت کا اظہار نہ کرو، بلکہ چلنے میں پاؤں بھی اس طرح نہ مارو کہ چھپی ہوئی زینت کا حال آواز سے ظاہر ہو اور اس ذریعہ سے توجہات تمہاری طرف منعطف ہوں۔ اس فرمان میں جس زینت کو اجانب سے چھپانے کا حکم دیا گیا ہے وہ وہی زینت ہے جس کو ظاہر کرنے کی اجازت اوپر کے محدود حلقہ میں دی گئی ہے۔ مقصود بالکل واضح ہے۔ عورتیں اگر بن ٹھن کر ایسے لوگوں کے سامنے آئیں گی جو صنفی خواہشات رکھتے ہیں اور جن کے داعیاتِ نفس کو ابدی حرمت نے پاکیزہ اور معصوم جذبات سے مبدّل بھی نہیں کیا ہے، لامحالہ اس کے اثرات وہی ہوں گے جو مقتضائے بشریّت ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ ایسے اظہارِ زینت سے ہر عورت فاحشہ ہی ہو کر رہے گی اور ہر مرد بالفعل بدکار ہی بن کر رہے گا، مگر اس سے بھی کوئی مرد انکار نہیں کر سکتا کہ زینت و آرایش کے ساتھ عورتوں کے علانیہ پھرنے اور محفلوں میں شریک ہونے سے بیشمار جلی اور خفی، نفسانی اور مادّی نقصانات رونما ہوتے ہیں۔ آج یورپ اور امریکہ کی عورتیں اپنی اور اپنے شوہروں کی آمدنی کا بیشتر حصّہ اپنی آرایش پر خرچ کر رہی ہیں۔ اور روز بروز ان کا یہ خرچ اتنا بڑھتا چلا جا رہا ہے کہ ان کے معاشی وسائل اس کے تحمل کی قوت نہیں رکھتے۔[1] کیا یہ جنون انہی پرشوق نگاہوں نے پیدا

---

(۱) حال میں کیمیاوی سامان بنانے والوں کی نمایش ہوئی تھی جس میں ماہرین کے بیانات سے معلوم ہوا کہ انگلستان کی عورتیں اپنے سنگھار پر دو کروڑ پونڈ اور امریکہ کی عورتیں ساڑھے بارہ کروڑ پونڈ سالانہ خرچ کرتی ہیں اور قریب قریب ۹۰ فیصدی عورتیں کسی نہ کسی طریقے کے Make-up کی خوگر ہیں۔

نہیں کیا ہے جو بازاروں اور دفتروں اور سوسائٹی کے اجتماعات میں آراستہ خواتین کا استقبال کرتی ہیں؟ پھر غور کیجیے کہ آخر عورتوں میں آرائش کا اس قدر شوق پیدا ہونے اور طوفان کی طرح بڑھنے کا سبب کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ مردوں سے خراجِ تحسین وصول کرنا اور ان کی نظروں میں کھُب جانا چاہتی ہیں۔[1] یہ کس لیے؟ کیا یہ بالکل ہی معصوم جذبہ ہے؟ کیا اس کی تہ میں وہ صنفی خواہشات چھپی ہوئی نہیں ہیں جو اپنے فطری دائرے سے نکل کر پھیل جانا چاہتی ہیں اور جن کے مطالبات کا جواب دینے کے لیے دوسری جانب بھی ویسی ہی خواہشات موجود ہیں۔ اگر آپ اس سے انکار کریں گے تو شاید کل آپ یہ دعویٰ کرنے میں بھی تامل نہ کریں کہ جوالا مُکھّی پہاڑ پر جو دھواں نظر

---

(۱) خوبصورت بننے کا جنون عورتوں میں اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ اس کی خاطر وہ اپنی جانیں تک دے رہی ہیں۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہلکی پھلکی گڑیا سی بن کر رہیں۔ اور ان کے جسم پر ایک اونس بھی ضرورت سے زیادہ گوشت نہ ہو۔ خوبصورتی کے لیے پنڈلی، ران اور سینہ کے جو ناپ ماہرین نے مقرر کر دیے ہیں، ہر لڑکی اپنے آپ کو اس پیمانہ کے اندر رکھنا چاہتی ہے گویا اس کمبخت کی زندگی کا کوئی مقصد دوسروں کی نگاہوں میں مرغوب بننے کے سوا نہ رہا۔ اس مقصد کے لیے یہ بیچاریاں فاقے کرتی ہیں، جسم کو نشو ونما دینے والی غذاؤں سے قصداً اپنے آپ کو محروم رکھتی ہیں۔ لیمو کے رس، تلخ قہوہ اور ایسی ہی ہلکی غذاؤں پر جیتی ہیں اور طبّی مشورے کے بغیر، بلکہ اس کے برخلاف ایسی دوائیں استعمال کرتی ہیں جو انہیں دُبلا کریں۔ اس جنون کی خاطر بہت سی عورتوں نے اپنی جانیں دی ہیں اور دے رہی ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں بوڈاپسٹ کی مشہور ایکٹرس جوسی لاباس یکا یک حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے مر گئی۔ بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ کئی سال سے قصداً نیم فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اور جسم گھٹانے کی پیٹنٹ دوائیں استعمال کیے جاتی تھی۔ آخر اس کی قوتوں نے یکا یک جواب دے دیا۔ اس کے بعد پے در پے بوڈاپسٹ ہی میں تین اور ایسے ہی حادثے پیش آئے۔ ماگدا بر سیلی جو اپنے حسن اور کمالات کے لیے تمام ہنگری میں مشہور تھی۔ اسی ''ہلکے پن'' کے شوق کی نذر ہوئی۔ پھر ایک مغنّیہ لوئیسا زابوجس کے گانوں کی ہر طرف دھوم تھی، ایک رات عین اسٹیج پر اپنا کام کرتی ہوئی ہزار ہا ناظرین کے سامنے غش کھا کر گر پڑی۔ اس کو یہ غم کھائے جاتا تھا کہ اس کا جسم موجودہ زمانے کے معیارِ حسن پر پورا نہیں اترتا۔ اس مصیبت کو دور کرنے کے لیے بیچاری نے مصنوعی تدبیریں اختیار کرنی شروع کیں اور دو مہینے میں ۶۰ پونڈ وزن کم کر ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دل حد سے زیادہ کمزور ہو گیا اور ایک دن وہ بھی خریدارانِ حُسن کی بھینٹ چڑھ کر رہی۔ اس کے بعد ایمولا نامی ایک اور ایکٹرس کی باری آئی اور اس نے مصنوعی تدبیروں سے اپنے آپ کو اتنا ہلکا کیا کہ ایک مستقل دماغی مرض میں مبتلا ہو گئی اور اسٹیج کے بجائے اسے پاگل خانے کی راہ لینی پڑی۔ اس قسم کی مشہور شخصیتوں کے واقعات تو اخباروں میں آ جاتے ہیں۔ مگر کون جانتا ہے کہ یہ حُسن اور معشوقیت کا جنون جو گھر گھر پھیلا ہوا ہے، روزانہ کتنی صحتوں اور کتنی زندگیوں کو تباہ کرتا ہو گا؟ کوئی بتائے کہ یہ عورتوں کی آزادی ہے یا اُن کی غلامی؟ اس نام نہاد آزادی نے تو ان پر مردوں کی خواہشات کا استبداد اور زیادہ مسلّط کر دیا ہے۔ اس نے تو ان کو ایسا غلام بنایا ہے کہ وہ کھانے پینے اور تندرست رہنے کی آزادی سے بھی محروم ہو گئیں۔ ان غریبوں کا تو جینا اور مرنا اب بس مردوں ہی کے لیے رہ گیا ہے۔

آتا ہے اس کی تہہ میں کوئی لاوا باہر نکلنے کے لیے بیتاب نہیں ہے۔ آپ اپنے عمل کے مختار ہیں۔ جو چاہے کیجیے۔ مگر حقائق سے انکار نہ کیجیے۔ یہ حقیقتیں اب کچھ مستور بھی نہیں رہیں، سامنے آچکی ہیں اور اپنے نتائج، آفتاب سے زیادہ روشن نتائج کے ساتھ آچکی ہیں۔ آپ ان نتائج کو دانستہ یا نادانستہ قبول کرتے ہیں۔ مگر اسلام ان کو ٹھیک اسی مقام پر روک دینا چاہتا ہے جہاں سے ان کے ظہور کی ابتدا ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس کی نظر اظہارِ زینت کے بظاہر معصوم آغاز پر نہیں بلکہ اُس نہایت غیر معصوم انجام پر ہے جو تمام سوسائٹی پر قیامت کی سی تاریکی لے کر پھیل جاتا ہے "مثل الرافلة فی الزینة فی غیر اھلھا کمثل ظلمة یوم القیمة لانورلھا۔"(۱)

قرآن میں جہاں اجنبیوں کے سامنے زینت کا اظہار کرنے کی ممانعت ہے وہاں ایک استثناء بھی ہے: اِلَّا مَاظَھَرَ مِنھَا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی زینت کے ظاہر ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جو خود ظاہر ہو جائے۔ لوگوں نے اس استثناء سے بہت کچھ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ان الفاظ میں کچھ زیادہ فائدہ اٹھانے کی گنجایش ہی نہیں ہے۔ شارع صرف یہ کہتا ہے کہ تم اپنے ارادے سے غیروں کے سامنے اپنی زینت ظاہر نہ کرو۔ لیکن جو زینت خود ظاہر ہو جائے یا اضطراراً ظاہر ہی رہنے والی ہو اس کی تم پر کوئی ذمے داری نہیں۔ مطلب صاف ہے۔ تمھاری نیت اظہارِ زینت کی نہ ہونی چاہیے، تم میں یہ جذبہ، یہ ارادہ ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ اپنی آرایش غیروں کو دکھاؤ یا اور کچھ نہیں تو چھپے ہوئے زیوروں کی جھنکار ہی سنا کر ان کی توجہ اپنی طرف مائل کرو۔ تم کو اپنی طرف سے تو اخفائے زینت کی اختیاری کوشش کرنی چاہیے، پھر اگر کوئی چیز اضطراراً کھُل جائے تو اس پر خدا تم سے کوئی مواخذہ نہ کرے گا۔ تم جن کپڑوں میں زینت کو چھپاؤ گی وہ تو بہر حال ظاہر ہی ہوں گے۔ تمہارا قد وقامت، تناسبِ جسمانی ڈیل ڈول تو اُن میں محسوس ہوگا۔ کسی ضرورت یا کام کاج کے لیے کبھی ہاتھ یا چہرے کا کوئی حصّہ تو کھولنا ہی پڑے گا۔ کوئی حرج نہیں اگر ایسا ہو۔ تمہاری نیت اس کے اظہار کی نہیں۔ تم اس کے اظہار پر مجبور بھی ہو۔ اگر ان چیزوں سے بھی کوئی کمینہ لذّت لیتا ہے تو لیا کرے۔ اپنی بدنیتی کی سزا خود بھگتے گا۔ جتنی ذمے داری تمدّن اور اخلاق کی خاطر تم پر ڈالی گئی تھی، اس کو تم نے اپنی حد تک پورا کر دیا۔

---

(۱) اجنبیوں میں زینت کے ساتھ ناز وانداز سے چلنے والی عورت ایسی ہے جیسے روزِ قیامت کی تاریکی کہ اس میں کوئی نور نہیں۔ (ترمذی، باب ماجاء فی کراهته خروج النساء فی الزینته)

یہ ہے صحیح مفہوم اس آیت کا۔ مفسّرین کے درمیان اس کے مفہوم میں جتنے اختلافات ہیں، اُن سب پر جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ تمام اختلافات کے باوجود ان کے اقوال کا مفاد وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

ابنِ مسعود، ابراہیم نخعی اور حسن بصری کے نزدیک زینتِ ظاہرہ سے مراد وہ کپڑے ہیں جن میں زینتِ باطنہ کو چھپایا جاتا ہے۔ مثلاً برقع یا چادر۔

ابنِ عباس، مجاہد، ابنِ عمر، انس، ضحاک، سعید بن جُبیر، اوزاعی اور عامّہ حنفیہ کے نزدیک اس سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہیں اور وہ اسبابِ زینت بھی اس استثنا میں داخل ہیں جو چہرے اور ہاتھ میں عادتاً ہوتے ہیں۔ مثلاً: ہاتھ کی حِنا اور انگوٹھی اور آنکھوں کا سرمہ وغیرہ۔

سعید بن المسیِّب کے نزدیک صرف چہرہ مستثنٰی ہے اور ایک قول حسن بصری سے بھی ان کی تائید میں منقول ہے۔

حضرت عائشہؓ چہرہ چھپانے کی طرف مائل ہیں۔ ان کے نزدیک زینتِ ظاہرہ سے مراد ہاتھ اور چوڑیاں، کنگن اور انگوٹھیاں ہیں۔

مسور بن مخرمہ اور قتادہ ہاتھوں کو ان کی زینت سمیت کھولنے کی اجازت دیتے ہیں مگر چہرے کے باب میں ان کے اقوال سے ایسا متبادر ہوتا ہے کہ پورے چہرے کے بجائے وہ صرف آنکھیں کھولنے کو جائز رکھتے ہیں۔[1]

ان اختلافات کے منشا پر غور کیجیے۔ ان سب مفسّرین نے ''اِلَّا مَاظَھَرَ مِنۡھَا'' سے یہی سمجھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی زینت کو ظاہر کرنے کی اجازت دیتا ہے جو اضطراراً ظاہر ہو جائے یا جس کو ظاہر کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔ چہرے اور ہاتھوں کی نمایش کرنا یا اُن کو مطمحِ اَنظار بنانا ان میں سے کسی کا بھی مقصود نہیں۔ ہر ایک نے اپنی فہم اور عورتوں کی ضروریات کے لحاظ سے یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ ضرورت کس حد تک کس چیز کو بے حجاب کرنے کے لیے داعی ہوتی ہے، یا کیا چیز اضطراراً کھُل سکتی ہے، یا عادتاً کھُلتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ ''اِلَّا مَاظَھَرَ مِنۡھَا'' کو ان میں سے کسی چیز کے ساتھ بھی مقیّد نہ کیجیے، ایک مومن عورت جو خدا اور رسول کے احکام کی سچّے دل سے پابند رہنا چاہتی ہے اور جس کو فتنے میں مبتلا ہونا منظور نہیں ہے، وہ خود اپنے حالات

(۱) یہ تمام اقوال تفسیر ابن جریر اور علامہ جصّاص کی احکام القرآن سے ماخوذ ہیں۔

اور ضروریات کے لحاظ سے فیصلہ کرسکتی ہے کہ چہرہ اور ہاتھ کھولے یا نہیں، کب کھولے اور کب نہ کھولے، کس حد تک کھولے اور کس حد تک چھپائے۔ اس باب میں قطعی احکام نہ شارع نے دیے ہیں، نہ اختلافِ احوال وضروریات کو دیکھتے ہوئے یہ مقتضائے حکمت ہے کہ قطعی احکام وضع کیے جائیں۔ جو عورت اپنی حاجات کے لیے باہر جانے اور کام کاج کرنے پر مجبور ہے اس کو کسی وقت ہاتھ بھی کھولنے کی ضرورت پیش آئے گی اور چہرہ بھی، ایسی عورت کے لیے بلحاظ ضرورت اجازت ہے۔ اور جس عورت کا حال یہ نہیں ہے اس کے لیے بلا ضرورت قصداً کھولنا درست نہیں۔

پس شارع کا مقصد یہ ہے کہ اپنا حُسن دکھانے کے لیے اگر کوئی چیز بے حجاب کی جائے تو یہ گناہ ہے۔ خود بہ خود بلا ارادہ کچھ ظاہر ہو جائے تو کوئی گناہ نہیں۔ حقیقی ضرورت اگر کچھ کھولنے پر مجبور کرے تو اس کا کھولنا بالکل جائز ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اختلافِ احوال سے قطعِ نظر کرکے نفسِ چہرہ کا کیا حکم ہے؟ شارع اس کے کھولنے کو پسند کرتا ہے یا ناپسند؟ اس کے اظہار کی اجازت محض ناگزیر ضرورت کے طور پر دی گئی ہے یا اس کے نزدیک چہرہ غیروں سے چھپانے کی چیز ہی نہیں ہے؟ ان سوالات پر سورۂ احزاب والی آیت میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

چہرہ کا حکم

سورۂ احزاب کی جس آیت کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

يَآيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ (الاحزاب: ۵۹)

اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں، اس تدبیر سے یہ بات زیادہ متوقع ہے کہ وہ پہچان لی جائیں گی، اور انھیں ستایا نہ جائے گا۔

یہ آیت خاص چہروں کو چھپانے کے لیے ہے، ’جلابیب‘ جمع ہے ’جلباب‘ کی، جس کے معنی چادر کے ہیں۔ اِدْنَاءَ کے معنی ارخاء یعنی لٹکانے کے ہیں۔ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ ”اپنے اوپر اپنی چادروں میں سے ایک حصہ لٹکا لیا کریں۔“

یہی مفہوم گھونگھٹ ڈالنے کا ہے۔ مگر اصل مقصد وہ خاص وضع نہیں ہے جس کو عرف عام میں گھونگھٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے، بلکہ چہرے کو چھپانا مقصود ہے، خواہ گھونگھٹ سے چھپایا جائے یا نقاب سے یا کسی اور طریقے سے۔ اس کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ جب مسلمان عورتیں اس طرح مستور ہو کر باہر نکلیں گی تو لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ شریف عورتیں ہیں، بے حیا نہیں ہیں، اس لیے کوئی ان سے تعرّض نہ کرے گا۔

قرآن مجید کے تمام مفسّرین نے اس آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی ضرورت سے نکلیں تو سر کے اوپر سے اپنی چادروں کے دامن لٹکا کر اپنے چہروں کو ڈھانک لیا کریں۔ (تفسیر ابن جریر، ج ۲۲، ص: ۲۹)

امام محمد بن سیرین نے حضرت عبیدہ بن سفیان الحارث الحضرمی سے دریافت کیا کہ اس حکم پر عمل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ انہوں نے خود چادر اوڑھ کر بتایا اور اپنی پیشانی اور ناک اور ایک آنکھ کو چھپا کر صرف ایک آنکھ کھلی رکھی۔ (تفسیر ابن جریر، حوالۂ مذکور۔ احکام القرآن، ج سوم، ص: ۴۵۷)

علاّمہ ابن جریر طبری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ”اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ جب اپنے گھروں سے کسی حاجت کے لیے نکلیں تو لونڈیوں کے سے لباس نہ پہنیں کہ سر اور چہرے کھلے ہوئے ہوں بلکہ وہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں تاکہ کوئی فاسق ان سے تعرض نہ کر سکے اور سب جان لیں کہ وہ شریف عورتیں ہیں۔“
>
> (تفسیر ابن جریر، بحوالۂ مذکور)

علاّمہ ابوبکر جصّاص لکھتے ہیں:

> ”یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جوان عورت کو اجنبیوں سے چہرہ چھپانے کا حکم ہے اور اسے گھر سے نکلتے وقت پردہ داری اور عفت مآبی کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ بدنیت لوگ اس کے حق میں طمع نہ کر سکیں۔“ (احکام القرآن، ج سوم، ص: ۴۵۸)

علامہ نیشاپوری اپنی تفسیر غرائب القرآن میں لکھتے ہیں:

> ”ابتدائے عہدِ اسلام میں عورتیں زمانۂ جاہلیت کی طرح قمیص اور دوپٹے کے ساتھ نکلتی

تھیں، اور شریف عورتوں کا لباس ادنیٰ طبقہ کی عورتوں سے مختلف نہ تھا۔ پھر حکم دیا گیا کہ وہ چادریں اوڑھیں اور اپنے سر اور چہروں کو چھپائیں تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ شریف عورتیں ہیں، فاحشہ نہیں ہیں۔" (تفسیر غرائب القرآن بر حاشیہ ابن جریر ج ۲۲، ص: ۳۲)

امام رازی لکھتے ہیں:

"جاہلیت میں اشراف کی عورتیں اور لونڈیاں سب کھلی پھرتی تھیں اور بدکار لوگ ان کا پیچھا کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شریف عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اوپر چادر ڈال لیں۔ اور یہ جو فرمایا کہ "ذَالِكَ اَدْنٰٓی اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ" تو اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ اس لباس سے پہچان لیا جائے گا کہ وہ شریف عورتیں ہیں اور ان کا پیچھا نہ کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ بدکار نہیں ہیں کیوں کہ جو عورت چہرہ چھپائے گی، درآں حالیکہ چہرہ "عَوْرَت"[1] نہیں ہے جس کا چھپانا فرض ہو، تو کوئی شخص اس سے یہ توقع نہ کرے گا کہ ایسی شریف عورت کشفِ عورت پر آمادہ ہو جائے گی۔ پس اس لباس سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ وہ ایک پردہ دار عورت ہے اور اس سے بدکاری کی توقع نہ کی جا سکے گی۔ (تفسیر کبیر، ج ۶، ص: ۵۹۱)

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:

"يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ" یعنی جب وہ اپنی حاجات کے لیے باہر نکلیں تو اپنی چادروں سے اپنے چہروں اور اپنے جسموں کو چھپالیں۔ یہاں لفظ "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، یعنی چادروں کے ایک حصّہ کو منہ پر ڈالا جائے، اور ایک حصّہ کو جسم پر لپیٹ لیا جائے۔ "ذَالِكَ اَدْنٰٓی اَنْ يُّعْرَفْنَ" یعنی اس سے ان کے اور لونڈیوں اور مغنّیات کے درمیان تمیز ہو جائے گی۔ "فَلَا يُؤْذَيْنَ" اور مشتبہ چال چلن کے لوگ اس سے تعرّض کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ (تفسیر بیضاوی، ج ۴، ص: ۱۶۸)

اِن اقوال سے ظاہر ہے کہ صحابہؓ کرام کے مبارک دور سے لے کر آٹھویں صدی تک ہر زمانہ میں اس آیت کا ایک ہی مفہوم سمجھا گیا ہے، اور وہ مفہوم وہی ہے جو اُس کے الفاظ سے ہم نے سمجھا ہے۔ اس کے بعد احادیث کی طرف رجوع کیجیے تو وہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد سے عہدِ نبوی میں عام طور پر مسلمان عورتیں اپنے چہروں پر نقاب ڈالنے لگی

(۱) عورت اصطلاح میں جسم کے اس حصّہ کو کہتے ہیں جس کو بیوی یا شوہر کے سوا ہر ایک سے چھپانے کا حکم ہے۔ مرد کے جسم کا بھی وہ حصّہ جو ناف اور گھٹنے کے درمیان ہے اس معنی میں عورت ہی ہے۔

تھیں، اور کھلے چہروں کے ساتھ پھرنے کا رواج بند ہوگیا تھا۔ ابوداؤد، ترمذی، مؤطا اور دوسری کتبِ حدیث میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عورتوں کو حالتِ احرام میں چہروں پر نقاب ڈالنے اور دستانے پہننے سے منع فرمایا تھا "المحرمة لاتنتقب و لاتلبس القفازين و نهى النساء فی احرامهن عن القفازين و النقاب" اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اس عہدِ مبارک میں چہروں کو چھپانے کے لیے نقاب اور ہاتھوں کو چھپانے کے لیے دستانوں کا عام رواج ہو چکا تھا۔ صرف احرام کی حالت میں اس سے منع کیا گیا مگر اس سے بھی یہ مقصد نہ تھا کہ حج میں چہرے منظرِ عام پر پیش کیے جائیں۔ بلکہ دراصل مقصد یہ تھا کہ احرام کی فقیرانہ وضع میں نقاب عورت کے لباس کا جز نہ ہو، جس طرح عام طور پر رہتا ہے۔ چنانچہ دوسری احادیث میں تصریح کی گئی ہے کہ حالتِ احرام میں بھی ازواجِ مطہرات اور عام خواتینِ اسلام نقاب کے بغیر اپنے چہروں کو اجانب سے چھپاتی تھیں۔ ابوداؤد میں ہے:

عن عائشة قالت كان الركبان يمرون بناونحن مع رسول الله ﷺ محرمات فاذا حاذوا بنا سدلت احدانا جلبابها من رأسها علي وجهها فاذا جاوزونا كشفناه. (باب فی المحرمة تغطی وجهها)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سوار ہمارے قریب سے گزرتے تھے اور ہم عورتیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حالتِ احرام میں ہوتی تھیں۔ پس جب وہ لوگ ہمارے سامنے آجاتے تو ہم اپنی چادریں اپنے سروں کی طرف سے اپنے چہروں پر ڈال لیتیں اور جب وہ گزر جاتے تو منہ کھول لیتی تھیں۔

مؤطا امام مالک میں ہے:

عن فاطمة بنت المنذر قالت كنا نخمر وجوهنا و نحن محرمات ونحن مع اسماء بنت ابى بكر الصديقؓ فلا تنكره علينا. (باب تخمير المحرم وجهه)

فاطمہؒ بنت منذر کا بیان ہے کہ ہم حالتِ احرام میں اپنے چہروں پر کپڑا ڈال لیا کرتی تھیں۔ ہمارے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ تھیں۔ انہوں نے ہم کو

اس سے منع نہیں کیا۔ (یعنی انہوں نے یہ نہیں کہا کہ احرام کی حالت میں نقاب استعمال کرنے کی جو ممانعت ہے اس کا اطلاق ہمارے اس فعل پر بھی ہوتا ہے)۔

فتح الباری، کتاب الحج میں حضرت عائشہؓ کی ایک روایت ہے:

تسدل المرأة جلبابها من فوق رأسها علىٰ وجهها.

عورت حالتِ احرام میں اپنی چادر اپنے سر پر سے چہرے پر لٹکا لیا کرے۔

نقاب

جو شخص آیتِ قرآنی کے الفاظ اور ان کی مقبول عام اور متفق علیہ تفسیر، اور عہدِ نبویؐ کے تعامل کو دیکھے گا اس کے لیے اس حقیقت سے انکار کی مجال باقی نہ رہے گی کہ شریعتِ اسلامیہ میں عورت کے لیے چہرے کو اجانب سے مستور رکھنے کا حکم ہے، اور اس پر خود نبی ﷺ کے زمانے سے عمل کیا جا رہا ہے۔ نقاب اگر لفظاً نہیں تو معناً وحقیقتاً خود قرآن کریم کی تجویز کردہ چیز ہے۔ جس ذات مقدس پر قرآن نازل ہوا تھا اُس کی آنکھوں کے سامنے خواتینِ اسلام نے اس چیز کو اپنے خارج البیت لباس کا جز بنایا تھا، اور اس زمانے میں بھی اس چیز کا نام ''نقاب'' ہی تھا۔

جی ہاں! یہ وہی ''نقاب'' (Veil) ہے جس کو یورپ انتہا درجہ کی مکروہ اور گھناؤنی چیز سمجھتا ہے، جس کا محض تصور ہی فرنگی ضمیر پر ایک بارِ گراں ہے، جس کو ظلم اور تنگ خیالی اور وحشت کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ ہاں یہ وہی چیز ہے جس کا نام کسی مشرقی قوم کی جہالت اور تمدنی پسماندگی کے ذکر میں سب سے پہلے لیا جاتا ہے، اور جب یہ بیان کرنا ہوتا ہے کہ کوئی مشرقی قوم تمدّن وتہذیب میں ترقی کر رہی ہے تو سب سے پہلے جس بات کا ذکر بڑے انشراح اور انبساط کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ اس قوم سے ''نقاب'' رخصت ہوگئی۔ اب شرم سے سر جھکا لیجیے کہ یہ چیز بعد کی ایجاد نہیں، خود قرآن نے اس کو ایجاد کیا ہے، اور محمد ﷺ اس کو رائج کر گئے ہیں۔ مگر محض سر جھکانے سے کام نہ چلے گا۔ شتر مرغ اگر شکاری کو دیکھ کر ریت میں سر چھپا لے تو شکاری کا وجود باطل نہیں ہو جاتا۔ آپ بھی اپنا سر جھکائیں گے تو ضرور جھک جائے گا، مگر قرآن کی آیت نہ مٹے گی، نہ تاریخ سے ثابت شدہ واقعات محو ہو جائیں گے۔ تاویلات سے اس پر پردہ ڈالیے گا تو یہ ''شرم کا داغ'' اور زیادہ چمک اٹھے گا۔ جب وحیِ مغربی پر ایمان لا کر آپ اس کو ''شرم کا داغ''

مان ہی چکے ہیں تو اس کو دُور کرنے کی اب ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ اُس اسلام ہی سے اپنی براءت کا اعلان فرما دیں جو نقاب، گھونگھٹ، سترِ وجوہ جیسی ''گھناؤنی'' چیز کا حکم دیتا ہے۔ آپ ہیں ترقی کے ''خواہش مند''، آپ کو درکار ہے ''تہذیب''، آپ کے لیے وہ مذہب کیسے قابلِ اتباع ہو جو خواتین کو شمعِ انجمن بننے سے روکتا ہو، حیا اور پردہ داری اور عفت مآبی کی تعلیم دیتا ہو، گھر کی ملکہ کو اہلِ خانہ کے سوا ہر ایک کے لیے قرۃ العین بننے سے منع کرتا ہو۔ بھلا ایسے مذہب میں ''ترقی'' کہاں! ایسے مذہب کو ''تہذیب'' سے کیا واسطہ! ''ترقی'' اور ''تہذیب'' کے لیے تو ضروری ہے کہ عورت —— نہیں، لیڈی صاحبہ —— باہر نکلنے سے پہلے دو گھنٹے تک تمام مشاغل سے دست کش ہو کر صرف اپنی تزئین و آرائش میں مشغول ہو جائیں، تمام جسم کو معطّر کریں، رنگ اور وضع کی مناسبت سے انتہا درجہ کا جاذبِ نظر لباس زیبِ تن فرمائیں۔ مختلف قسم کے غازوں سے چہرے اور بانہوں کی تنویر بڑھائیں، ہونٹوں کو لپ اسٹک سے مزیّن کریں، کمانِ ابرو کو درست اور آنکھوں کو تیر اندازی کے لیے چست کر لیں، اور ان سب کرشموں سے مسلح ہو کر گھر سے باہر نکلیں تو شان یہ ہو کہ ہر کرشمہ دامنِ دل کو کھینچ کھینچ کر ''جا ایں جا است'' کی صدا لگا رہا ہو! پھر اس سے بھی ذوقِ خود آرائی کی تسکین نہ ہو، آئینہ اور سنگھار کا سامان ہر وقت ساتھ رہے، تا کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسبابِ زینت کے خفیف ترین نقصانات کی بھی تلافی کی جاتی رہے۔

جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں، اسلام اور مغربی تہذیب کے مقاصد میں بُعد المشرقین ہے، اور وہ شخص سخت غلطی کرتا ہے جو مغربی نقطۂ نظر سے اسلامی احکام کی تعبیر کرتا ہے۔ مغرب میں اشیاء کی قدر و قیمت کا جو معیار ہے، اسلام کا معیار بالکل اس سے مختلف ہے۔ مغرب جن چیزوں کو نہایت اہم اور مقصودِ حیات سمجھتا ہے، اسلام کی نگاہ میں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ اور اسلام جن چیزوں کو اہمیت دیتا ہے، مغرب کی نگاہ میں وہ بالکل بے قیمت ہے۔ اب جو شخص مغربی معیار کا قائل ہے، اس کو تو اسلام کی ہر چیز قابلِ ترمیم ہی نظر آئے گی۔ وہ اسلامی احکام کی تعبیر کرنے بیٹھے گا تو ان کی تحریف کر ڈالے گا، اور تحریف کے بعد بھی ان کو اپنی زندگی میں کسی طرح نصب نہ کر سکے گا۔ کیوں کہ قدم قدم پر قرآن و سنّت کی تصریحات اس کی مزاحمت کریں گی۔ ایسے شخص کو عملی طریقوں کے جزئیات پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ جن مقاصد کے لیے ان

طریقوں کو اختیار کیا گیا ہے وہ خود کہاں تک قابلِ قبول ہیں۔ اگر وہ مقاصد ہی سے اتفاق نہیں رکھتا تو حصولِ مقاصد کے طریقوں پر بحث کرنے اور اُن کو مسخ ومحرّف کرنے کی فضول زحمت کیوں اٹھائے؟ کیوں نہ اس مذہب ہی کو چھوڑ دے جس کے مقاصد کو وہ غلط سمجھتا ہے؟ اور اگر اسے مقاصد سے اتفاق ہے تو بحث صرف اس میں رہ جاتی ہے کہ ان مقاصد کے لیے جو عملی طریقے تجویز کیے گئے ہیں وہ مناسب ہیں یا نامناسب، اور اس بحث کو آسانی طے کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ طریقہ صرف شریف لوگ ہی اختیار کرسکتے ہیں۔ رہے منافقین، تو وہ خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوقات میں سب سے ارذل مخلوق ہیں۔ ان کو یہی زیب دیتا ہے کہ دعویٰ ایک چیز پر اعتقاد رکھنے کا کریں اور درحقیقت اعتقاد دوسری چیز پر رکھیں۔

نقاب اور برقع کے مسئلے میں جس قدر بحثیں بھی کی جارہی ہیں وہ دراصل اسی نفاق پر مبنی ہیں۔ ایڑی سے چوٹی تک کا زور یہ ثابت کرنے میں صرف کیا گیا ہے کہ پردے کی یہ صورت اسلام سے پہلے کی قوموں میں رائج تھی اور جاہلیت کی یہ میراث عہدِ نبوی کے بہت مدّت بعد مسلمانوں میں تقسیم ہوئی۔ قرآن کی ایک صریح آیت اور عہدِ نبوی کے ثابت شدہ تعامل اور صحابہ و تابعین کی تشریحات کے مقابلے میں تاریخی تحقیقات کی یہ زحمت آخر کیوں اٹھائی گئی؟ صرف اس لیے کہ زندگی کے وہ مقاصد پیشِ نظر تھے اور ہیں جو مغرب میں مقبولِ عام ہیں۔ ''ترقی'' اور ''تہذیب'' کے وہ تصوّرات ذہن نشین ہوگئے ہیں جو اہلِ مغرب سے نقل کیے گئے ہیں۔ چوں کہ برقع اوڑھنا اور نقاب ڈالنا اُن مقاصد کے خلاف ہے اور اُن تصورات سے کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ لہٰذا تاریخی تحقیق کے زور سے اس چیز کو مٹانے کی کوشش کی گئی جو اسلام کی کتابِ آئین میں ثبت ہے۔ یہ کھلی ہوئی منافقت جو بہت سے مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی برتی گئی ہے، اس کی اصل وجہ وہی بے اصولی اور عقل کی خفّت اور اخلاقی جرأت کی کمی ہے، جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتباعِ اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود قرآن کے مقابلے میں تاریخ کو لاکر کھڑا کرنے کا خیال بھی اُن کے ذہن میں نہ آتا۔ یا تو یہ اپنے مقاصد کو اسلام کے مقاصد سے بدل ڈالتے (اگر مسلمان رہنا چاہتے) یا علانیہ اس مذہب سے الگ ہوجاتے جو ان کے معیارِ ترقی کے لحاظ سے مانعِ ترقی ہے۔

جو شخص اسلامی قانون کے مقاصد کو سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ کچھ عقلِ عام (Common Sense) بھی رکھتا ہے اس کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ عورتوں کو کھلے چہروں کے ساتھ باہر پھرنے کی عام اجازت دینا اُن مقاصد کے بالکل خلاف ہے جن کو اسلام اس قدر اہمیت دے رہا ہے۔ ایک انسان کو دوسرے انسان کی جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اس کا چہرہ ہی تو ہے۔ انسان کی خلقی و پیدائشی زینت یا دوسرے الفاظ میں انسانی حُسن کا سب سے بڑا مظہر چہرہ ہے۔ نگاہوں کو سب سے زیادہ وہی کھینچتا ہے۔ جذبات کو سب سے زیادہ وہی اپیل کرتا ہے۔ صنفی جذب و انجذاب کا سب سے زیادہ قوی ایجنٹ وہی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے نفسیات کے کسی گہرے علم کی بھی ضرورت نہیں۔ خود اپنے دل کو ٹٹو لیے۔ اپنی آنکھوں سے فتویٰ طلب کیجیے اپنے نفسی تجربات کا جائزہ لے کر دیکھ لیجیے۔ منافقت کی بات تو دوسری ہے۔ منافق اگر آفتاب کے وجود کو بھی اپنے مقصد کے خلاف دیکھے گا تو دن دہاڑے کہہ دے گا کہ آفتاب موجود نہیں۔ البتہ صداقت سے کام لیجیے گا تو آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ صنفی تحریک (Sex Appeal) میں جسم کی ساری زینتوں سے زیادہ حصہ اس فطری زینت کا ہے جو اللہ نے چہرے کی ساخت میں رکھی ہے۔ اگر آپ کو کسی لڑکی سے شادی کرنی ہو اور آپ اسے دیکھ کر آخری فیصلہ کرنا چاہتے ہوں تو سچ بتایئے کہ کیا دیکھ کر آپ فیصلہ کریں گے؟ ایک شکل اس کے دیکھنے کی یہ ہو سکتی ہے کہ چہرہ کے سوا وہ پوری کی پوری آپ کے سامنے ہو۔ دوسری یہ ہو سکتی ہے کہ ایک جھروکے میں سے وہ صرف اپنا چہرہ دکھا دے۔ بتایئے کہ دونوں شکلوں میں سے کون سی شکل کو آپ ترجیح دیں گے؟ سچ بتایئے کیا سارے جسم کی بہ نسبت چہرہ کا حسن آپ کی نگاہ میں اہم ترین نہیں ہے؟

اس حقیقت کے مسلّم ہو جانے کے بعد آگے بڑھیے۔ اگر سوسائٹی میں صنفی انتشار اور لامرکزی ہیجانات و تحریکات کو روکنا مقصود ہی نہ ہو، تب تو چہرہ کیا معنی، سینہ اور بازو اور پنڈلیاں اور رانیں سب ہی کچھ کھول دینے کی آزادی ہونی چاہیے جیسی کہ اس وقت مغربی تہذیب میں ہے۔ اس صورت میں ان حدود و قیود کی کوئی ضرورت ہی نہیں جو اسلامی قانونِ حجاب کے سلسلے میں آپ اوپر سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن اگر اصل مقصد اسی طوفان کو روکنا ہو تو اس سے

زیادہ خلافِ حکمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو روکنے کے لیے چھوٹے چھوٹے دروازوں پر تو کنڈیاں چڑھائی جائیں اور سب سے بڑے دروازے کو چوپٹ کھلا چھوڑ دیا جائے۔

اب آپ سوال کر سکتے ہیں کہ ایسا ہے تو اسلام نے ناگزیر حاجات وضروریات کے لیے چہرہ کھولنے کی اجازت کیوں دی، جیسا کہ تم خود پہلے بیان کر چکے ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کا قانون کوئی غیر معتدل اور ایک رُخا قانون نہیں ہے۔ وہ ایک طرف مصالحِ اخلاق کا لحاظ کرتا ہے تو دوسری طرف انسان کی حقیقی ضرورتوں کا بھی لحاظ کرتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اس نے غایت درجہ کا تناسب اور توازن قائم کیا ہے۔ وہ اخلاقی فتنوں کا سدّ باب بھی کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کے ساتھ کسی انسان پر ایسی پابندیاں بھی عائد کرنا نہیں چاہتا جن کے باعث وہ اپنی حقیقی ضروریات کو پورا نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے عورت کے لیے چہرے اور ہاتھ کے باب میں ویسے قطعی احکام نہیں دیے جیسے ستر پوشی اور اخفائے زینت کے باب میں دیے ہیں کیوں کہ ستر پوشی اور اخفائے زینت سے ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا، مگر چہرے اور ہاتھوں کو دائماً چھپائے رہنے سے عورتوں کو اپنی حاجات میں سخت مشکل پیش آ سکتی ہے۔ پس عورتوں کے لیے عام قاعدہ یہ مقرر کیا گیا کہ چہرہ پر نقاب یا گھونگھٹ ڈالے رہیں اور اس قاعدہ میں ''اِلَّا مَاظَھَرَ مِنْھَا'' کے استثنا سے یہ آسانی پیدا کر دی گئی کہ اگر حقیقت میں چہرہ کھولنے کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ اس کو کھول سکتی ہیں بشرطیکہ نمایشِ حسن مقصود نہ ہو، بلکہ رفعِ ضرورت مدّ نظر ہو۔

پھر دوسری جانب سے فتنہ انگیزی کے جو خطرات تھے اُن کا سدِّ باب اس طرح کیا گیا کہ مردوں کو غضِ بصر کا حکم دے دیا گیا تاکہ اگر کوئی عفت مآب عورت اپنی حاجات کے لیے چہرہ کھولے تو وہ اپنی نظریں نیچی کر لیں اور بیہودگی کے ساتھ اس کو گھورنے سے باز رہیں۔

پردہ داری کے ان احکام پر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلامی پردہ کوئی جاہلی رسم نہیں بلکہ ایک عقلی قانون ہے۔ جاہلی رسم ایک جامد چیز ہوتی ہے۔ جو طریقہ جس صورت سے رائج ہو گیا کسی حال میں اس کے اندر تغیّر نہیں کیا جا سکتا۔ جو چیز چھپا دی گئی وہ بس ہمیشہ کے لیے چھپا دی گئی۔ اب مرتے مر جائیں مگر اس کا کھلنا غیر ممکن۔ بہ خلاف اس کے عقلی

قانون میں لچک ہوتی ہے۔ اس میں احوال کے لحاظ سے شدّت اور تخفیف کی گنجایش ہوتی ہے۔ موقع و محل کے اعتبار سے اس کے عام قواعد میں استثنائی صورتیں رکھی جاتی ہیں۔ ایسے قانون کی پیروی اندھوں کی طرح نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے عقل اور تمیز کی ضرورت ہے۔ سمجھ بوجھ رکھنے والا پیرو خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ کہاں اس کو عام قاعدے کی پیروی کرنی چاہیے، اور کہاں قانون کے نقطۂ نظر سے ''حقیقی ضرورت'' درپیش ہے۔ جس میں استثنائی رخصتوں سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ پھر وہ خود ہی یہ رائے بھی قائم کرسکتا ہے کہ کس محل پر رخصت سے کس حد تک استفادہ کیا جائے، اور استفادہ کی صورت میں مقصدِ قانون کو کس طرح ملحوظ رکھا جائے۔ ان تمام امور میں درحقیقت ایک نیک نیت مومن کا قلب ہی سچا مفتی بن سکتا ہے، جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ''استفت قلبك'' اور ''دع ماحاك فی صدرك'' (اپنے دل سے فتویٰ طلب کرو اور جو چیز دل میں کھٹکے اس کو چھوڑ دو) یہی وجہ ہے کہ اسلام کی صحیح پیروی جہالت اور ناسمجھی کے ساتھ نہیں ہوسکتی۔ یہ عقلی قانون ہے اور اس کی پیروی کے لیے قدم قدم پر شعور اور فہم کی ضرورت ہے۔

باب ۱۳ :

باہر نکلنے کے قوانین

لباس اور ستر کے حدود مقرر کرنے کے بعد آخری حکم جو عورتوں کو دیا گیا ہے وہ یہ ہے:

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّةِ الْاُوْلٰی.

(الاحزاب:۳۳)

اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھی رہو اور زمانۂ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو۔

وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِھِنَّ لِیُعْلَمَ مَایُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِھِنَّ ط (النور:۳۱)

اور اپنے پاؤں زمین پر اس طرح مارتی ہوئی نہ چلیں کہ جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے وہ معلوم ہو جائے۔

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِہٖ مَرَضٌ. (الاحزاب:۳۲)

پس دبی زبان سے بات نہ کرو کہ جس شخص کے دل میں مرض ہو وہ طمع میں مبتلا ہو جائے۔

''وَقَرْنَ'' کی قرأت میں اختلاف ہے۔ عام قراءِ مدینہ اور بعض کوفیوں نے اس کو وَقَرْنَ بفتح قاف پڑھا ہے جس کا مصدر 'قرار' ہے۔ اس لحاظ سے ترجمہ یہ ہوگا کہ ''اپنے گھروں میں ٹھہری رہو یا جمی بیٹھی رہو۔'' عام قراءِ بصرہ و کوفہ نے ''وَقِرْنَ'' بکسرِ قاف پڑھا ہے جس کا مصدر وقار ہے۔ اس لحاظ سے معنی یہ ہوں گے کہ ''اپنے گھروں میں وقار اور سکینت کے ساتھ رہو۔''

تبرُّج کے دو معنی ہیں۔ ایک زینت اور محاسن کا اظہار۔ دوسرے چلنے میں ناز و انداز دکھانا۔ تبختر کرتے ہوئے چلنا، اٹھلانا، لچکے کھانا، جسم کو توڑنا، ایسی چال اختیار کرنا جس میں ایک

ادا پائی جاتی ہو۔ آیت میں یہ دونوں معنی مراد ہیں۔ جاہلیتِ اولیٰ میں عورتیں خوب بن سنور کر نکلتی تھیں جس طرح دورِ جدید کی جاہلیت میں نکل رہی ہیں۔ پھر چال بھی قصداً ایسی اختیار کی جاتی تھی کہ ہر قدم زمین پر نہیں بلکہ دیکھنے والوں کے دلوں پر پڑے۔ مشہور تابعی و مفسّرِ قرآن قتادہ بن دعامہ کہتے ہیں کہ کانت لهن مشية و تكسُر و تغنج فنهاهن الله عن ذالك۔

اس کیفیت کو سمجھنے کے لیے کسی تاریخی بیان کی حاجت نہیں۔ کسی ایسی سوسائٹی میں تشریف لے جائیے جہاں مغربی وضع کی خواتین تشریف لاتی ہوں، جاہلیتِ اولیٰ کی تبرّج والی چال آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اسلام اسی سے منع کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے اوّل تو تمہاری صحیح جائے قیام تمہارا گھر ہے۔ بیرونِ خانہ کی ذمے داریوں سے تم کو اسی لیے سبکدوش کیا گیا ہے کہ تم سکون و وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں رہو اور خانگی زندگی کے فرائض ادا کرو۔ تاہم اگر ضرورت پیش آئے تو گھر سے باہر نکلنا بھی تمہارے لیے جائز ہے۔ لیکن نکلتے وقت پوری عصمت مآبی ملحوظ رکھو۔ نہ تمہارے لباس میں کوئی شان اور بھڑک ہونی چاہیے کہ چلتے چلتے کبھی چہرے کی جھلک دکھاؤ اور کبھی ہاتھوں کی نمایش کرو۔ نہ چال میں کوئی خاص ادا پیدا کرنی چاہیے کہ نگاہوں کو خود بہ خود تمہاری طرف متوجہ کردے۔ ایسے زیور بھی پہن کر نہ نکلو جن کی جھنکار غیروں کے لیے سامعہ نواز ہو۔ قصداً لوگوں کو سنانے کے لیے آواز نہ نکالو۔ ہاں اگر بولنے کی ضرورت پیش آئے تو بولو۔ مگر رس بھری آواز نکالنے کی کوشش نہ کرو۔ ان قواعد اور حدود کو ملحوظ رکھ کر اپنی حاجات کے لیے تم گھر سے باہر نکل سکتی ہو۔

یہ ہے قرآن کی تعلیم۔ آیئے اب حدیث پر نظر ڈال کر دیکھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعلیم کے مطابق سوسائٹی میں عورتوں کے لیے کیا طریقے مقرر فرمائے تھے اور صحابۂ کرامؓ اور اُن کی خواتین نے اُن پر کس طرح عمل کیا۔

حاجات کے لیے گھر سے نکلنے کی اجازت

حدیث میں ہے کہ احکامِ حجاب نازل ہونے سے پہلے حضرت عمرؓ کا تقاضا تھا کہ یارسول اللہ اپنی خواتین کو پردہ کرایئے۔ ایک مرتبہ امّ المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رات کے وقت باہر نکلیں تو حضرت عمرؓ نے ان کو دیکھ لیا اور پکار کر کہا کہ سودہ! ہم نے تم کو پہچان لیا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا

کہ کسی طرح خواتین کا گھروں سے نکلنا ممنوع ہو جائے۔ اس کے بعد جب احکامِ حجاب نازل ہوئے تو حضرت عمرؓ کی بن آئی۔ انہوں نے عورتوں کے باہر نکلنے پر زیادہ روک ٹوک شروع کر دی۔ ایک مرتبہ پھر حضرت سودہؓ کے ساتھ وہی صورت پیش آئی۔ وہ گھر سے نکلیں اور حضرت عمرؓ نے ان کو ٹوکا۔ انہوں نے آنحضرتؐ سے شکایت کی۔ حضورؐ نے فرمایا: قد اذن اللّٰہ لکن ان تخرجن لحوائجکن (اللہ نے تم کو اپنی ضروریات کے لیے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے[1])۔

اس سے معلوم ہوا کہ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ کے حکمِ قرآنی کا منشا یہ نہیں ہے کہ عورتیں گھر کے حدود سے قدم کبھی باہر نکالیں ہی نہیں۔ حاجات وضروریات کے لیے اُن کو نکلنے کی پوری اجازت ہے، مگر یہ اجازت نہ غیر مشروط ہے نہ غیر محدود۔ عورتیں اس کی مجاز نہیں ہیں کہ آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں پھریں اور مردانہ اجتماعات میں گھل مل جائیں۔ حاجات وضروریات سے شریعت کی مراد ایسی واقعی حاجات وضروریات ہیں جن میں درحقیقت نکلنا اور باہر کا کام کرنا عورتوں کے لیے ناگزیر ہو۔ اب یہ ظاہر ہے کہ تمام عورتوں کے لیے تمام زمانوں میں نکلنے اور نہ نکلنے کی ایک ایک صورت بیان کرنا اور ہر ہر موقع کے لیے رخصت کے علیحدہ علیحدہ حدود مقرر کر دینا ممکن نہیں ہے۔ البتہ شارع نے زندگی کے عام حالات میں عورتوں کے لیے نکلنے کے جو قاعدے مقرر کیے تھے اور حجاب کے حدود میں جس طرح کمی وبیشی کی تھی اس سے قانونِ اسلامی کی اسپرٹ اور اس کے رجحان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اس کو سمجھ کر انفرادی حالات اور جزئی معاملات میں حجاب کے حدود اور موقع ومحل کے لحاظ سے ان کی کمی وبیشی کے اصول ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے۔ اس کی توضیح کے لیے ہم مثال کے طور پر چند مسائل بیان کرتے ہیں۔

مسجد میں آنے کی اجازت اور اس کے حدود

یہ معلوم ہے کہ اسلام میں سب سے اہم فرض نماز ہے اور نماز میں حضورِ مسجد اور شرکت جماعت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ مگر نماز باجماعت کے باب میں جو احکام مردوں کے لیے ہیں اُن کے بالکل برعکس احکام عورتوں کے لیے ہیں۔ مردوں کے لیے وہ نماز افضل ہے جو مسجد میں

---

(۱) یہ متعدد احادیث کا لب لباب ہے، ملاحظہ ہو۔ مسلم، باب اباحة الخروج للنساء لقضاء حاجته الانسان۔ بخاری، باب خروج النساء لحوائجهن و باب آية الحجاب۔

جماعت کے ساتھ ہو، اور عورتوں کے لیے وہ نماز افضل ہے جو گھر میں انتہائی خلوت کی حالت میں ہو۔ امام احمد اور طبرانی نے امّ حمید ساعدیہؓ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ:

قالت یا رسول اللّٰہ انی احب الصلٰوۃ معک قال قد علمت صلوتُک فی بیتک خیرلک من صلٰوتک فی حجرتک و صلوتک فی حجرتکِ خیر من صلٰوتک فی دارک و صلٰوتک فی دارک خیر من صلوتک فی مسجد قومک و صلٰوتک فی مسجد قومک خیر من صلٰوتک فی مسجد الجمعۃ.

انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ نماز پڑھوں۔ حضورؐ نے فرمایا: مجھے معلوم ہے، مگر تیرا ایک گوشے میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تو اپنے کمرے میں نماز پڑھے، اور کمرے میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تو اپنے گھر کے دالان میں نماز پڑھے اور تیرا دالان میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تو اپنے محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھے اور تیرا اپنے محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ مسجد جامع میں نماز پڑھے۔[1]

اس مضمون کی حدیث ابوداؤد میں ابنِ مسعودؓ سے منقول ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا:

صلٰوۃ المرأۃ فی بیتھا افضل من صلٰوتھا فِی حجرتھا و صلٰوتھا فی مخدعھا افضل من صلٰوتھا فی بیتھا. (باب ماجاء خروج النساء الی المساجد)

---

(۱) عورت کے اس قدر خلوت میں نماز پڑھنے کی ہدایت جس مصلحت سے دی گئی ہے اس کو خود عورتیں زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ مہینہ میں چند روز ایسے آتے ہیں جن میں عورت کو مجبوراً نماز ترک کرنی پڑتی ہے اور اس طرح وہ بات ظاہر ہو جاتی ہے جسے کوئی حیادار عورت اپنے بھائی بہنوں پر بھی ظاہر کرنا پسند نہیں کرتی۔ بہت سی عورتیں اسی شرم کی وجہ سے تارکِ صلٰوۃ ہو جاتی ہیں۔ شارع نے اس بات کو محسوس کر کے ہدایت فرمائی کہ چھپ کر خلوت کے ایک گوشہ میں نماز پڑھا کرو تا کہ کسی کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ تم کب نماز پڑھتی ہو اور کب چھوڑ دیتی ہو۔ مگر یہ صرف ہدایت ہے۔ تاکید اور حکم نہیں ہے۔ عورتیں گھر میں اپنی الگ جماعت کر سکتی ہیں۔ اور عورت اُن کی امامت کر سکتی ہے۔ امّ ورقہ بنت نوفل کو آنحضرت ﷺ نے اجازت دی تھی کہ عورتوں کی امامت کریں (ابوداؤد) دارقطنی اور بیہقی کی روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عورتوں کی امامت کی اور صف کے بیچ میں کھڑے ہو کر نماز پڑھائی۔ اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت جب عورتوں کی جماعت کو نماز پڑھائے تو اسے مرد امام کی طرح صف کے آگے نہیں بلکہ صف کے درمیان میں کھڑا ہونا چاہیے۔

عورت کا اپنی کوٹھری میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے کمرے میں نماز پڑھے۔
اور اس کا اپنے چور خانہ میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنی کوٹھری میں نماز پڑھے۔

دیکھیے، یہاں ترتیب بالکل الٹ گئی ہے۔ مرد کے لیے سب سے ادنیٰ درجہ کی نماز یہ ہے کہ وہ ایک گوشۂ تنہائی میں پڑھے، اور سب سے افضل یہ کہ وہ بڑی سے بڑی جماعت میں شریک ہو۔ مگر عورت کے لیے اس کے برعکس انتہائی خلوت کی نماز میں فضیلت ہے اور اس خفیہ نماز کو نہ صرف نماز با جماعت پر ترجیح دی گئی ہے، بلکہ اُس نماز سے بھی افضل کہا گیا ہے جس سے بڑھ کر کوئی نعمت مسلمان کے لیے ہو ہی نہیں سکتی تھی، یعنی مسجدِ نبوی کی جماعت۔ جس کے امام خود امام الانبیاء محمد ﷺ تھے۔ آخر اس فرق و امتیاز کی وجہ کیا ہے؟ یہی نا کہ شارع نے عورت کے باہر نکلنے کو پسند نہیں کیا۔ اور جماعت میں ذکور واناث کے خلط مَلط ہونے کو روکنا چاہا۔

مگر نماز ایک مقدس عبادت ہے، اور مسجد ایک پاک مقام ہے۔ شارعِ حکیم نے اختلاطِ صنفین کو روکنے کے لیے اپنے منشا کا اظہار تو فضیلت اور عدمِ فضیلت کی تفریق سے کر دیا مگر ایسے پاکیزہ کام کے لیے ایسی پاک جگہ آنے سے عورتوں کو منع نہیں کیا۔ حدیث میں یہ اجازت جن الفاظ کے ساتھ آئی ہے وہ شارع کی بے نظیر حکیمانہ شان پر دلالت کرتے ہیں۔ فرمایا:

لاتمنعوا اِماء اللہ مساجد اللہ اذا استاذنت امرأۃ احدکم الی المسجد فلایمنعھا. (بخاری و مسلم)

خدا کی لونڈیوں کو خدا کی مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو۔ جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد جانے کی اجازت مانگے تو وہ اس کو منع نہ کرے۔

لاتمنعوا نساءکم المساجد و بیوتھن خیر لھن. (ابو دائود)

اپنی عورتوں کو مسجدوں سے نہ روکو۔ مگر ان کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں۔

یہ الفاظ خود ظاہر کر رہے ہیں کہ شارع عورتوں کو مسجد میں جانے سے روکتا تو نہیں ہے، کیوں کہ مسجد میں نماز کے لیے جانا کوئی برا فعل نہیں جس کو ناجائز قرار دیا جا سکے۔ مگر مصالح اس کے بھی مقتضی نہیں کہ مساجد میں ذکور واناث کی جماعت مخلوط ہو جائے۔ لہٰذا اُن کو آنے کی اجازت تو دے دی، مگر یہ نہیں فرمایا کہ اپنی عورتوں کو مسجدوں میں بھیجو، یا اپنے ساتھ لایا کرو، بلکہ صرف یہ کہا

کہ اگر وہ افضل نماز کو چھوڑ کر ادنیٰ درجہ کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں آنا ہی چاہیں اور اجازت مانگیں تو منع نہ کرو۔ حضرت عمرؓ جو روحِ اسلام کے بڑے راز داں تھے، شارع کی اس حکمت کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ مؤطا میں مذکور ہے کہ ان کی بیوی عاتکہ بنت زید سے ہمیشہ اس معاملہ میں ان کی کشمکش رہا کرتی تھی۔ حضرت عمرؓ نہ چاہتے تھے کہ وہ مسجد میں جائیں مگر انہیں جانے پر اصرار تھا۔ وہ اجازت مانگتیں تو آپ ٹھیک ٹھیک حکمِ نبوی پر عمل کر کے بس خاموش ہو جاتے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں روکتے نہیں ہیں، مگر صاف صاف اجازت بھی نہ دیں گے۔ وہ بھی اپنی بات کی پکّی تھیں۔ کہا کرتی تھیں کہ خدا کی قسم میں جاتی رہوں گی جب تک کہ آپ صاف الفاظ میں منع نہیں کریں گے۔[1]

مسجد میں آنے کی شرائط

حضورِ مساجد کی اجازت دینے کے ساتھ چند شرائط بھی مقرر کر دی گئیں۔ ان میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ دن کے اوقات میں مسجد نہ جائیں۔ بلکہ صرف ان نمازوں میں شریک ہوں جو اندھیرے میں پڑھی جاتی ہیں۔ یعنی عشا اور فجر:

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ ائذنوا للنساء باللیل الی المساجد.[2]

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: عورتوں کو رات کے وقت مسجدوں میں آنے دو۔

قال نافع مولی ابن عمر و کان اختصاص اللیل بذالک لکونہ استر و اخفیٰ.

حضرت ابن عمرؓ کے شاگرد خاص حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ رات کی تخصیص اس لیے کی کہ رات کی تاریکی میں اچھی طرح پردہ داری ہو سکتی ہے۔

---

(۱) یہ حال صرف عمرؓ ہی کی بیوی کا نہ تھا بلکہ عہدِ نبوی میں بکثرت عورتیں نماز باجماعت کے لیے مسجد جایا کرتی تھیں۔ ابوداؤد میں ہے کہ مسجدِ نبوی میں بسا اوقات عورتوں کی دو دو صفیں ہو جاتی تھیں۔
(باب مایکرہ من ذکر الرجل مایکون من اصابۃ اھلہ)

(۲) ترمذی، باب خروج النساء الی المسجد۔ و فی ھذا المعنی حدیث اخرجہ البخاری فی باب خروج النساء الی المساجد باللیل و الغلس

عن عائشة قالت کان رسول اللہ ﷺ لیصلی الصبح فینصرف النساء متلففات بمروطهن مایعرفن من الغلس۔(۱)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز ایسے وقت پڑھتے تھے کہ جب عورتیں نماز کے بعد اپنی اوڑھنیوں میں لپٹی ہوئی مسجد سے پلٹتیں تو تاریکی کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی تھیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مسجد میں زینت کے ساتھ نہ آئیں اور نہ خوشبو لگا کر آئیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضورؐ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ قبیلہ مزینہ کی ایک بہت بنی سنوری ہوئی عورت بڑے ناز و تبختر کے ساتھ مسجد میں آئی۔ حضورؐ نے فرمایا، لوگو! اپنی عورتوں کو زینت اور تبختر کے ساتھ مسجد میں آنے سے روکو۔(۲) خوشبو کے متعلق فرمایا کہ جس رات تم کو نماز میں شریک ہونا ہو، اس رات کو کسی قسم کا عطر لگا کر نہ آؤ، نہ بخور استعمال کرو۔ بالکل سادہ لباس میں آؤ۔ جو عورت خوشبو لگا کر آئے گی اس کی نماز نہ ہوگی۔(۳)

تیسری شرط یہ ہے کہ عورتیں جماعت میں مردوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہوں اور نہ آگے کی صفوں میں آئیں۔ انہیں مردوں کے پیچھے کھڑا ہونا چاہیے۔ فرمایا: خیر صفوف الرجال اولھا وشرھا اٰخرھا و خیر صفوف النساء اٰخرھا و شرھا اولھا۔ ''مردوں کے لیے بہترین مقام آگے کی صفوں میں ہے اور بدترین مقام پیچھے کی صفوں میں اور عورتوں کے لیے بہترین مقام پیچھے کی صفوں میں ہے اور بدترین مقام آگے کی صفوں میں۔''

جماعت کے باب میں حضورؐ نے یہ قاعدہ ہی مقرر کر دیا تھا کہ عورت اور مرد پاس پاس کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھیں، خواہ وہ شوہر اور بیوی، یا ماں اور بیٹے ہی کیوں نہ ہوں۔ حضرت انس کا بیان ہے کہ میری نانی ملیکہؓ نے آنحضرت ﷺ کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد آپؐ نماز کے

---

(۱) ترمذی، باب التغلیس فی الفجر۔ اسی مضمون کی احادیث بخاری (باب وقت الفجر) مسلم (باب استحباب التبکیر بالصبح فی اول وقتها) ابوداؤد (باب وقت الصبح) اور دوسری کتب حدیث میں بھی مروی ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی کتبِ حدیث میں موجود ہے کہ نماز پڑھانے کے بعد نبی ﷺ اور تمام مرد نمازی بیٹھے رہتے تھے تاکہ عورتیں اُٹھ کر چلی جائیں، اس کے بعد آپؐ اور سب لوگ کھڑے ہوتے۔

(۲) ابن ماجه، باب فتنته النساء۔

(۳) ملاحظہ ہو مؤطا باب خروج النساء الی المساجد۔ مسلم باب خروج النساء الی المسجد۔ ابن ماجه باب فتنته النساء۔

لیے اٹھے۔ میں اور یتیم (یہ غالباً حضرت انسؓ کے بھائی کا نام تھا) حضورؐ کے پیچھے کھڑے ہوئے اور ملیکہ ہمارے پیچھے کھڑی ہوئیں[1]۔ حضرت انسؓ کی دوسری روایت ہے کہ حضورؐ نے ہمارے گھر میں نماز پڑھی۔ میں اور یتیم آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے اور میری ماں امِّ سلیم میرے پیچھے کھڑی ہوئیں[2]۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ نماز کے لیے اٹھے۔ میں آپ کے پہلو میں کھڑا ہوا اور حضرت عائشہؓ ہمارے پیچھے کھڑی ہوئیں[3]۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ عورتیں نماز میں آواز بلند نہ کریں۔ قاعدہ یہ مقرر کیا گیا کہ اگر نماز میں امام کو کسی چیز پر متنبہ کرنا ہو تو مرد سبحان اللہ کہیں اور عورتیں دستک دیں[4]۔

ان تمام حدود و قیود کے باوجود جب حضرت عمرؓ کو جماعت میں ذکور و اناث کے خلط ملط ہونے کا اندیشہ ہوا تو آپ نے مسجد میں عورتوں کے لیے ایک دروازہ مختص فرما دیا، اور مردوں کو اس دروازے سے آنے جانے کی ممانعت کردی[5]۔

حج میں عورتوں کا طریقہ

اسلام کا دوسرا اجتماعی فریضہ حج ہے۔ یہ مردوں کی طرح عورتوں پر بھی فرض ہے۔ مگر حتی الامکان عورتوں کو طواف کے موقع پر مردوں کے ساتھ خلط ملط ہونے سے روکا گیا ہے۔ بخاری میں عطاء سے روایت ہے کہ عہدِ نبوی میں عورتیں مرد کے ساتھ طواف کرتی تھیں مگر خلط ملط نہ ہوتی تھیں[6]۔ فتح الباری میں ابراہیم نخعی سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے طواف میں عورتوں اور مردوں کو گڈمڈ ہونے سے روک دیا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مرد کو آپ نے عورتوں کے مجمع میں دیکھا تو پکڑ کر کوڑے لگائے[7]۔

---

(۱) ترمذی باب ماجاء فی الرجل یصلی و معه رجال و نساء۔

(۲) کتاب الأذان بخاری باب المرأة وحدها تکون صفا۔

(۳) نسائی۔ باب موقف الامام اذا کان معهٗ صبی و امرأة۔

(۴) بخاری، باب التصفیق للنساء۔ ابو دائود، باب التصفیق فی الصلوة۔

(۵) ابو دائود، باب اعتزال النساء فی المساجد عن الرجال۔

(۶) باب طواف النساء مع الرجال۔

(۷) جلد سوم، صفحہ ۳۱۲۔

مؤطا میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے بال بچوں کو مزدلفہ سے منٰی آگے روانہ کردیا کرتے تھے تاکہ لوگوں کے آنے سے پہلے صبح کی نماز اور رمی سے فارغ ہوجائیں۔ نیز حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ صبح اندھیرے مُنہ منٰی تشریف لے جاتی تھیں کہ نبی ﷺ کے عہد میں عورتوں کے لیے یہی دستور تھا۔ (مؤطا، ابواب الحج، باب تقدیم النساء و الصبیان)

جمعہ وعیدین میں عورتوں کی شرکت

جمعہ وعیدین کے اجتماعات اسلام میں جیسی اہمیت رکھتے ہیں محتاجِ بیان نہیں۔ ان کی اہمیت کو مدنظر رکھ کر شارع نے خاص طور پر ان اجتماعات کے لیے وہ شرط اڑادی جو عام نمازوں کے لیے تھی، یعنی یہ کہ دن میں شریکِ جماعت نہ ہوں۔ اگرچہ جمعہ کے متعلق یہ تصریح ہے کہ عورتیں فرضیتِ جمعہ سے مستثنٰی ہیں (ابوداؤد، باب جمعة الملوك) اور عیدین میں بھی عورتوں کی شرکت ضروری نہیں، لیکن اگر وہ چاہیں تو نماز باجماعت کی دوسری شرائط کی پابندی کرتے ہوئے ان جماعتوں میں شریک ہوسکتی ہیں۔ حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود اپنی خواتین کو عیدین میں لے جاتے تھے۔

عن ام عطية قالت ان رسول اللهﷺ كان يخرج الابكار والعواتق و ذوات الخدور والحيض فى العيدين، فاما الحيض فيعتزلن المصلى ويشهدون دعوة المسلمين.

(ترمذی، باب خروج النساء فی العیدین)

امِ عطیہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کنواری اور جوان لڑکیوں اور گھر گرہستنوں اور ایام والی عورتوں کو عیدین میں لے جاتے تھے، جو عورتیں نماز کے قابل نہ ہوتیں وہ جماعت سے الگ رہتیں اور دعا میں شریک ہوجاتیں تھیں۔

عن ابن عباسٍ ان النبىﷺ كان يخرج بناته و نسائه فى العيدين. (ابن ماجه، باب ماجاء فی خروج النساء فی العیدین)

ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ اپنی بیٹیوں اور بیویوں کو عیدین میں لے جاتے تھے۔

زیارتِ قبور وشرکتِ جنازات

مسلمان کے جنازے میں شریک ہونا شریعت میں فرضِ کفایہ قرار دیا گیا ہے اور اس کے متعلق جو تاکیدی احکام ہیں، واقف کاروں سے پوشیدہ نہیں، مگر یہ سب مردوں کے لیے ہیں۔ عورتوں کو شرکتِ جنازات سے منع کیا گیا ہے۔ اگر چہ اس ممانعت میں سختی نہیں ہے، اور کبھی کبھی اجازت بھی دی گئی ہے۔ لیکن شارع کے ارشادات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا جنازہ میں جانا کراہت سے خالی نہیں۔ بخاری میں امِ عطیہؓ کی حدیث ہے نُهينا عن اتباع الجنائز لم يعزم علينا ''ہم کو جنازوں کی مشایعت سے منع کیا گیا تھا مگر سختی کے ساتھ نہیں۔'' (باب اتباع النساء الجنازة)

ابن ماجہ اور نسائی میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک جنازہ میں شریک تھے۔ ایک عورت نظر آئی۔ حضرت عمرؓ نے اس کو ڈانٹا۔ حضورؐ نے فرمایا: یاعمر دعها (اے عمر اسے چھوڑ دے) معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت میّت کی کوئی عزیز قریب ہوگی۔ شدّتِ غم سے مجبور ہو کر ساتھ چلی آئی ہوگی۔ حضورؐ نے اس کے جذبات کی رعایت کر کے حضرت عمرؓ کو ڈانٹ ڈپٹ سے منع فرمادیا۔

ایسی ہی صورت زیارتِ قبور کی بھی ہے۔ عورتیں رقیق القلب ہوتی ہیں۔ اپنے مردہ عزیزوں کی یاد ان کے دلوں میں زیادہ گہری ہوتی ہے۔ ان کے جذبات کو بالکل پامال کر دینا شارع نے پسند نہ فرمایا۔ مگر یہ صاف کہہ دیا کہ عورتوں کا کثرت سے قبروں پر جانا ممنوع ہے۔

ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے ''لعن رسول الله ﷺ زوّاراتِ القبور'' رسول اللہ ﷺ نے بکثرت قبروں پر جانے والیوں کو ملعون ٹھیرایا تھا۔[1]
(باب ماجاء فی کراهيته زيارة القبور للنساء)

حضرت عائشہؓ اپنے بھائی عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکر کی قبر پر تشریف لے گئیں۔ تو فرمایا ''والله لو شهد تك مازرتك'' بہ خدا اگر میں تمہاری وفات کے وقت موجود ہوتی تو اب تمہاری قبر کی زیارت کو نہ آتی۔[2]

---

(۱) ابن ماجہ میں یہی مضمون حضرت ابن عباسؓ اور حسانؓ بن ثابت سے بھی منقول ہے۔

(۲) ترمذی، باب ماجاء فی زيارة القبور للنساء۔

انسؓ بن مالک کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک عورت کو قبر کے پاس بیٹھے روتے دیکھا تو اسے منع نہ فرمایا بلکہ صرف ''اتقی اللّٰہ واصبری'' فرمادیا۔(۱)

ان احکام پر غور کیجیے۔ نماز ایک مقدس عبادت ہے۔ مسجد ایک پاک مقام ہے۔ حج میں انسان انتہائی پاکیزہ خیالات کے ساتھ خدا کے دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ جنازوں اور قبروں کی حاضری میں ہر شخص کے سامنے موت کا تصوّر ہوتا ہے اور غم والم کے بادل چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

یہ سب مواقع ایسے ہوتے ہیں جن میں صنفی جذبات یا تو بالکل مفقود ہوتے ہیں یا رہتے بھی ہیں تو دوسرے پاکیزہ تر جذبات سے مغلوب ہوجاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود شارع نے ایسے اجتماعات میں بھی مردوں اور عورتوں کی سوسائٹی کا مخلوط ہونا پسند نہ کیا۔ مواقع کی پاکیزگی، مقاصد کی طہارت اور عورتوں کے جذبات کی رعایت ملحوظ رکھ کر انہیں گھر سے نکلنے کی اجازت تو دے دی۔ بعض مواقع پر خود بھی ساتھ لے گئے۔ لیکن حجاب کی اتنی قیود لگادیں کہ فتنے کے ادنیٰ احتمالات بھی باقی نہ رہیں۔ پھر حج کے سوا تمام دوسرے امور کے متعلق فرمادیا کہ ان میں عورتوں کا شریک نہ ہونا زیادہ بہتر ہے۔

جس قانون کا یہ رجحان ہو کیا اس سے آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ مدرسوں اور کالجوں میں، دفتروں اور کارگاہوں میں، پارکوں اور تفریح گاہوں میں، تھیٹروں اور سینماؤں میں، قہوہ خانوں اور رقص گاہوں میں اختلاطِ صنفین کو جائز رکھے گا؟

جنگ میں عورتوں کی شرکت

حدودِ حجاب کی سختی آپ نے دیکھ لی۔ اب دیکھیے کہ ان میں نرمی کہاں اور کس ضرورت سے کی گئی ہے۔

مسلمان جنگ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ عام مصیبت کا وقت ہے۔ حالات مطالبہ کررہے ہیں کہ قوم کی پوری اجتماعی قوت دفاع میں صرف کردی جائے۔ ایسی حالت میں اسلام قوم کی خواتین کو عام اجازت دیتا ہے کہ وہ جنگی خدمات میں حصّہ لیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی

---

(۱) بخاری، باب زیارۃ القبور۔

اس کے پیشِ نظر ہے کہ جو ماں بننے کے لیے بنائی گئی ہے وہ سر کاٹنے اور خون بہانے کے لیے نہیں بنائی گئی۔ اس کے ہاتھ میں تیر و خنجر دینا اس کی فطرت کو مسخ کرنا ہے۔ اس لیے وہ عورتوں کو اپنی جان و آبرو کی حفاظت کے لیے تو ہتھیار اٹھانے کی اجازت دیتا ہے، مگر بالعموم عورتوں سے مصافی خدمات لینا اور انہیں فوجوں میں بھرتی کرنا اس کی پالیسی سے خارج ہے۔ وہ جنگ میں ان سے صرف یہ خدمت لیتا ہے کہ زخمیوں کی مرہم پٹی کریں، پیاسوں کو پانی پلائیں، سپاہیوں کے لیے کھانا پکائیں اور مجاہدین کے پیچھے کیمپ کی حفاظت کریں۔ ان کاموں کے لیے پردے کی حدود انتہائی حد تک کم کردی گئی ہیں بلکہ ان خدمات کے لیے تھوڑی ترمیم کے ساتھ وہی لباس پہننا شرعاً جائز ہے جو آج کل عیسائی نَنیں پہنتی ہیں۔

تمام احادیث سے ثابت ہے کہ جنگ میں ازواجِ مطہرات اور خواتین اسلام آنحضرت ﷺ کے ساتھ جاتیں اور مجاہدین کو پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کی خدمات انجام دیتی تھیں۔ یہ طریقہ احکامِ حجاب نازل ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔[۱]

ترمذی میں ہے، امِ سلیم اور انصار کی چند دوسری خواتین اکثر لڑائیوں میں حضورؐ کے ساتھ گئی ہیں۔[۲]

بخاری میں ہے کہ ایک عورت نے حضورؐ سے عرض کیا۔ میرے لیے دعا فرمائیے کہ میں بھی بحری جنگ میں جانے والوں کے ساتھ رہوں۔ آپؐ نے فرمایا: اللھم اجعلھا منھم۔[۳]

جنگِ احد کے موقع پر جب مجاہدین اسلام کے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ حضرت عائشہؓ اور امِ سلیمؓ اپنی پیٹھ پر پانی کے مشکیزے لاد لاد کر لاتی تھیں اور لڑنے والوں کو پانی پلاتی تھیں۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اس حال میں میں نے ان کو پائنچے اٹھائے دوڑ دوڑ کر آتے جاتے دیکھا۔ اُن کی پنڈلیوں کا نچلا حصہ کھلا ہوا تھا۔[۴]

ایک دوسری خاتون امِ سُلَیط کے متعلق حضرت عمرؓ نے خود رسول اللہ ﷺ کا یہ قول نقل

---

(۱) بخاری، باب حمل الرجل المرأة فی الغزو۔

(۲) ترمذی، باب ماجاء فی خروج النساء فی الغزو۔

(۳) بخاری، باب غزو المراة فی البحر۔

(۴) بخاری، باب غزوة النساء و قتالھن مع الرجال۔ مسلم، باب النساء الغازیات یرضخ لھن۔

کیا ہے کہ ''جنگِ احد میں دائیں اور بائیں جدھر میں دیکھتا تھا امّ سلیطؓ میری حفاظت کے لیے جان لڑاتی ہوئی نظر آتی تھی۔''

اسی جنگ میں رُبَیّعِ بنت معوّذ اور ان کے ساتھ خواتین کی ایک جماعت زخمیوں کی مرہم پٹی میں مشغول تھی اور یہی عورتیں مجروحین کو اٹھا اٹھا کر مدینہ لے جا رہی تھیں۔(۱)

جنگِ حنین میں امِ سلیم ایک خنجر ہاتھ میں لیے پھر رہی تھیں۔ حضورؐ نے پوچھا، یہ کس لیے ہے؟ کہنے لگیں کہ اگر کوئی مشرک میرے قریب آیا تو اس کا پیٹ پھاڑ دوں گی۔(۲)

امِ عطیہؓ سات لڑائیوں میں شریک ہوئیں۔ کیمپ کی حفاظت، سپاہیوں کے لیے کھانا پکانا، زخمیوں اور بیماروں کی تیمارداری کرنا ان کے سپرد تھا۔(۳)

حضرت ابنِ عباسؓ کا بیان ہے کہ جو خواتین اس قسم کی جنگی خدمات انجام دیتی تھیں ان کو اموالِ غنیمت میں سے انعام دیا جاتا تھا۔(۴)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی پردہ کی نوعیت کسی جاہلی رسم کی سی نہیں ہے جس میں صالح اور ضروریات کے لحاظ سے کمی وبیشی نہ ہوسکتی ہو۔ جہاں حقیقی ضروریات پیش آجائیں وہاں اس کے حدود کم بھی ہوسکتے ہیں، نہ صرف چہرہ اور ہاتھ کھولے جاسکتے ہیں، بلکہ جن اعضا کو سترِ عورت میں داخل کیا گیا ہے ان کے بھی بعض حصے اگر حسبِ ضرورت کھل جائیں تو مضائقہ نہیں۔ لیکن جب ضرورت رفع ہوجائے تو حجاب کو پھر انہیں حدود پر قائم ہوجانا چاہیے جو عام حالات کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ جس طرح یہ پردہ جاہلی پردہ نہیں ہے، اسی طرح اس کی تخفیف بھی جاہلی آزادی کے مانند نہیں۔ مسلمان عورت کا حال یورپین عورت کی طرح نہیں ہے کہ جب وہ ضروریاتِ جنگ کے لیے اپنی حدود سے باہر نکلی تو اس نے جنگ ختم ہونے کے بعد اپنی حدود میں واپس جانے سے انکار کردیا۔

---

(۱) بخاری، باب مدارات النساء الجرحیٰ فی الغزو۔

(۲) مسلم، باب غزوۃ النساء مع الرجال۔

(۳) ابن ماجه، باب العبید و النساء یشهدون مع المسلمین۔

(۴) مسلم، باب النساء الغازیات یرضح لهن۔

خاتمہ

یہ ہے وہ نقطۂ عدل اور مقامِ توسّط جس کی دنیا اپنی ترقی اور خوش حالی اور اخلاقی امن کے لیے محتاج اور سخت محتاج ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں بیان کر چکا ہوں۔ دنیا ہزاروں سال سے تمدّن میں عورت کا ـــــ یعنی عالمِ انسانی کے پورے نصف حصّے کا ـــــ مقام متعین کرنے میں ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ کبھی افراط کی طرف جاتی ہے اور کبھی تفریط کی طرف، یہ دونوں انتہائیں اس کے لیے نقصان دِہ ثابت ہوئی ہیں۔ تجربات اور مشاہدات اِس نقصان پر شاہد ہیں۔ ان انتہاؤں کے درمیان عدل وتوسط کا مقام، جو عقل وفطرت کے عین مطابق اور انسانی ضروریات کے لیے عین مناسب ہے، وہی ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں متعدد ایسے موانع پیدا ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کے لیے اس صراطِ مستقیم کو سمجھنا اور اس کی قدر کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

ان موانع میں سب سے اہم مانع یہ ہے کہ زمانۂ جدید کا انسان عموماً ''یرقان'' میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اور مشرق کے فرنگیت زدہ لوگوں پر اس یرقان کی ایک اور زیادہ خطرناک قسم کا حملہ ہوا ہے جسے میں ''یرقانِ ابیض'' کہتا ہوں۔ میں اپنی صاف گوئی پر اپنے دوستوں اور بھائیوں سے معافی کا خواستگار ہوں، مگر جو حقیقت ہے اِس کے اظہار میں کوئی مروّت مانع نہ ہونی چاہیے۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اسلام کا کوئی حکم اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو ثابت شدہ علمی حقائق کے خلاف ہو، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ جو کچھ علمی حقیقت ہے وہی عین اسلام ہے۔ مگر اس کو دیکھنے کے لیے بے رنگ نگاہ کی ضرورت ہے تا کہ ہر چیز کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھ سکے، وسیع نظر کی ضرورت ہے تا کہ ہر چیز کے تمام پہلوؤں کو دیکھ سکے، کھلے دل اور سلیم فطرت کی ضرورت ہے

تا کہ حقائق جیسے کچھ بھی ہوں ان کو ویسا ہی تسلیم کرے اور اپنے رجحانات کے تابع بنانے کے بجائے رجحاناتِ نفس کو ان کے تابع کردے، جہاں یہ چیز نہ ہو وہاں اگر علم ہو تو بیکار ہے۔ رنگین نگاہ جو کچھ دیکھے گی اسی رنگ میں دیکھے گی جو اس پر چڑھا ہوا ہے۔ محدود نظر مسائل اور معاملات کے صرف انہی گوشوں تک جاسکے گی جو اس زاویہ کے سامنے واقع ہوں جس سے وہ انہیں دیکھ رہی ہے۔ پھر اُن سب کے باوجود جو علمی حقائق اپنی اصلی حالت میں اندر تک پہنچ جائیں گے ان پر بھی دل کی تنگی اور فطرت کی کجی اپنا عمل کرے گی۔ وہ حقائق سے مطالبہ کرے گی کہ اس کے داعیاتِ نفس اور اس کے جذبات ورجحانات کے موافق ڈھل جائیں، اور اگر وہ نہ ڈھلیں گے تو وہ ان کو حقائق جاننے کے باوجود نظر انداز کردے گی۔ اور اپنی خواہشات کا اتباع کرے گی۔ ظاہر ہے کہ اس مرض میں جب انسان گرفتار ہو تو علم، تجربہ، مشاہدہ، کوئی چیز بھی اس کی رہنمائی نہیں کرسکتی۔ اور ایسے مریض کے لیے قطعی ناممکن ہے کہ وہ اسلام کے کسی حکم کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکے۔ کیوں کہ اسلام دینِ فطرت بلکہ عینِ فطرت ہے۔ دنیائے مغرب کے لیے اسلام کو سمجھنا اسی لیے مشکل ہوگیا ہے کہ وہ اس بیماری میں مبتلا ہوگئی ہے۔ اس کے پاس جتنا بھی علم[1] ہے وہ سب کا سب ''اسلام'' ہے۔ مگر خود اس کی اپنی نگاہ رنگین ہے۔ پھر یہی رنگ ''یرقانِ ابیض'' بن کر مشرق کے نئے تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہ پر چھا گیا ہے۔ اور یہ بیماری ان کو بھی حقائقِ علمیہ سے صحیح نتائج نکالنے اور مسائلِ حیات کو فطری نگاہ سے دیکھنے میں مانع ہوتی ہے۔ ان میں سے جو مسلمان ہیں وہ ہوسکتا ہے کہ دینِ اسلام پر ایمان رکھتے ہوں، اس کی صداقت کے معترف بھی ہوں، اتباعِ دین کے جذبہ سے بھی خالی نہ ہوں، مگر وہ غریب اپنی آنکھوں کے یرقان کو کیا کریں جو کچھ ان آنکھوں سے دیکھتے ہیں ان کا رنگ ہی انہیں صبغۃ اللہ کے خلاف نظر آتا ہے۔

دوسری وجہ جو فہم صحیح میں مانع ہوتی ہے یہ ہے کہ عام طور پر لوگ جب اسلام کے کسی مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو اس نظام اور سسٹم پر بحیثیتِ مجموعی نگاہ نہیں ڈالتے، جس سے وہ مسئلہ متعلق ہوتا ہے، بلکہ نظام سے الگ کرکے مجرّد اس خاص مسئلہ کو زیرِ بحث لے آتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ تمام حکمتوں سے خالی نظر آنے لگتا ہے اور اس میں طرح طرح کے شکوک ہونے لگتے ہیں۔ سود کے مسئلہ میں یہی ہوا کہ اس کو اسلام (یعنی فطرت) کے اصولِ معیشت اور نظامِ معاشی

---

(۱) علم یعنی حقیقت کا علم، نہ کہ نظریات اور حقائق سے اخذ کردہ نتائج۔

سے الگ کر کے دیکھا گیا۔ ہزاروں سُقم اس میں نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے صاحبِ علم لوگوں کو بھی مقاصدِ شریعت کے خلاف اس میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ غلامی اور تعدّدِ ازدواج اور حقوق الزوجین اور ایسے ہی بہت سے مسائل میں اس بنیادی غلطی کا اعادہ کیا گیا ہے اور پردہ کا مسئلہ بھی اس کا شکار ہوا ہے۔ اگر آپ پوری عمارت کو دیکھنے کے بجائے صرف اس کے ایک ستون کو دیکھیں گے تو لامحالہ آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ آخر کیوں لگایا گیا ہے۔ آپ کو اس کا قیام تمام حکمتوں سے خالی نظر آئے گا۔ آپ کبھی نہ سمجھیں گے کہ انجینئر نے عمارت کو سنبھالنے کے لیے کس تناسب اور موزونیت کے ساتھ اس کو لگایا ہے اور اس کو گرا دینے سے پوری عمارت کو کیا نقصان پہنچے گا۔ بالکل ایسی ہی مثال پردے کی ہے۔ جب وہ اس نظامِ معاشرت سے الگ کر لیا جائے گا جس میں وہ عمارت کے ستون کی طرح ایک ضرورت اور مناسبت کو ملحوظ رکھ کر نصب کیا گیا ہے تو وہ تمام حکمتیں نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گی۔ جو اس سے وابستہ ہیں اور یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آسکے گی کہ نوعِ انسانی کی دونوں صنفوں کے درمیان یہ امتیازی حدود آخر کیوں قائم کیے گئے ہیں۔ پس ستون کی حکمتوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس پوری عمارت کو دیکھ لیا جائے جس میں وہ نصب کیا گیا ہے۔

اب اسلام کا حقیقی پردہ آپ کے سامنے ہے۔ وہ نظامِ معاشرت بھی آپ کے سامنے ہے جس کی حفاظت کے لیے پردے کے ضوابط مقرر کیے گئے ہیں۔ اس نظام کے وہ تمام ارکان بھی آپ کے سامنے ہیں جن کے ساتھ ایک خاص توازن کو ملحوظ رکھ کر پردہ کا رکن مربوط کیا گیا ہے۔ وہ تمام ثابت شدہ علمی حقائق بھی آپ کے سامنے ہیں جن پر اس پورے نظامِ معاشرت کی بنا رکھی گئی ہے۔ ان سب کو دیکھ لینے کے بعد فرمایئے کہ اس میں کہاں آپ کوئی کمزوری پاتے ہیں؟ کس جگہ بے اعتدالی کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی نظر آتا ہے؟ کون سا مقام ایسا ہے جہاں —— کسی خاص گروہ کے رجحان سے قطع نظر محض علمی و عقلی بنیادوں پر —— کوئی اصلاح تجویز کی جاسکتی ہو؟ میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ زمین اور آسمان جس عدل پر قائم ہیں، کائنات کے نظم میں جو کمال درجہ کا تسویہ پایا جاتا ہے، ایک ذرّہ ترکیب اور نظامِ شمسی کی بندش میں جیسا مکمل توازن وتناسب آپ دیکھتے ہیں، ویسا ہی عدل وتسویہ اور توازن وتناسب اس نظامِ معاشرت میں بھی موجود ہے۔ افراط وتفریط اور یک رُخی جو انسانی کاموں کی ناگزیر کمزوری ہے اُس سے یہ

نظام یکسر خالی ہے۔ اس میں اصلاح تجویز کرنا انسان کی قدرت سے باہر ہے۔ انسان اپنی عقلِ خام کی مداخلت سے اگر اس میں کوئی ادنیٰ ردّوبدل بھی کرے گا تو اس کی اصلاح نہ کرے گا۔ بلکہ اس کے توازن کو بگاڑ دے گا۔

افسوس! میرے پاس ایسے ذرائع نہیں ہیں کہ اپنے اُن انسانی بھائیوں تک اپنی آواز پہنچا سکوں جو یورپ، امریکہ، روس اور جاپان میں رہتے ہیں، وہ ایک صحیح اور معتدل نظامِ تمدن نہ پانے ہی کی وجہ سے اپنی زندگی کو تباہ کر رہے ہیں اور دنیا کی دوسری قوموں کی تباہی کے بھی موجب بن رہے ہیں۔ کاش میں ان تک وہ آبِ حیات پہنچا سکتا، جس کے وہ درحقیقت پیاسے ہیں۔ چاہے وہ اس پیاس کو محسوس نہ کرتے ہوں! تاہم میرے اپنے ہمسایہ ملک کے ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی میری دسترس سے قریب ہیں۔ ان میں سے اکثر میری زبان بھی سمجھتے ہیں۔ میں انہیں دعوت دیتا ہوں کہ مسلمانوں کے ساتھ تاریخی اور سیاسی جھگڑوں کی بدولت جو تعصب ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے اپنے دلوں کو صاف کر کے محض طالبِ حق ہونے کی حیثیت سے اسلام کے اس نظامِ معاشرت کو دیکھیں جسے میں نے بے کم و کاست اس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ پھر اس مغربی نظامِ معاشرت سے اس کا موازنہ کریں جس کی طرف وہ بے تحاشا دوڑے چلے جا رہے ہیں، اور آخر میں میری یا کسی اور کی خاطر نہیں بلکہ خود اپنی بھلائی کی خاطر فیصلہ کریں کہ اُن کی حقیقی فلاح کس طریقہ میں ہے۔

اس کے بعد میں عام ناظرین کی طرف سے رُخ پھیر کر چند الفاظ اپنے اُن گمراہ بھائیوں سے عرض کروں گا جو مسلمان کہلاتے ہیں۔

ہمارے بعض نئے تعلیم یافتہ مسلمان بھائی اُن تمام باتوں کو تسلیم کرتے ہیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ اسلام کے قوانین میں حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے شدت اور تخفیف کی تو گنجایش ہے جس سے تم خود بھی شاید انکار نہیں کر سکتے۔ پر ہماری خواہش صرف اس قدر ہے کہ اس گنجایش سے فائدہ اٹھایا جائے۔ موجودہ زمانے کے حالات پردہ میں تخفیف کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان عورتیں مدرسوں اور کالجوں میں جائیں، اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ ایسی تربیت حاصل کریں جس سے وہ ملک کے تمدّنی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اس کے بغیر مسلمان زندگی کی دوڑ میں ہمسایہ قوموں

سے پیچھے رہے جاتے ہیں۔ اور آگے چل کر اندیشہ ہے کہ اور زیادہ نقصان اٹھائیں گے۔ ملک کی سیاسی زندگی میں عورتوں کو جو حقوق دیے جا رہے ہیں اگر اُن سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت مسلمان عورتوں میں پیدا نہ ہوئی، اور پردے کی قیود کے سبب سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکیں، تو ملک کی سیاسی ترازو میں مسلمانوں کا وزن بہت کم رہ جائے گا۔ دیکھو دنیائے اسلام کی ترقی یافتہ اقوام، مثلاً ٹرکی اور ایران نے بھی زمانے کے حالات کو دیکھ کر اسلامی حجاب میں بہت کچھ تخفیف[1] کر دی ہے اور اس سے چند ہی سال کے اندر نمایاں فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ اگر ہم بھی انہی کے نقش قدم پر چلیں تو آخر اس میں کیا قباحت ہے۔

یہ جتنے خطرات بیان کیے جاتے ہیں ہم اُن سب کو جوں کا توں تسلیم کرتے ہیں، بلکہ اگر خطرات کی فہرست میں اس سے دس گنا اور اضافہ ہو جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ بہر حال اس نوعیت کے کسی خطرے کی بنا پر بھی اسلام کے قانون میں ترمیم یا تخفیف جائز نہیں ہو سکتی۔ دراصل ایسے تمام خطرات کی نوعیت یہ ہے کہ مثلاً آپ قصداً اپنی حماقت سے یا مجبوراً اپنی کمزوری کی وجہ سے ایک کثیف اور مضرِ صحت ماحول میں رہتے ہوں اور وہاں حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل کرنا آپ کے لیے نہ صرف مشکل ہو رہا ہو بلکہ گندے لوگوں کی بستی میں آپ کے لیے گندگی اختیار کیے بغیر جینا تک دشوار ہو۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ حفظانِ صحت کے اصولوں کی ترمیم یا تخفیف کا کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ ان اصولوں کو صحیح سمجھتے ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ اپنے ماحول سے لڑ کر اسے پاک بنائیں۔ اگر لڑنے کی جرأت و ہمت نہیں اور اپنی کمزوری کی وجہ سے آپ اپنے ماحول سے مغلوب ہیں تو جائیے اور جو جو کثافتیں بھی آپ پر مسلّط ہیں ان میں آلودہ ہو جائیے۔ آخر آپ کے لیے قوانینِ صحت میں ترمیم یا تخفیف کیوں کی جائے؟ اور اگر آپ واقعی ان قوانین کو غلط سمجھتے ہیں تو اس کی گندگی سے آپ کی اپنی طبیعت بھی مانوس ہو چکی ہے تو آپ اپنے لیے جو چاہیے قانون بنا لیجیے۔ پاکی اور طہارت کے قانون میں تو ان لوگوں کی خواہشات کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہو سکتی جو گندگی کی طرف میلان رکھتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہر قانون کی طرح اسلامی قانون میں بھی حالات کے لحاظ سے شدت اور تخفیف کی گنجایش ہے۔ مگر ہر قانون کی طرح اسلامی قانون بھی اس بات پر اصرار کرتا

---

(۱) تخفیف؟ یہ لفظ محض بحث کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے۔ ورنہ دراصل وہاں تخفیف نہیں، تنسیخ کی گئی ہے۔

ہے کہ شدت یا تخفیف کا فیصلہ کرنے کے لیے حالات کو اسی نظر سے اور اسی اسپرٹ میں دیکھا جائے جو اسلام کی نظر اور اسلام کی اسپرٹ ہے۔ کسی مختلف نقطۂ نگاہ سے حالت کو دیکھنا اور پھر تخفیف کی قینچی لے کر دفعاتِ قانون پر حملہ آور ہو جانا تخفیف کی تعریف میں نہیں آتا، بلکہ یہ سادہ اور صریح تحریف ہے۔ جن حالات کو غیر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھ کر قانونِ اسلامی میں ''تخفیف'' کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ ان کو اگر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ ایسے حالات میں تخفیف کی نہیں، بلکہ مزید شدت کی ضرورت ہے۔ تخفیف صرف اس وقت کی جا سکتی ہے جب کہ قانون کے مقاصد دوسرے ذرائع سے بآسانی پورے ہو جاتے ہوں اور تحفظات میں زیادہ سختی کی حاجت نہ ہو۔ مگر جب کہ قانون کے مقاصد دوسرے ذرائع سے پورے نہ ہو رہے ہوں، بلکہ دوسری تمام قوتیں ان کو ضائع کرنے میں لگی ہوئی ہوں، اور اُن کے مقاصد کے حصول کا تمام تر مدار صرف تحفظات پر ہی آٹھیرا ہو، تو ایسی حالت میں صرف وہی شخص تخفیف کا خیال کر سکتا ہے جو قانون کی اسپرٹ سے قطعی نابلد ہو۔

پچھلے اوراق میں ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ اسلامی قانونِ معاشرت کا مقصد، ضابطۂ ازدواج کی حفاظت، صنفی انتشار کی روک تھام اور غیر معتدل شہوانی تحریکات کا انسداد ہے۔ اس غرض کے لیے شارع نے تین تدبیریں اختیار کی ہیں۔ ایک اصلاحِ اخلاق، دوسرے تعزیری قوانین، تیسرے انسدادی تدابیر یعنی ستر و حجاب۔ یہ گویا تین ستون ہیں جن پر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے، جن کے استحکام پر اس عمارت کا استحکام منحصر ہے اور جن کا انہدام دراصل اس پوری عمارت کا انہدام ہے۔ آیئے اب اپنے ملک کے موجودہ حالات پر ایک نظر ڈال کر دیکھیے کہ ان تینوں ستونوں کا آپ کے ہاں کیا حال ہے؟

پہلے اپنے اخلاقی ماحول کو لیجیے آپ اس ملک میں رہتے ہیں جس کی پچھتر فی صدی آبادی آپ ہی کی اگلی پچھلی کوتاہیوں کی وجہ سے اب تک غیر مسلم ہے۔ جس پر ایک غیر مسلم قوم حکمراں ہے۔ جس پر ایک غیر مسلم تہذیب آندھی اور طوفان کی طرح چھائی چلی جا رہی ہے۔ پلیگ اور ہیضہ کے جراثیم کی طرح غیر اسلامی اخلاق کے اصول اور غیر اسلامی تہذیب کے تخیّلات تمام فضا میں پھیل گئے ہیں۔ آب و ہوا ان سے مسموم ہو چکی ہے۔ ان کی سمیّت نے ہر طرف سے آپ کا احاطہ کر لیا ہے۔ فحش اور بے حیائی کی جن باتوں کے خیال سے بھی چند سال پہلے تک آپ

کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے وہ اب اس قدر عام ہو چکی ہیں کہ آپ انہیں روز مرّہ کے معمولات سمجھ رہے ہیں۔ آپ کے بچّے تک اخباروں اور رسالوں اور اشتہاروں میں فحش تصویریں روز دیکھتے ہیں اور بے حیائی کے عادی ہوتے جاتے ہیں۔ آپ کے بوڑھے اور جوان اور بچّے سب کے سب سینما دیکھ رہے ہیں۔ جہاں عریانی اور بے حیائی اور شہوانی محبت سے زیادہ دلچسپ چیز اور کوئی نہیں۔ باپ اور بیٹے، بھائی اور بھائی، مائیں اور بیٹیاں، سب ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھ کر علانیہ بوس وکنار اور اختلاط و مُلاعبت کے مناظر دیکھتے ہیں اور کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔ انتہا درجہ کے گندے اور ہیجان انگیز گیت گھر گھر اور دکان دکان بج رہے ہیں اور کسی کے کان ان آوازوں سے محفوظ نہیں۔ ہندی اور فرنگی اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین نیم عریاں لباسوں کے ساتھ پھر رہی ہیں اور نگاہیں ان لباسوں کی اس قدر خوگر ہو چکی ہیں کہ کوئی شخص ان میں کسی قسم کی بے حیائی محسوس نہیں کرتا۔ اخلاق کے جو تصورات مغربی تعلیم وتربیت کے ساتھ پھیل رہے ہیں، اُن کی بدولت نکاح کو ایک فرسودہ رسم، زنا کو ایک تفریح، مردوں اور عورتوں کے اختلاط کو ایک نا قابلِ اعتراض بلکہ مستحسن چیز، طلاق کو ایک کھیل، ازدواجی فرائض کو ایک نا قابلِ برداشت بندھن، توالد وتناسل کو ایک حماقت، شوہر کی اطاعت کو ایک نوع کی غلامی، بیوی بننے کو ایک مصیبت اور معشوق بننے کو ایک خیالی جنت سمجھا جا رہا ہے۔

پھر دیکھیے کہ اس ماحول کے اثرات آپ کی قوم پر کیا پڑ رہے ہیں۔ کیا آپ کی سوسائٹی میں اب غضِ بصر کا کہیں وجود ہے؟ کیا لاکھوں میں ایک آدمی بھی کہیں ایسا پایا جاتا ہے جو اجنبی عورتوں کے حسن سے آنکھیں سینکنے میں باک کرتا ہو؟ کیا علانیہ آنکھ اور زبان کی زنا نہیں کی جا رہی ہے؟ کیا آپ کی عورتیں بھی تبرّجِ جاہلیہ اور اظہارِ زینت اور نمایشِ حسن سے پرہیز کر رہی ہیں؟ کیا آج آپ کے گھروں میں ٹھیک وہی لباس نہیں پہنے جا رہے ہیں جن کے متعلق آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ ''نساء کاسیات عاریات ممیلات مائلات''؟ کیا آپ اپنی بہنوں اور بیٹیوں اور ماؤں کو وہ لباس پہنے نہیں دیکھ رہے ہیں جن کو مسلمان عورت اپنے شوہر کے سوا کسی کے سامنے نہیں پہن سکتی؟ کیا آپ کی سوسائٹی میں فحش قصے اور عشق ومحبت کے گندے واقعات بے تکلفی کے ساتھ کہے اور سنے نہیں جاتے؟ کیا آپ کی محفلوں میں لوگ خود اپنی بدکاری کے حالات بیان کرنے میں بھی کوئی شرم محسوس کرتے ہیں؟ جب حال یہ ہے تو فرمائیے کہ طہارتِ اخلاق

کا وہ پہلا اور سب سے زیادہ مستحکم ستون کہاں باقی رہا، جس پر اسلامی معاشرت کا ایوان تعمیر کیا گیا تھا؟ اسلامی غیرت تو اب اس حد تک مٹ چکی ہے کہ مسلمان عورتیں صرف مسلمان ہی کے نہیں، کفار کے ناجائز تصرف میں آ رہی ہیں۔ انگریزی حکومت میں نہیں، مسلمان ریاستوں تک میں اس قسم کے واقعات علیٰ رؤس الاشہاد پیش آ رہے ہیں۔ مسلمان ان واقعات کو دیکھتے ہیں اور ان کے خون متحرک نہیں ہوتے۔ ایسے بے غیرت مسلمان بھی دیکھے گئے ہیں جن کی اپنی بہنیں کسی غیر مسلم کے تصرف میں آئیں اور انہوں نے فخر یہ اس کا اظہار کیا کہ ہم فلاں بڑے کافر کے برادرِ نسبتی ہیں۔[1] کیا اس کے بعد بھی بے حیائی اور اخلاقی انحطاط کا کوئی درجہ باقی رہ جاتا ہے؟

اب ذرا دوسرے ستون کا حال بھی دیکھیے۔ تمام ہندستان سے اسلامی تعزیرات کا پورا قانون مٹ چکا ہے۔ زنا اور قذف کی حد نہ مسلمان ریاستوں میں جاری ہوتی ہے نہ برٹش انڈیا میں۔ صرف یہی نہیں بلکہ جو قانون اس وقت ملک میں نافذ ہے وہ سرے سے زنا کو جرم ہی نہیں سمجھتا۔ اگر کسی شریف بہو بیٹی کو کوئی شخص بہکا کر بدکار بنانا چاہے تو آپ کے پاس کوئی قانونی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے اس کی عصمت محفوظ رکھ سکیں۔

اگر کوئی شخص کسی نابالغ عورت پر اس کی رضامندی سے ناجائز تصرف کرے تو آپ کسی قانون کے ذریعے سے اس کو سزا نہیں دلوا سکتے۔ اگر کوئی عورت علانیہ فحش کاری پر اتر آئے تو آپ کے پاس کوئی قوت ایسی نہیں جس سے آپ اس کو روک سکیں۔ قانون صرف زنا بالجبر کو جرم ٹھیراتا ہے مگر جو لوگ قانون پیشہ ہیں اُن سے پوچھیے کہ زنا بالجبر کا ثبوت کس قدر مشکل ہے۔ منکوحہ عورت کو بھگا لے جانا بھی جرم ہے مگر انگریزی قانون جاننے والوں سے دریافت کیجیے کہ اگر منکوحہ عورت خود اپنی رضامندی سے کسی کے گھر جا پڑے تو اس کے لیے آپ کے فرماں رواؤں کی عدالت میں کیا چارۂ کار ہے؟

غور کیجیے! یہ دونوں ستون منہدم ہو چکے ہیں۔ اب آپ کے نظمِ معاشرت کی پوری

---

(۱) یہ واقعہ جنوبی ہند کا ہے۔ میرے ایک دوست نے مجھے ایک اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک واقعہ سنایا۔ مشرقی ہند میں ایک .... نام کی مسلمان عورت ایک بڑے دولت مند غیر مسلم کے ساتھ علانیہ تعلق رکھتی ہے اور اس کے نتیجہ میں اس نے بہت بڑی جائداد حاصل کی ہے۔ میرے دوست کا بیان ہے کہ انہوں نے بارہا مقامی مسلمانوں ــــ نام نہاد مسلمانوں کو ــــ اس بات پر خوشی کا اظہار کرتے دیکھا ہے کہ غیر مسلم کے پاس سے ''مسلمانوں'' میں اتنی بڑی دولت آ گئی۔

عمارت صرف ایک ستون پر قائم ہے۔ کیا آپ اسے بھی مسمار کر دینا چاہتے ہیں؟ ایک طرف پردے کے وہ نقصانات ہیں جن کو آپ نے اوپر گنایا ہے۔ دوسری طرف پردہ اٹھا دینے میں اخلاق اور نظامِ معاشرت کی کامل تباہی ہے۔ دونوں کے درمیان موازنہ کیجیے۔ مصیبتیں دونوں ہیں اور ایک کو بہر حال قبول کرنا ہے۔ اب آپ خود ہی دل سے فتویٰ طلب کیجیے کہ ان میں سے کون سی مصیبت کمتر ہے۔

پس اگر احوالِ زمانہ ہی پر فیصلے کا انحصار ہے تو میں کہتا ہوں کہ ہندستان کے احوال پردے کی تخفیف کے نہیں، اور زیادہ اہتمام کے مقتضی ہیں۔ کیوں کہ آپ کے نظام معاشرت کی حفاظت کرنے والے دو ستون گر چکے ہیں اور اب تمام دارومدار صرف ایک ہی ستون پر ہے۔ تمدن اور معیشت اور سیاست کے مسائل آپ کو حل کرنے ہیں تو سر جوڑ کر بیٹھیے، غور کیجیے، اسلامی حدود کے اندر اس کے حل کی دوسری صورتیں بھی نکل سکتی ہیں، مگر اس بچے کھچے ستون کو، جو پہلے ہی کافی کمزور ہو چکا ہے اور زیادہ کمزور نہ بنائیے۔ اس میں تخفیف کرنے سے پہلے آپ کو کم از کم اتنی قوت پیدا کرنی چاہیے کہ اگر کوئی مسلمان عورت بے نقاب ہو تو جہاں اس کو گھورنے کے لیے دو آنکھیں موجود ہوں، وہیں اُن آنکھوں کو نکال لینے کے لیے پچاس ہاتھ بھی موجود ہوں۔

